READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں دہشت گرد تھا

ندیم ندیم

طارق اسمٰعیل ساگر

ساگر پبلی کیشنز
16-E ٹیمپل روڈ مہتہ سٹریٹ صفانوالہ چوک لاہور
Cell: 0300-9468248, Ph: 042-36361089
E-mail: ti_sagar@yahoo.com Web: www.nayajahan.com

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

عرض ناشر

طارق اسمٰعیل ساگر کا نام پاکستانی ناول نگاری میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔1980ء میں جب ان کا پہلا ناول ''میں ایک جاسوس تھا'' شائع ہوا تو ادب کے بڑے بڑے ناقدین دنگ رہ گئے۔ جس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ تسلسل سے جاری ہے۔ ساگر صاحب کا ہر ناول قارئین میں اپنی مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرتا ہے اور ان کے قارئین ہمیشہ نئے ناول کے منتظر رہتے ہیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر پیشہ ور صحافی ہیں اور ان کی زیر ادارت ''ماہنامہ ساگر ڈائجسٹ'' لاہور اور ''ماہنامہ نیا جہان انٹرنیشنل لاہور'' شائع ہوتا ہے۔ ہم نے ساگر صاحب کی کتب کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے تاکہ قارئین تک ان کی کتابیں مناسب دام اور اچھے کاغذ کے ساتھ پہنچ سکیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ طارق اسمٰعیل ساگر کی کتابیں خریدنے سے پہلے اس بات کی یقین دہانی حاصل کر لیں کہ اسے ''ساگر پبلی کیشنز'' نے ہی شائع کیا ہے۔ ہماری درخواست ہے ملتے جلتے ناموں سے دھوکہ نہ کھائیں۔

آپ کو طارق اسمٰعیل ساگر کی تصنیفات، ان کے زیر ادارت پرچوں کی معلومات ویب سائٹ www.nayajahan.com پر ملیں گی۔ برائے مہربانی اس کا وزٹ ضرور کیجئے۔ ساگر صاحب کی تصنیفات اور ان کے زیر ادارت پرچوں پر آپ کا تبصرہ ہمارے لئے باعث فخر ہوگا۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

بخت آور خان

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کروں؟ آپ کو کیا بتاؤں میرے ساتھ کیا گزری؟ وہ بہت خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جنہیں کوئی آغاز میسر آ جائے۔ جی ہاں! وہ لوگ جنہیں زندگی کو ڈھنگ سے جینے کا ڈھنگ آ جائے جو کسی ضابطے کے تحت زندگی جیئیں۔ میں ایسا نہیں تھا۔

ایک لا ابالی نوجوان جس کی تربیت خالص دیہاتی اور دینی ماحول میں ہوئی ہو اسے اور کیسا ہونا چاہیے؟ آج تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ میرا جنم پنجاب کے ایک مذہبی گھرانے میں ہوا۔ والد صاحب مسجد کے امام تھے اور ہمارے گھر میں گاؤں کے بچے بچیاں قرآن پڑھنے آتے تھے۔ ہم ماشاء اللہ آٹھ بہن بھائی تھے۔ مجھے اپنے والد کی زندگی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ کبھی سمجھ نہ آ سکا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھائیں۔ کوئی مر جائے تو جنازہ... اور کبھی کبھی کوئی نکاح......

ہمارا تعلق اس مکتبہ فکر سے تھا جس کے ہاں حلوے مانڈے کے چانسز بہت کم ہوتے ہیں لیکن بھلا ہو گاؤں والوں کا جو ہم جیسے نہیں تھے وہاں سال کے ہر مہینے میں کوئی نہ کوئی عرس، ختم شریف، میلہ، محفل میلاد وغیرہ کا سلسلہ لگا رہتا تھا اور گاؤں کی بڑی مسجد کے امام ہونے کے ناطے ہمارے گھر میں نیاز آتی رہتی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری یہی سب سے بڑی عیاشی تھی۔ کسی کی منت پوری ہوئی تو اس نے ہمارے ہاں کھانا بھیج دیا۔ کسی نے اپنے مُردے کی نیاز دلائی تو ہمیں دیگ کے چاول کھانے کو مل جاتے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہمارا گزر بسر انہی نیازوں اور کھانے پر ہو رہا تھا۔ ہمارے گاؤں کے بجائے قصبے سے زیادہ لوگ بیرون ملک مزدوریاں کرتے تھے اور وہاں خود کو ڈالروں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نمایاں رکھنے کا شوق کچھ زیادہ ہی پایا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنے مکانات کی سجاوٹ اور نیاز ختم شریف، میلاد شریف کے کچھ زیادہ ہی شوقین تھے۔ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی بزرگ فوت ہو چکا تھا اور ان کی جمعراتوں کے جوڑوں سے ہمارے ننگ ڈھانپے جاتے تھے۔ میری تمام بہنیں صرف اس لئے دنیا میں آئی تھیں کہ ہوش سنبھالتے ہی انہیں نماز، روزے، قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے بعد حفظ کرنا ہے جیسے ہی ان کی عمر کچھ سوچنے سمجھنے والی ہوتی والد صاحب کسی اپنے ہم مسلک کے ساتھ بلا تخصیص عمر اور کام اس بے چاری کا نکاح پڑھا دیتے۔ میری پانچ بہنوں کی شادی ہو چکی تھی جن میں سے تین کے شوہروں کی عمر میرے والد صاحب سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ دو ایسے تھے جن کی دوسری اور تیسری شادی تھی اور پانچوں نزدیکی دیہاتوں کی مساجد میں موذن، خدمتگار یا پھر امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے نزدیک میری بہنوں کی حیثیت بالکل گھر کی بھیڑ بکریوں جیسی تھی جن کا کام تھوڑا چارہ کھا کر زیادہ دودھ دینا اور پھر اپنے مالک کے ہاتھوں ذبح ہو کر ان کے شکم کا ایندھن بھرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

میری تربیت روایتی ماحول میں ہوئی۔ والد صاحب نے قرآن پڑھنے کے بعد قریبی شہر کے مدرسے میں داخل کروا دیا جہاں حفظ کے لئے مجھے زنجیروں سے باندھ کر تشدد کیا جاتا۔ میں اس دوران تین مرتبہ بھاگ کر اپنے گھر آیا اور والد صاحب کے ہاتھوں ڈنڈوں سے پٹنے کے بعد واپس چلا گیا۔ والد صاحب میرے استادوں سے کہا کرتے تھے اس کا ماس آپ کا اور ہڈیاں میری..... اور میرے 'استاد' ان کے احکامات پر جی جان سے عمل کرتے تھے۔

پندرہ سال کی عمر میں ایک روز میں نے اپنے مدرسے کی دیوار پھلانگی اور راتوں رات جانے کتنے میل کا سفر طے کر کے قریبی قصبے کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا جہاں سے ایک مال گاڑی کے رینگتے ڈبے نے مجھے پناہ دی۔ میرے پاس مدرسے کے ایک طالب علم کے چرائے ہوئے تین سو روپے تھے جن کی مدد سے میں کراچی پہنچ گیا۔

کراچی میں زندگی کے پانچ سال کیسے کٹے؟ لمبی کہانی ہے۔ آپ کو سنا کر مزید بور نہیں کروں گا۔ پانچ سال بعد ایک روز جیب میں دس ہزار روپے لے کر والدہ، والد صاحب، بھائی اور بہنوں کے لئے کپڑے لے کر گاؤں پہنچا تو پہلی بجلی مجھ پر اس خبر نے گرائی کہ والد تین ماہ پہلے فوت ہو گئی ہیں۔ ماں نے میری جدائی میں رو رو کر جہاں اپنی بینائی قریباً ختم کر لی تھی وہاں خود کو بھی۔ ٹی کا روگ بھی لگا لیا۔ چھوٹے بھائی نے مسجد میں والد صاحب کی جگہ امامت

سنبھال لی۔ تین بہنوں کو یکے بعد دیگرے یرقان نے جکڑا جن میں سے ایک کی قریباً آخری سٹیج تھی۔

مجھے اس بات کا علم تو نہیں کہ ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا تھا اور یہ بھی میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ لیکن کراچی سے واپس آنے پر جب میں نے گھر کے حالات دیکھے تو احساس جرم کا شکار ہو کر خود کو اس کا ذمہ دار سمجھنا شروع کر دیا۔ عزیز رشتہ دار جو بھی ملنے آتے تھے یہی احساس دلاتے کہ میری وجہ سے والد صاحب فوت ہوئے ہیں اور مجھے اپنی اصلیت کی طرف واپس لوٹ آنا چاہئے۔ چھوٹا بھائی جس نے والد کی جگہ سنبھالی تھی مجھے اکثر یہی سمجھاتا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ میں تائب ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ جو میرے والد صاحب چاہتے تھے ویسا بن جاؤں شاید اس طرح میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔

میں نے باقاعدگی سے مسجد جانا شروع کر دیا۔ گاؤں میں 'پی سی او' بنا لیا۔ دو ٹیلی فون رکھ لئے اور اپنا کام چلانے لگا۔ اس دوران میں نے شرعی حلیہ بھی بنا لیا تھا۔

اس گاؤں میں شاید یہ پہلا 'پی سی او' تھا۔ میرے پاس اکثر لوگ فون کرنے آتے اور جاتے آمدن ہونے لگی۔ ان دنوں ہمارے علاقے میں ایک جہادی تنظیم کی بڑی شہرت تھی۔ اس کے کمانڈر کا تعلق ہماری ہی تحصیل سے تھا۔ میں آپ کو آغاز ہی میں بتا دوں کہ میں نہ تو کسی پاکستانی کا صحیح نام لکھوں گا نہ ہی کسی پاکستانی تنظیم کا البتہ افغانستان کے تمام نام، واقعات اور مقامات صحیح ہیں کیونکہ وہ تاریخ کا حصہ ہے اور میں تاریخ کے ساتھ دھاندلی نہیں کر سکتا۔

میری اس جہادی تنظیم کے ایک مقامی کمانڈر خان بھائی سے ملاقات کیسے ہوئی؟ لمبی کہانی ہے جس کا بیان ضروری نہیں۔ جلد ہی ہم اچھے دوست بن گئے۔ میں نے اپنی دلچسپی کے پیش نظر اپنی دوکان پر اخبارات اور رسائل بھی فروخت کرنے شروع کر دیئے تھے اور خان بھائی اس سلسلے میں میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی تنظیم ایک جہادی پرچہ نکالتی تھی جو وہ بطور خاص میری دکان پر رکھتے اور میرے سمیت گاؤں کے باقی نوجوانوں کو جہاد کی ترغیب دیا کرتے۔

خان بھائی کی زبانی ہمیں افغانستان میں شمالی اتحاد کے خلاف اپنے ضلع کے نوجوانوں کے بہادرانہ کارناموں کی تفصیلات ملتی رہتی تھی۔ خدا جانے وہ کون سا لمحہ تھا۔ اس کیفیت کو میں کیا نام دوں کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں بھی جہاد میں حصہ لوں..... کیونکہ خان بھائی کا تعلق بھی ہمارے ہی مسلک سے تھا اور والد مرحوم کے بعد اب ہمارے رشتہ دار جو درس و تدریس سے منسلک

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھے وہ بھی اس ضمن میں خاصے پرجوش دکھائی دیتے تھے۔

میں نے جب بھائی صاحب سے اپنی خواہش کا تذکرہ کیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ "الحمدللہ" نکلا! اور انہوں نے مجھے گلے لگالیا۔

یہ میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا!

اپنے گاؤں سے جہادی مرکز تک کا سفر میرے لئے ایک سرور و انبساط میں ڈوبے خواب کا سفر تھا... میرے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ کیمپ کی سختیاں اور تلخیاں میرے لئے طمانیت اور سکون کا باعث ہوتیں، میں نے ایک ماہ کی قلیل مدت میں وہ کچھ سیکھ لیا جو عام مجاہد ایک سال میں شاید نہ سیکھ پائے۔ "استاذ" میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ ٹریننگ کی تکمیل پر میری تشکیل ہوئی اور ایک گروپ کے ساتھ مجھے قندوز میں شمالی اتحاد کے ساتھ جہاد کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ جس گروپ میں میری تشکیل ہوئی اس میں عرب مجاہدین بھی شامل تھے ان کے ذوق جہاد اور شوق شہادت نے تو میری کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔

تین ماہ تک میں مصروف جہاد رہا جس کے بعد مجھے اپنے گھر جانے کا حکم ملا گو کہ دل نہیں چاہتا تھا لیکن "اطاعت امیر" لازم تھی۔ بڑے بوجھل دل سے میں گھر آیا جہاں بھائی صاحب اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے میرا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا یہیں مجھے علم ہوا کہ پندرہ روز پہلے میری چھوٹی بہن کا یرقان کی وجہ سے انتقال ہو گیا چونکہ میں مصروف جہاد تھا اس لئے گھر والوں نے اطلاع دینا مناسب نہ جانی۔ میں نے اسے رضائے الٰہی جان کر قبول کر لیا حالانکہ میں پہلے اسے معاشرتی قتل سمجھتا تھا۔

گاؤں آنے پر معلوم ہوا کہ خان بھائی افغانستان جہاد پہ جا چکے ہیں اور میرے لئے نیک تمناؤں کے پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ گاؤں میں معمول کی زندگی شروع ہو گئی۔ دوکان میں جو میں اپنے ایک بھانجے کے حوالے کر گیا تھا دوبارہ شروع کی اور اگلے حکم کا منتظر ہو کر بیٹھ رہا۔

ابھی مجھے بمشکل پندرہ روز گزرے تھے کہ نائن الیون کا حادثہ ہو گیا۔ حالات نے تیزی سے پلٹا کھایا اور اچانک امریکہ افغانستان پر چڑھ دوڑا۔ اب میرے لئے ایک لمحہ بھی یہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ فوراً میں جہاد کے لئے روانہ ہو گیا۔ ان حالات میں روانگی سوائے دیوانہ پن کے اور کیا تھی؟

○

میں معافی چاہتا ہوں آپ کو افغانستان میں داخلے کے راستوں سے آگاہ نہیں کر رہا۔ بہر حال اپنے گروپ کے ساتھ میں افغانستان کی طرف عازم سفر تھا۔ امارت اسلامیہ افغانستان میں داخل ہوتے وقت گاڑی میں بیٹھے ہوئے افغانستان کی سابقہ صورتحال ذہن میں نقشے بنا رہی تھی۔ دوپہر کے وقت سورج کی تپش جسم کو جلا رہی تھی۔ ہوا کی گرمی خشک پہاڑوں سے ٹکرا کر تشنگی کو بڑھا رہی تھی۔ یہ مٹی خاکی ہونے کے باوجود کسیلا پن رکھتی تھی۔ درخت سرسبز و شاداب تھے لیکن اس سبزہ میں آنکھوں کی تسکین کا رس نہ تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے جگنو کی طرح آسمان پہ ستارے اور خوفناک اندھیرا اپنی تاریکی میں اندھیر نگری کے باسیوں پر افشاں ہونے والے منظر سے کم نہ تھا۔ ابھی یہ منظر آنکھوں میں ایک بے کیف و سرور کردار کی طرح گھومتا پھر رہا تھا اور دماغ کی سوچنے کی رفتار دوران خون کی طرح اعصاب میں گردش کر رہی تھی۔ انہی تمام سوچوں میں ڈوبے ہوئے اچانک ڈرائیور نے بریک لگائی، دل ایک دم سہم گیا لیکن جب "ستڑے مہ شی" اور "پخیر راغلے" کے الفاظ کانوں میں پڑے تو دل و دماغ نے بے ساختہ تمام سوچوں کو یکدم ایک طرف پھینکا۔ آنکھوں نے دیکھا کہ بڑی سفید اور کالی پگڑی اور سینے پر اسلحہ کا زیور سجائے امارات اسلامی کے محافظ اپنے روایتی افغانی الفاظ میں مجاہدین کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کے پرتپاک استقبال نے ہمارے دل جیت لئے۔ دعاؤں کے ساتھ اپنی پوسٹ سے ہمیں رخصت کیا۔ چیک پوسٹ پر دونوں طرف لگے ہوئے سفید پرچم پر کلمہ طیبہ منقش اور امارات اسلامی کی پرامن ہواؤں سے لہراتے ہوئے گویا پیغام دے رہا تھا کہ آپ امن کے وطن میں داخل ہو گئے ہیں۔ یوں اہل حق کا قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اب افغانستان میں داخل ہوتے ہی عجب سماں محسوس ہوا۔ اول الذکر تمام موضوع سرعت کے ساتھ دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ جہاں سورج کی تمازت سے بدن جلا جا رہا تھا، وہاں سورج سکون جسم کا منظر دے رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے جنت عدن جیسی خوشبو سے مسرور ہو کر پیاس کو ختم کر رہے تھے۔ آسمان کی نیلگوں چادر روشنی اور رعنائی میں چمکدار اور شفاف دکھ رہی تھی۔ خاک ارض کا رنگ ایسا نکھرا ہوا تھا کہ آنکھوں کا سرمہ بنالیں تو بھی آنکھیں بجھ نہ سکیں سرسبزی و شادابی نظروں کو اپنے سے ہٹنے نہ دیتی۔ یہ ننھے ستارے کسی ٹمٹماتے جگنو سے کم نہ تھے جو کہ اپنی ہلکی سی روشنی سے آسمان و زمین کو روشن کئے ہوئے تھے۔ سارا نظام ہی الٹا محسوس ہوا۔ ہر رنگ میں دلکشی، ہر کوہ دامن دل آویز کہ ایک دم کوئی جادو نگری کے سماں سے کم نہ تھا۔ یہ ساری کی ساری اسلام کے نفاذ کی بہاریں تھیں۔ جس کا اقرار کئی غیر مذہب بھی کر چکے تھے۔

خوست میں طالبان کے گیسٹ ہاؤس میں پڑاؤ ہوا۔ رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد کھایا پھر وہاں سے باہر ایک بڑے چمن میں رات کھلے آسمان تلے گزارنے کی ہدایت ملی۔ یہیں سے ہماری تربیت شروع ہو گئی۔ کچھ اہم مقامات امریکی سیٹلائٹ نے اپنے ٹارگٹ پر رکھے تھے جن میں مجاہدین کی تنصیبات تھیں۔ B-52 اور F-16 طیاروں کی آوازیں رات کے اندھیرے میں سنائی دے رہی

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھی۔ رات ایک بجے تک تقریباً دو گھنٹے سوئے ہوں گے کہ اچانک پہرے پر متعین ساتھیوں نے جلد از جلد سب کو اٹھا دیا۔ ابھی آنکھوں نے نیند کا مزہ اور کیفیت کا پہلا مرحلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اچانک مزے کی موجودگی پر لبریز ہونے والی آنکھوں اور جسم کی تھکاوٹ نے ایک جھٹکے ہی میں کام تمام کر دیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے کانوں میں آواز پڑی کہ کابل جانے کی تیاری کرو۔ واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے اور وہاں پر 35 سواریوں پر مشتمل کوسٹر گھنے چمن کے درختوں کے سائے میں کھڑی تھی۔ نو گھنٹے مسلسل سفر کرتے گزرے تھے۔ لمبی قطار میں لگے ہوئے میں بھی اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا۔ اتفاق سے اگلی سیٹ پر جگہ مل گئی۔ بس میں سوار ہوتے وقت طالبان مجاہد گاڑی کے ڈرائیوروں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ خصوصاً لائٹ نہ جلانے پر زور دے رہے تھے۔ خوست سے گردیز اور لوگر سے کابل کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی محو سفر تھی۔ صبح کی نماز کے وقت ولایت لوگر میں پہنچے، ایک کھالے کے نزدیک برلب سڑک ہی نماز فجر ادا کرنی تھی جب وضو کے لئے پانی میں ابھی انگلی داخل کی تو پورا ہاتھ چشم زدن میں سن ہو گیا۔ وضو کے دوران پورے جسم پر کپکپی کے جھٹکے لگے۔ کانپتے ہوئے بدن کے ساتھ نماز فجر پڑھی اور دھڑام سے اپنی سیٹ پر چادر لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی آہستہ آہستہ کسی سڑک پر چڑھی۔ دور دراز پہاڑوں کے پیچھے سے سورج کی کرنوں کی ہلکی ہلکی پو پھوٹنے لگی۔ شفق کی سرخی نیلگوں آسمان پر عجب کیفیت کا سماں پیش کر رہی تھی۔ امارات اسلامی کے شمس اوّل کی کرنوں کے ساتھ پہاڑوں اور سرسبز کھیتوں کی ہریالی کو چمکاتے ہوئے دیکھا۔ ایک بڑے بورڈ کو دیکھا تو کابل داخلے کے استقبالیہ حروف لکھے تھے۔

تقریباً پونے گھنٹے بعد کابل شہر سے ملحقہ آبادی اور چھوٹے بازار شروع ہو گئے۔ ایک جگہ رکنے پر انگور لئے اور ناشتے کے طور پر کھائے۔ ایک ہوٹل کے باہر شہر کے وسط میں تمام گاڑیاں رکیں تمام ساتھی اپنی مرضی کے مطابق پسند کی چیز سے ناشتہ کرنے لگے۔ اس کے بعد کابل کی رونقیں دیکھتا قافلہ اپنے ہدف کی طرف رواں تھا۔ کابل کے ٹوٹے پھوٹے مکان مفاد پرستوں کی آپس کی خانہ جنگی کا شکار بنے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک کابل میں گھومتا ہوا قافلہ بے آباد اور سنسان گلیوں میں داخل ہو گیا۔ دارالامان کے قریب بنے کابل کے حفاظتی خط کی طرف بڑھے وہاں سے گاڑی سے اتر کر ان ویران اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے گرد گھومنا شروع کیا یہاں پر روس کی شکست و ریخت کے نشان بنے ہوئے جہاز اور ٹینک پڑے تھے۔ فضا میں طیاروں کی پروازیں جاری تھیں۔

یہ پورا علاقہ امریکی نشانے پر تھا۔ قریب ہی دو بلڈنگوں پر چند روز پہلے کروز میزائل بھی لگے تھے۔ جس میں کئی مجاہدین شہید ہو گئے تھے۔ کئی ساتھیوں سمیت ہم دیکھنے گئے تو وہاں پر کرینوں کے ساتھ بلڈنگ کا ملبہ اٹھایا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر خون آلودہ کپڑوں کے ڈھیر اور جوتے نظر آئے

رید غور کیا تو کٹے اعضاء اور بالوں کے گچھے اس ملبے میں پڑے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا منظر دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بمباری کی شدت کی وجہ سے امدادی کام میں دیر ہو گئی۔ ابھی کئی شہداء کے اجسام ملبے کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اس کی دوسری سمت مزید جیکٹوں اور خون آلود جوتوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو دل کو جھٹکے لگے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک تھرا اٹھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے بے پایاں جوش مارتے ہوئے سمندر کو سیلے کی طرح دھکا لگا۔ بات ہچکی بندھنے تک پہنچ گئی۔ اس منظر کے بعد امریکہ کے مظالم کے خلاف جوش و جذبہ مزید بڑھ گیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم واپس اپنی منزل کی طرف چلے۔ سامنے پہاڑ پر طالبان کے ٹینک اور طیارہ شکن توپیں نصب تھیں۔ تقریباً پون گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ایک جگہ غاروں میں داخل ہو گئے۔ یہ روس کے دور کی بنی ہوئی غاریں تھیں۔ وہاں پر دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر ظہر کی نماز پڑھ کر تھوڑا سا آرام کیا۔ کچھ فوجی ٹرکوں کی آمد کا معلوم ہوا۔ سب کو سامان سمیت ٹرک پر سوار ہونے کا حکم ملا۔ یہ ٹرک کابل کے بیچوں بیچ ہوتا ہوا بگرام جانے والے راستے پر چل پڑا۔ جگہ جگہ امریکی طیاروں کی بمباری سے کھڈے پڑے ہوئے تھے۔ امریکی طیاروں نے اس سپلائی لائن کو بند کرنے کے لئے سخت بمباری کی تھی۔ یہ سڑک بگرام پر بنے مورچوں پر طالبان کے شمالی اتحاد سے مزاحمت میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ طالبان کو تمام رسد اسی راستے سے آتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد گاڑی پکے روڈ سے نیچے کچے راستے کی طرف مڑی یوں ہمارا پڑاؤ رتھاسیہ پوائنٹ میں ہوا۔ یہاں معلوم ہوا کہ افغانستان میں دو محاذ ایک قندوز اور دوسرا بگرام نہایت گرم ہیں۔ ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ کافی تعداد میں ساتھیوں نے قندوز کے لئے نام لکھوایا۔ عصر کی نماز کے فوراً بعد اپنے سامان سمیت پونے گھنٹے تک پیدل چلتے رہے۔ چھوٹے موٹے پتھروں کی وجہ سے یہ راستہ برساتی نالہ محسوس ہوتا تھا۔ خشک پتھریلے راستے کے کنارے بنے ٹیلے میں شیر کی کچھاروں میں قیام ہوا۔ مسلسل چار دن سفر کرتے ہوئے تھکاوٹ بہت زیادہ تھی۔ غاروں کو صاف کر کے عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔

ساری رات سخت سردی کی وجہ سے بستر سے نکلنے کو دل نہ کرتا تھا۔ صبح کی نماز پڑھی تو معلوم ہوا بھائی عبداللہ شہید کراچی والے نے ساری رات پہرہ دیا ہے جو کہ ہمارے مقدم تھے۔ صبح کے ناشتے کی تیاری کے لئے قہوے کی بالٹی آگ پر پڑی تھی۔ سامنے والی غار سے پیغام آیا کہ اس

Uploaded By Muhammad Nadeem

ساتھیوں کی روٹی لے جائیں۔ افغانستان میں داخل ہونے کے بعد پہلا موقع تھا کہ خشک روٹی کے ٹکڑے کھائے۔ ہم دو ساتھیوں نے بھائی عبداللہ شہید سے اجازت لے کر رحمانیہ پوائنٹ پر موجود کینٹین جانے کا اظہار کیا۔ کینٹین سے کچھ کھانے کا سامان لے کر قریبی انگور کی بیلوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگے۔ میں اور عمران نے نزلہ زکام کی دوائی لینے کا ارادہ کیا تو ڈسپنسری ایک کنٹینر کو گاراایپ کر بنائی گئی تھی۔ یہاں پر ساری تعمیرات میں کنٹینر استعمال ہوئے تھے۔ مسجد بھی کنٹینر نما تھی جس میں ظہر کی نماز پڑھی اور بیت الخلاء اور غسل خانے بھی کنٹینروں میں بنے تھے۔ قریب ہی چھوٹے سے کھالے میں ٹھنڈا پانی اور اس میں شرارت کرتی مچھلیاں خوبصورت سماں پیش کر رہی تھی۔ اسی پانی کو اگلی غاروں میں سپلائی کیا جاتا تھا۔ روزانہ گاڑی یہاں سے کین بھر کر دن میں ایک مرتبہ پانی پہنچاتی۔ خیر چند گھنٹے ادھر اُدھر گھومنے کے بعد کینٹین سے بسکٹ لے کر پتھریلے راستے کو روندتے ہوئے اپنی کچھار کی طرف رواں دواں تھے۔

ابھی درمیان میں پہنچے کہ ایک دم حرکت کو روکا اور پتھر بن کر بیٹھ گئے۔ امریکی F-16 طیارے سر کے اوپر سے پرواز کر کے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے چلنے والے تمام ساتھیوں نے اپنی حرکت کو روکا ہوا تھا۔ اس کے بعد تیز قدموں سے اپنی غار میں پہنچے۔ دوپہر کے کھانے کا دسترخوان لگا تھا۔ کابل سے گاڑی رسد لے کر پہنچ گئی تھی۔ اس لئے تازہ روٹی دسترخوان پر موجود تھی۔ ساتھ ساتھ ہدایات چل رہی تھیں کہ لال رنگ کی ٹوپی اور جیکٹ اور سفید رنگ کی توپیاں استعمال نہ کریں کیونکہ طیاروں نے مسلسل پروازیں شروع کر دی تھیں۔ عصر کے قریب دودھ والی چائے مل گئی جس سے اعصاب ٹھکانے لگے۔ اب رات کو سوتے ہوئے پہرہ دینے کی ترتیب بنی، رات کو ریڈیو میں بھی خبر آئی کہ امریکی جنگی طیارے کابل اور بگرام کے علاقوں میں پروازیں کرتے رہے لیکن بمباری نہیں کی۔ خیر رات ابھی آدھی گزری تھی کہ بگرام میں موجود طالبان کے مورچوں پر بمباری شروع ہوگئی۔ صبح ہوئی تو ریڈیو پر بھی بمباری کا ذکر سنا۔ اس کے ساتھ ایک خبر سنی کہ افغانستان میں سردی کے آغاز پر برف باری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہلکی سی بوچھنے کے بعد باہر سے آنے والے ساتھی نے شمال کے پہاڑوں پر برف کا بتایا۔

جب باہر نکلے تو دیکھا کہ مشرق سے نکلتے ہوئے سورج نے پہاڑوں کو چاندی کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ ہر طرف تبصرے سننے کو ملتے کہ قندوز کی تشکیل کب ہوگی۔ تقریباً چار دن بعد معلوم ہوا کہ قندوز والے آج تیار ہو جائیں۔ سب ساتھی خوش خوش تھے۔ اپنے سامان سمیت رحمانیہ پوائنٹ پر

پہنچے وہاں پر کنٹینر کھڑے نظر آئے۔ کیونکہ بمباری کی وجہ سے کنٹینر استعمال ہو رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے سفر کے بعد کابل دارالامان کے قریب سنسان آباد علاقے میں گاڑیوں کی قطار لگی تھی۔ تقریباً 13 کے قریب گاڑیوں میں ہم تمام ساتھی بیٹھے اور یہ قافلہ مولانا اکرم شہیدؒ کی امارت میں قندوز کی طرف چل پڑا۔

قافلہ کابل شہر سے ہوتا ہوا وسطی افغانستان کے صوبے وردگ پہنچا اور راستے میں ظہر کی نماز میدان شہر میں پڑھی۔ یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ اس کے بعد جلریز سے ہوتے ہوئے ایک بار خشک پہاڑوں کے ساتھ کچی سڑک پر رواں تھے۔ سیاہ رنگ سے ہوتے ہوئے راستے میں سخت بارش ہوئی۔ اردگرد کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ راستہ کافی دشوار گزار تھا۔ کچی سڑک اور دیوہیکل چڑھائیاں دیکھ کر حیرت کی حد نہ رہی کہ اللہ ہمیں ان راستوں سے بحفاظت لے جا رہا ہے۔ کئی جگہ پر مال بردار ٹرک اور گاڑیاں کھائیوں میں گری پڑی نظر آئیں۔ کوتل حاجی گگ کے علاقے میں درجن بھر گھروں پر مشتمل آبادی کے پاس ہماری گاڑی خراب ہوگئی۔ عصر راستے میں پڑھ لی تھی۔ اب مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس علاقے میں بارش برف باری میں تبدیل ہوگئی۔ برف باری میں ہی مغرب کی نماز پڑھی اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی کے گیئر کا پرزہ ٹوٹ گیا تھا جو کہ کابل سے ہی مستری منگوا کر صحیح کروانا پڑتا تھا۔ قافلے کی تمام گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ منٹ اور گھنٹے گنتے ہوئے رات گزری، زندگی کی یہ ایک سرد ترین رات تھی رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔

صبح ہوئی تو گاڑی کے ساتھ موجود گھر کے بارے میں پتہ چلا کہ مسجد ہے۔ سارا سامان اس مسجد میں رکھا کچھ ساتھیوں نے زمین دوز بنی بھٹی میں لکڑیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو آگ جلا دی مسجد گرم ہوگئی لیکن چند گھنٹے بعد اس بستی کے ہزارہ قوم کے لوگ ہمیں یہاں سے نکالنے آ گئے۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ ہزارہ جات کہلاتا ہے۔ ہزارہ قوم کے افراد کے ناک چپٹے، آنکھیں چھوٹی اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور فارسی زبان تھی۔ اس بستی کے ایک شخص محمد علی جو کہ پشتو بھی جانتا تھا اس نے ہمیں قریب ہی موجود اپنے عزیز کے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کو کہا۔ سارا سامان اٹھا کر ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ اس نے اپنے گھر سے روٹیاں منگوائیں اور ہمیں بغیر کچھ دیئے اس ہوٹل میں تین دن پڑاؤ کرنا پڑا۔ حالانکہ یہ ہزارہ طالبان کے سخت دشمن تھے۔ میں اور بھائی سمیر کراچی والے کابل گئے اور گاڑی لے کر آئے۔ ہمارے ساتھ بھائی خالد جتوئی اور بھائی شاہد بھی شامل ہو گئے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

سب ساتھی گاڑی میں سوار ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم بامیان صوبے میں داخل ہو گئے۔ بامیان کے خوفناک درے رات کی تاریکی میں مزید خوفناک دکھائی دیتے۔ ان دروں کے قریب ہی رات بارہ بجے ایک ہوٹل میں قیام ہوا۔ صبح ہوتے ہی دروں کے بعد پہاڑوں کے ساتھ ساتھ کچی سڑک پر سفر جاری رہا، کابل سے چلنے والا دریا ساتھ ہی نہ چھوڑتا تھا۔ چند گھنٹوں بعد صوبہ بغلان میں داخل ہوئے، قندوز شہر کی طرف چل پڑے قندوز افغانستان کے سرسبز علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ قندوز میں طالبان کے ایک مرکز "مکتب" میں ٹھہرے ایک رات یہاں پر گزاری۔ ہم سے پہلے جانے والا قافلہ مزار شریف چلا گیا تھا۔ ہماری تشکیل بھی مزار کی طرف تھی لیکن اب ہم تین ساتھیوں کو دبہ تخار کے شہر طالقان روانہ کر دیا۔

قندوز سے طالقان کی طرف روانگی ہوئی۔ طالقان بھی انتہائی سرسبز علاقہ تھا۔ اس میں پانی کی فراوانی تھی۔ ایک گھر میں ہمارا پڑاؤ ہوا۔ اس میں بھائی عزیز الرحمن اور کچھ دوسرے مجاہد ساتھی بھی رہتے تھے۔ اس شہر کے بازاروں کو دیکھ کر حیرات تھے کہ سڑک کے دونوں طرف درختوں کی چھاؤں میں نئی مارکیٹیں معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ طالقان میں ٹھہرے دو دن ہی گزرے تھے کہ معلوم ہوا کہ مزار شریف کی پسپائی ہوگئی ہے۔ مزار شریف میں شولگرہ کے مقام پر بمباری کے بعد آدھی رات کے وقت گاڑیاں اور ٹرک جھلس گئے ہر طرف خون اور انسانی گوشت بکھرا پڑا تھا۔ وہاں سے زندہ اور زخمی ساتھی بے آب و گیا دشتوں میں رُل گئے کوئی کسی سمت چل پڑا اور کئی قندوز بحفاظت آ پہنچے۔ ان ساتھیوں نے جب بمباری کی داستان سنائی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے، ساتھیوں کے بقول جو ساتھی جس حالت میں پڑا تھا بمباری کے بعد ویسے ہی ملا کچھ آگ اور کچھ خطرناک بموں کی گیس نے اجسام کو کوئلہ بنا دیا تھا۔ گویا جسم کے جس حصے پر ہاتھ ڈالا جاتا وہ ریت کے گھروندوں کی طرح ٹوٹ جاتا شولگرہ سے ملحقہ دشت میں ایک ایک مجاہد کو امریکی طیارے نشانہ بناتے رہے۔

اس مرحلے پر طالبان قیادت نے مزار شریف سے پسپائی اختیار کی تو مزار میں نفاذ شریعت سے تعلق رکھنے والے مجاہدین سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ افراتفری کی حالت میں یہ مجاہدین پسپائی کی بجائے شمالی اتحاد سے مقابلہ کرنے پر بضد تھے۔ ذرائع کے مطابق پسپائی کے بعد سلطان رضیہ سکول میں پاکستانی مجاہدین نے مستقر بنا رکھا تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔

شمالی اتحاد والے جب وہاں پہنچے تو دو منزلہ عمارت کے اندر سے پے در پے فائرنگ کی گئی اس

کے علاوہ شمالی اتحاد والوں نے امریکی لڑاکا بمبار طیارے طلب کر لئے جن کی زمینی مقامات سے رہنمائی طلب کر لی گئی۔ سکول کے اندر بھی مجاہدین نے دفاع کے لئے مورچے بنا ڈالے اور شمالی اتحاد کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ امریکی طیاروں نے ہفتے کی سہ پہر دوبارہ سکول کو براہ راست نشانہ بنایا، بمباری اس قدر شدید تھی کہ کھڑکیوں کے ٹکڑے چوتھائی میل دور تک جا گرے، ان دھماکوں میں سینکڑوں پاکستانی شہید ہو گئے۔

امریکی بمباری سے زخمی ہونے والے کئی پاکستانی دل شکستہ اور بھوک و پیاس کی حالت میں بے بسی کی علامت بن گئے لیکن پھر بھی برابر مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر ان میں ہتھیار ڈالنے پر بحث ہوئی۔ اتنے میں عینی شاہدین کے بقول مکتب کی چار دیواری کے گرد ایک ہجوم جمع ہو گیا جو ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ کچھ لوگ باہر کھڑے 'طالبان' سے انتقام لینے کی باتیں کر رہے تھے۔ "مجاہدین کو قتل کر دو" محصورین جواب میں بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ وہ باہر آ کر گرفتاریاں دینا چاہتے ہیں، شمالی اتحاد کے فوجیوں نے انتظار کیا حتیٰ کہ 100 پاکستانی عمارت سے باہر آ گئے پھر اچانک ان درندوں نے پاکستانیوں پر فائر کھول دیئے، ان میں سے بیشتر شہید ہو گئے۔ چند لڑتے ہوئے پلٹے اور چار دیواری پھلانگ کر شہر میں نکلے مگر شمالی اتحاد کے والوں نے گلیوں اور گھروں تک ان کا تعاقب کیا اور انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا۔

ریڈ کراس والوں کو سلطان رضیہ سکول کے ارد گرد کی سڑکوں اور مکانوں سے شہداء کی 80 لاشیں ملیں، شمالی اتحاد والوں نے پھر سکول کی طرف توجہ مرکوز کی جہاں ہنوز سینکڑوں پاکستانی محصور تھے۔ دن بھر فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ سوموار کی صبح اتحادی کمانڈروں نے 12 مقامی ملاؤں پاکستانیوں کو تسلیم ہونے کی ترغیب دینے کے لئے بھیجے، سہ پہر کو وہ ہاتھوں میں قرآن مجید اٹھائے "تسلیم، تسلیم" اور "سلامتی کی کتاب کو مانو" کے آوازیں بلند کرتے عمارت کی طرف بڑھے۔

اسی سہ پہر اتحادی فوجی چار دیواری پار کر کے عمارت کے چند گز قریب پہنچے اور کھڑکیوں سے گرنیڈ اندر پھینکنے لگے۔ چند گھنٹے کی لڑائی کے بعد وحشی اتحادی غلبہ پانے میں ناکام رہے تو عمارت کی بیرونی دیوار پر پٹرول چھڑکا اور آگ لگا دی، آگ ساری رات جلتی رہی جسے مقامی باشندے دیکھتے رہے۔ کچھ پاکستانیوں نے عمارت سے باہر آ کر ہتھیار زمین پر رکھ دیئے۔ ان کے بعد مزید افراد باہر آئے تو ان پر بھی فائرنگ ہونے لگی۔ دوستم کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے اپنے آدمیوں کو دھاوا بولنے کا حکم دیا چنانچہ شمالی درندے ان بے یار و مددگار پاکستانیوں پر پل

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پڑے۔ سہ پہر کو عمارت کے اندر کی گنیں خاموش ہو گئیں تو اتحادی فوج آگ میں سلگتی عمارت کے اندر داخل ہوئے لیکن مزاحمت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اس وقت گشت کرتے اتحادی سپاہی عمارت کے ایک طرف سے گزرے جہاں تین پاکستانی زخمی مجاہد پناہ لئے ہوئے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود انہوں نے تادم آخر اتحادیوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر یکے بعد دیگرے جان جان آفریں کے سپرد کر گئے۔

دوستم کے کمانڈر عطا کے فوجیوں نے 175 اور دوستم کے فوجیوں نے 150 پاکستانی قیدی بنا لئے، جلی ہوئی عمارت سے ریڈ کراس والوں نے 400 لاشیں اکٹھی کیں اور ریگستان میں لے جا کر اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا لیکن 900 مجاہدین کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا کہ انہیں بے دردی سے قتل کیا گیا یا پھر یہ جنگ میں مارے گئے۔ عطا محمد نے مزار کے مضافات میں ایک سابق کاٹن ویئر ہاؤس میں قیدی رکھنے کا اہتمام کیا۔ قرآن کا واسطہ دے کر ان کو ہتھیار ڈال کر تسلیم ہونے پر بحفاظت پاکستان پہنچانے کے وعدے کی خلاف ورزی کر کے مجاہدین کے ساتھ یہ پہلی بدعہدی کی داستان رقم ہوئی۔ ہماری موجودگی میں چوتھے دن رات کو تخار میں موجود ہزار باغ کے مورچوں پر بمباری شروع ہو گئی۔ عین اسی روز دن کے وقت B-52 طیارے ہزار دن گول دائرے کے چکر لگا کر دھوئیں کے بادل بنائے ہوئے تھے۔ اس رات طالبان کی گاڑیاں سائرن بجاتی رہیں۔ طالقان میں رہنے والے طالبان ساری رات سوئے نہیں اور گھر کی چھتوں پر پوزیشن بنا کر بیٹھے رہے کیونکہ شہر کے اندر بغاوت کا خطرہ تھا اور یہاں کے لوگ تاجک تھے۔ احمد شاہ مسعود کے رشتہ دار بھی اس شہر میں وافر مقدار میں رہتے تھے۔ جب صبح ہوئی تو اشیاء صرف لینے کے لئے بازار گئے۔ ہر طرف مارکیٹیں بند تھیں اور لوگ ہمیں مسلح ہونے کے باوجود گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ایک کونے میں دو کاندار سے سامان لیا اور جلد ہی اپنے اطاق کی طرف چل پڑے۔ آدھ گھنٹے بعد حکم ہوا کہ اپنا سامان سمیٹ کر یہاں سے نکل جائیں۔ طالقان پر دشمن نے چڑھائی کر دی اور بلوت کا خطرہ ہے۔ ایک آٹھ سواری پر مشتمل سراچہ چل گیا۔ یوں قندوز کی طرف سفر شروع کر دیا۔ طالبان بھی اپنے ٹینکوں اور بھاری اسلحے سمیت طالقان سے انخلاء کر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد قندوز مکتب پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔

یہاں آ کر دیکھا تو پورا قندوز طالبان اور غیر ملکی مجاہدین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ یہاں معلوم ہوا کہ دو دن قبل قندوز کے ضلع دشتِ ارچی اور خواجہ غار پر بنے مورچوں پر سے بھی طالبان کی

پسپائی ہو گئی تھی۔ ان مورچوں پر امریکی طیاروں نے تباہ کن بمباری کی۔ ایک جگہ پر تو باقاعدہ طور پر زمین سے پانی نکل آیا اور پیالہ نما حوض کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس پانی سے چند دن مجاہدین بھی فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ ان مورچوں کے لئے پانی دریائے آمو سے کھچروں کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ خواجہ غار، دشتِ ارچی اور امام صاحب کے مورچوں پر غیر ملکی مجاہدین کی کافی بڑی تعداد تھی۔ اچانک پسپائی سے دور دراز مورچوں تک خبر نہ پہنچنے کی وجہ سے کئی ساتھی اپنے مورچے اور ہتھیاروں میں رہ گئے تھے۔ انہیں اس وقت معلوم ہوا جب شمالی اتحاد کے ٹینک اور گاڑیاں ان پر بارود برسانے لگے۔ ان بے کس مجاہدین نے بھی دیدہ دلیری سے مقابلہ کیا۔ افراتفری کی وجہ سے رات کی تاریکی میں کچھ اتحادی آپس میں بھی فائرنگ کا تبادلہ کرتے رہے۔

اس پسپائی کے دوران بھی مجاہدین کو بڑی بے دردی سے شہید کیا گیا۔ کئی دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور وہاں سے پسپائی اختیار کرنے والے سینکڑوں مجاہدین پیدل بھوک اور پیاس کے ساتھ ان صحراؤں میں بھٹک بھٹک کر قندوز پہنچے۔ تقریباً سات دن تک مجاہدین کو بھر بھر کر طالبان کی لاری قندوز تک ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچاتی رہی۔ اس پسپائی کی تفصیل لکھی جائے تو ایک کتاب بن جائے گی۔ مزار شریف کی پسپائی کے بعد شمال کے صوبے آہستہ آہستہ طالبان کے ہاتھوں سے نکل رہے تھے۔ بامیان اور بغلان بھی طالبان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یوں کابل سے قندوز آنے والی سپلائی لائن کٹ گئی۔ ہندوکش کے مشرق میں واقع صوبہ سمنگان پر بھی طالبان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ صوبہ بغلان کی وجہ سے شمالی راستے کے ذریعے طالبان کی سپلائی تخار اور قندوز تک پہنچتی تھی۔ جیسے ہی اس سپلائی لائن پر دشمن کا قبضہ ہوا طالبان قندوز میں محصور ہو کر رہ گئے۔ پھر قندوز کئی روز تک عالمی خبروں کا موضوع بنا رہا۔ ماضی میں ان سپلائی لائنوں پر طالبان نے بھی 1997ء میں مقامی کمانڈروں کی مدد سے قبضہ کیا تھا۔ اب مقامی کمانڈروں کی غداری کے باعث ہی طالبان کو ان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ 1997ء میں مقامی کمانڈر بشیر بغلانی نے جنوبی لائن اور قندوز کے سابق گورنر عارف خان نے شمالی لائن پر قبضہ میں طالبان کی مدد کی تھی۔ طالبان کے زمینی اور فضائی نقل و حرکت مسدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مزار شریف اور بغلان جب طالبان کے ہاتھوں سے نکل گئے تو بامیان پر کنٹرول رکھنا مشکل ہو گیا لیکن طالبان نے پہلے سے موجود دس ہزار فوجیوں کی مدد کے لئے تین ہزار فوجی مزید منگوا لئے تھے اور انہیں غور بند کے محاذ پر چوکس کر دیا جو بامیان کا واحد راستہ تھا۔ یہ راستہ دشمن کے پروان صوبے کی طرف سے آ کر ملتا

Uploaded By Muhammad Nadeem

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھا۔ مزید آگے جا کر کابل اور میدان وردگ صوبے تک جاتا تھا۔ اگر یہ راستے طالبان کے قبضے سے پہلے نکل جاتے تو پھر دشمن کے فوجی چند دنوں میں بامیان کے علاقے شکاری درہ اور برفاک کے علاقے تک پہنچ جاتے جو طالبان کے کمانڈر ملا باز محمد کے کنٹرول میں تھے۔ یہ برہان الدین ربانی کا سابق کمانڈر تھا لیکن طالبان کے ساتھ مل گیا تھا۔ غرض یہ کہ ان صوبوں کا کنٹرول ختم ہونے کے بعد طالبان کی بڑی تعداد کابل کی طرف نکل پڑی اور کچھ تعداد قندوز کی طرف آ گئی۔ گویا سب اطراف سے طالبان پسپائی کے بعد قندوز میں محصور ہو کر رہ گئے۔ قندوز میں رہتے ہوئے وقت کی اہم ضرورت قندوز کا چاروں طرف سے دفاع تھا۔ اس لئے طالبان کی قیادت نے وقت ضائع کئے بغیر ہی چاروں طرف دفاعی محاذ بنائے۔ قندوز کے شمال میں بنگی کے قریب دفاعی مورچے بنے۔ مشرق میں خانہ آباد اور جنوب میں علی آباد کے قریب اہم مقامات پر مورچے بنے

شمالی افغانستان کے صوبوں سے طالبان کی پسپائی کے اثرات مغرب تک بھی پہنچ گئے۔ ایران کے بارڈر سے ملحقہ صوبے بھی بغاوت کی وجہ سے طالبان کے کنٹرول سے نکلتے جا رہے تھے۔ اسماعیل خان پہلے سے تیار بیٹھا تھا کہ طالبان جونہی نکلے تو اپنے صوبوں کا کنٹرول دوبارہ سنبھالے۔ ان پسپائیوں نے اب کابل کا رُخ اختیار کیا۔ کابل جانے والی شاہراہ پر ایک طالب مجاہد سڑک کے کنارے کھائی میں زخمی پڑا تھا۔ شمالی اتحاد کے فوجی وہاں آئے اور اس کی جان بخشی کی درخواست نظر انداز کر کے اسے گھسیٹ کر سڑک پر لے گئے اور بُری طرح زدوکوب کیا۔ اس نے پھر رحم کی درخواست کی جو مسترد کر دی گئی۔ ایک ظالم نے اس کی شلوار اتار کر اسے برہنہ کر دیا اور پھر تین افراد نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جبکہ باقی خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ چند لمحوں میں زخمی مجاہد جام شہادت نوش کر گیا۔

شہر میں جہاں کہیں بھی طالبان، عرب اور پاکستان مجاہدین ملے، انہیں وحشیانہ طریقے سے شہید کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ہتھیار ڈالنے کی شرط پر بھی جان بخشی نہ کی گئی۔ بعض کے سر کے زخموں اور ناک میں افغانی نوٹ ٹھونسنے کی مجنونانہ حرکت کی گئی۔ انہیں بُری طرح زدوکوب کر کے قتل کر دیا گیا۔ شمالی وحشیوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر زخمی طالبان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور ان کے خون سے انتقام کی پیاس بجھائی۔ 12 نومبر کی سہ پہر جب شمالی اتحاد کی فوج کابل کے 28 میل شمال میں اپنی مستقر سے دارالحکومت کی طرف بڑھی تو پرانی شاہراہ پر انہیں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ بے پناہ امریکی بمباری نے ان کی راہ صاف کر دی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ ایک ہزار پاؤنڈ کے

امریکی بموں سے دس دس فٹ گہرے گڑھے بنے ہوئے تھے۔ طالبان کے بنکرز خالی تھے۔ بعض میں طالبان مجاہدین کی لاشیں پڑی تھیں۔ ایک مقام پر طالبان نے چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ کی اور شمالی اتحاد کا ایک فوجی مُردار کیا۔ ایک طالب ان کے ہاتھ آ گیا۔ اس کو زدوکوب کر کے جیپ میں بٹھا لیا گیا۔ شام تک طالبان کی معمولی مزاحمت دم توڑ گئی۔ شمالی اتحاد کی بریگیڈ نے قرہ باغ آ کر قیام کیا۔ جسے امریکی بمباری نے کھنڈر بنا دیا تھا۔ بائیں طرف ایک گاؤں بمباری کے نتیجے میں بُری طرح جل رہا تھا۔ اس دوران طالبان نے قرہ باغ پر کوئی جوابی حملہ نہ کیا۔

اگلے روز کابل کی جنگ بمشکل تین گھنٹے جاری رہی۔ اس میں شمالی اتحاد کے دس فوجی مُردار ہوئے۔ امریکی فضائی بمباری نے طالبان کے اگلے مورچے تباہ کر دیئے تھے۔ ڈیڑھ اور ساڑھے تین بجے کے دوران خونریز جھڑپ ہوئی۔ جیسے ہی طالبان کو قرہ باغ پر شمالی اتحاد کے قبضے کی اطلاع ملی۔ انہوں نے کابل خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ آٹھ ہزار طالبان میدان شہر، غزنی اور لوگر کی طرف پسپا ہو گئے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کابل کے شہروں کا بے پناہ جانی نقصان ہو۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ آٹھ سو گاڑیاں طالبان ساتھ لے گئے اور بھاری اسلحہ اور ٹینک وہیں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے پیچھے شہر میں بڑی لوٹ مار ہوئی۔ منگل کا سورج نکلتے ہی شمالی فوجیوں نے کابل پر دھاوا بول دیا۔ وہ جیپوں، ٹرکوں اور ٹینکوں میں سوار کابل کی طرف بڑھے۔ راستے میں اکا دُکا طالبان مجاہد اور زخمی ملے جنہیں قیدی بنانے کی بجائے ان کے جسموں میں گولیاں اتاری گئیں۔ حملہ آور فوجی ایک جھونپڑی سے ایک مشتبہ بے ریش نوجوان کو گھسیٹ لائے اسے بُری طرح پیٹنے لگے۔ تو مغربی صحافیوں نے آگے بڑھ کر اس کی جان بچائی۔ وہ زمین پر زخمی پڑا تھا۔ اسے معمولی زخم آئے تھے مگر خوف سے بے حس ہو گیا تھا اور اس کی نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔

جنرل گل حیدر کی کمان میں شمالی اتحاد کی فوج ساڑھے چھ بجے صبح کابل کے مضافات میں پہنچ گئی تھی اور بین الاقوامی یقین دہانیوں کے پیش نظر کہ شمالی اتحاد کابل میں داخل نہیں ہوگا۔ وہ کئی گھنٹے وہیں رُکے رہے۔ پھر اتحاد کا کمانڈر، بسم اللہ خان وہاں آ پہنچا اور اس نے پیش قدمی کا حکم دیا۔ اتحادی فوج کے آگے آگے مغربی صحافی شہر میں داخل ہوئے اور شہریوں نے ملے جلے جذبات سے ان کا استقبال کیا۔ شہر میں ادھر اُدھر تشدد کے واقعات پیش آئے۔ دو عرب مجاہد ہوائی اڈے کے نزدیک ایک گھر کے باورچی خانے میں گھیرے میں آ گئے۔ مقامی مسلح افراد کا انہوں نے ایک

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

گھنٹے مقابلہ کیا۔ پھر کوئی چارہ کار نہ پا کر کلمہ شہادت پڑھا اور اپنے ہی گرنیڈ مار کر شہادت سے ہمکنار ہو گئے۔ شہر نو میں تین عرب اور تین پاکستانی مجاہد اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے ساتھی شہر چھوڑ گئے ہیں۔ وہ صبح کے وقت ایک دفتر سے نکلے تو شمالی اتحاد کے حامیوں کے گھیرے میں آ گئے۔ انہوں نے مقابلہ تو کیا مگر دشمن زیادہ تعداد میں ہونے کے باعث غالب آئے جو نعرے لگا رہے تھے "پاکستان مردہ باد" وہ کنکریٹ کے ایک خشک نالے تک پہنچے جس میں دو زخمی مجاہدین پڑے تھے۔ شمالیوں نے انہیں بوٹوں سے ٹھوکریں ماریں اور کچھ نے مغربی صحافی کو کھینچ کر آگے کر دیا کہ مظلوموں کی بے کسی کا نظارہ کریں۔ شمالی فوجیوں نے سانس لیتے دونوں زخمی مجاہدوں کے سینے میں کلاشنکوف کی گولیاں اتار دیں، ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر ایک تیسرے شدید زخمی مجاہد کی آنکھیں چاقو سے نکال لیں۔ اس درندگی پر بش، بلیئر، رمز فیلڈ اور ان کے ساتھیوں کی "بدروحیں" کس قدر خوش ہوئی ہوں گی!

شام تک شمالی اتحاد والوں کا کابل پر قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ ان کے چھ ہزار مسلح افراد نے شہر میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ پانچ سال کی بندش کے بعد پہلی بار کابل میں موسیقی سنائی دینے لگی۔ پک اپ ٹرک پشتونستان چوک میں چکر لگا رہا تھا۔ اس میں طالبان کی سخت گیری کے شاکی بعض افراد سوار تھے۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے رقص کر رہے تھے۔ انسانی فطرت کے بھی عجب عجب رُخ ہیں۔ ایک طرف طالبان امریکیوں اور شمالی اتحادیوں کے جور و استبداد کا سامنا کر رہے تھے اور دوسری طرف کچھ گمراہ روحیں ان کی شہادت کے جشن منا رہی تھیں۔ یہ تمام حالات مغربی میڈیا پر منظر عام پر آتے رہے لیکن کسی انسانی حقوق کے ادارے نے اس کو روکنے کی جرأت نہ کی۔

○

سقوط کابل نے قندوز میں محصور مجاہدین کو بھی بڑا دھچکا لگایا۔ انہی دنوں میں ہم چند ساتھیوں کے ایک گروپ کو بھی محاذ جنگ پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ قندوز سے شمال کی طرف بنے دفاعی مورچوں پر ہم 50 کے قریب ساتھی پہنچ گئے۔ یہ مورچے طالقان جانے والی سڑک کے ساتھ دشوار گزار پہاڑی کی چوٹیوں پر بنے تھے۔ اپنے بھاری سامان سمیت اسلحہ اور گولہ بارود لئے اور ان دشوار گزار راستوں کی چڑھائی چلتے ہوئے جگہ جگہ گولیوں اور بموں کے خالی خول نظر آ رہے تھے۔ ایک گھنٹے کی مسلسل اونچائی نے ٹانگوں کو بے جان بنا دیا اور چہرے مٹی سے بھر گئے۔ دور ایک چوٹی پر طالبان اپنی ہیوی گن والے دو میلے ٹرک کو چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دور سے یہ

روسی ٹرک ایسا معلوم ہوا کہ ابھی یہ ٹرک قریبی کھائی میں جا گرے گا۔ سر توڑ کوشش کے بعد سب سے اونچی چوٹی پر یہ ٹرک بالآخر چڑھ گیا۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے یقین نہ آتا تھا کہ یہ ٹرک کس طرح اس پہاڑ پر چڑھ گیا۔ گویا ناممکن کام بھی طالبان نے اللہ کی نصرت سے ممکن بنا لیا تھا۔ ایک جگہ سے کچھ طالبان ساتھیوں نے اس گروپ کو مختلف سمتوں میں پھیلا دیا۔ ہم جس چوٹی پر پہنچے تو وہاں سے طالقان جانے والی سڑک پر دیکھتے ہی کیڑے نما گاڑیوں اور ٹینکوں کا ایک جدنگاہ قافلہ قندوز داخل ہوتے دکھائی دیا۔ عین اسی وقت ہر طرف مجاہدین نے پوزیشن سنبھال لی۔ یہ قافلہ L-M-G اور راکٹ لانچر کی رینج میں تھا۔ اوپر سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی اور اتفاق سے تازہ دم دستہ نیچے سڑک پر بھی تعینات تھا۔ اتنے بڑے لشکر کو اپنی آنکھوں سے ابرہہ کی طرح اپنے ہی ساتھیوں کو روندتے ہوئے بھاگتے دیکھا۔ یہ منظر آنکھوں کو بھولتا نہیں۔ اللہ نے اتنی بڑی نصرت اور فتح پہلی بار دکھائی۔ طالبان بھاگتا لشکر دیکھ کر خوشی سے رو رہے تھے اور صلوٰۃ شکرانہ پڑھنے لگے۔ ان کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ بھائی سلطان شہیدؒ اپنے مخابرے سے طالبان قیادت کو ساری کارروائی کا حال بیان کر رہے تھے۔ اب رات ہوئی سخت سردی اور شمالی افغانستان کی سرد ہوائیں کھلے آسمان تلے اپنے مورچوں میں سو گئے۔ آدھی رات کے بعد پہرہ دینے کے لئے کمین گاہ کی طرف جاتے تو ہوا کی خوفناک آواز، رات کی تاریکی اور سامنے موجود اونچی نیچی دشمن کی چوٹیاں عجیب خوفناک منظر پیش کرتیں۔ اندھیرے میں گرتے پڑتے کمین گاہ تک پہنچے کہ اسی وقت امریکی سیٹلائٹ والے آئے اور تصویریں لینے کے لئے فلیش مارنے لگے۔ ان سے نکلے والی روشنی سورج کے مشابہ تھی۔ تاحدنگاہ روشنی نظر آنے لگی۔ پہلی بار تو گھبراہٹ محسوس ہوئی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سیٹلائٹ اتاری گئی تصویریں اپنے کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے ذریعے B-52 کو دیتا ہے۔

صبح کی روشنی پھیلی تو ہمارے مورچے کے نیچے کیڑی نما پانچ سو گھروں پر مشتمل گاؤں ابھی اندھیرے میں ڈوبا نظر آیا۔ یہ گاؤں برلب سڑک آباد تھا اور سڑک کے پار دریا کے دوسرے کنارے بھی ایک بستی تھی۔ بلند ترین پہاڑی پر تعینات ہونے کی وجہ سے ہمیں یہ سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ دور سے چاندی کی طرح چمکتے ہوئے جہاز انتہائی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہ امریکی طیارے چکر لگا کر سروں پر منڈلانے لگے۔ F-16 طیاروں نے اب نہایت سرعت کے ساتھ نیچی پرواز لی اور ہم پر بم پھینکنے شروع کر دیئے۔ دوسرے چکر میں B-52 کسر پوری کر دیتا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بموں کے برسٹ ہمارے آگے پیچھے لگنے شروع ہو گئے۔ بموں اور بارود کی بارش پہلی مرتبہ دیکھی۔ قندوز میں سب سے زیادہ بمباری اسی دفاعی لائن پر ہوئی۔ دوسری طرف شمالی اتحاد کی تاجک فوج اسی محاذ پر ہمارے سامنے دور دراز پہاڑوں پر مورچے بنائے بیٹھے تھی۔ ان کا رابطہ امریکی جہازوں سے ہونے کی بدولت طیارے ہم پر منظم طریقے سے بمباری کرتے رہے۔ تاجک فوج کے قندوز داخل ہونے کے اس خط اور دفاعی مورچوں کو توڑنا لازم تھا۔ ہمارے کئی ساتھی بمباری سے سرفرازی پاتے رہے۔ باجماعت نماز تک شدید بمباری کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہو گیا تھا۔

رات کے وقت پہاڑی کے دامن والی بستی میں کئی گھروں میں آگ جلتی دیکھ کر طیاروں نے بمباری شروع کر دی۔ عورتوں بچوں کی چیخ و پکار رات کے سناٹے کی وجہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ بستی کو تو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ حالانکہ وہ ہمارے مورچوں سے ہزاروں فٹ نیچے موجود تھی۔ اس بستی کے بارے میں ایک واقعہ ہم دو ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب ہمیں روٹی اور پانی پہنچانے والی گاڑی نہ پہنچی۔ بھوک سے تو دو ہاتھ کر لیتے لیکن پیاس سے حالت بُری ہو جاتی ہے۔ صبح کے وقت سے ہمیں بستی کے لوگ اپنے مویشیوں اور ضروری سامان سمیت قندوز شہر کی طرف چلتے نظر آئے۔ گویا گھر کے گھر خالی ہو گئے۔ میرے ساتھ بھائی شفقت شہید نیچے بستی کی طرف چلے۔ ہم نے نیچے اترنے کا راستہ کمین گاہ کی طرف سے استعمال کیا اور اوپر سے طیارے پروازیں کر رہے تھے۔ ہمارے پاس پانی کی ایک نیلے رنگ کی کین تھی۔ راستہ کئی جگہ سے اونچا نیچا تھا۔ لہٰذا کئی دفعہ پہاڑ کے ساتھ بیٹھ کر رینگتے ہوئے چلتے رہے۔ جب بستی میں داخل ہوئے تو اپنی گنوں کے لاک کھول دیئے۔ بستی میں آ کر عجیب سا محسوس ہوا۔ ہر طرف سناٹا۔ جگہ جگہ کچے گھر اپنی خستہ حالی اور ٹوٹ پھوٹ کا رونا رو رہے تھے۔ خوبصورت باغات، نہری پانی اور فصلوں سے بھرا علاقہ اپنے اجڑنے کا ثبوت کچھ اس طرح سے دے رہا تھا کہ انسان کجا یہاں تو کوئی جانور یا پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس بستی سے گزرنے والا نہری نالہ شدید بمباری سے اپنا راستہ بدل گیا تھا۔ بڑا کھالہ تھوڑا سا دور تھا۔ اس طرف پلٹتے تو دور پہاڑی پر شمالی اتحاد والے مورچہ لگائے بیٹھے تھے۔ بستی کی خستہ حالی دیکھتے ہوئے ایک کنویں پر نظر پڑی۔ اب حوصلہ بڑھ گیا۔ کنوئیں سے نامعلوم دیسیوں ڈول نکال بیٹھے لیکن پانی مٹیالہ رنگ کا نکلتا رہا۔ ہمت نہ ہاری اور اب صاف پانی کی آمد شروع ہوئی۔ بمباری کی وجہ سے کنویں کے پانی میں مٹی مل گئی تھی۔ ابھی کین

بھرنے کے قریب تھی کہ کنوئیں سے سامنے والے گھر کا کوڑا اندر سے ہلا اور ایک آدمی ہماری طرف لپکا۔ ہم نے احتیاط سے گن سیدھی کر لی۔ ہماری اس حرکت کو بھانپتے ہوئے اس نے دور سے پشتو بولنی شروع کر دی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے شدید بمباری کا رونا رویا۔ عاجزانہ درخواست کی کہ آپ طالبان ہیں میرا اور میری بوڑھی ماں کا خیال رکھیں اور اوپر سے کوئی فائر بستی میں نہ کریں۔ مزید بتایا گیا کہ بستی میں اور میری ماں سمیت کوئی بھی نہ رہا۔ اس کنویں کے عقب پر ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو دیکھ کر تجسس ہوا کہ اس کے اندر کی صورت حال دیکھیں۔ ٹوٹی دیوار سے میں اندر داخل ہوا تو کیا دیکھا کہ اس ملبے میں مجھے ایک بالوں کی چٹیا نظر آئی۔ میں سمجھا شاید کوئی عورت ملبے تلے آ کر دبی ہے۔ بالوں کی چٹیا پر ہاتھ ڈالا تو وہ تنہا ہاتھ میں آ گئی۔ چٹیا پھینکی اور باہر نکل آیا۔ نہ جانے کتنی عورتوں اور معصوم بچوں کی آوازیں چیختے پکارتے دم توڑ گئی تھیں۔ جس راستے سے آئے وہ کافی لمبا تھا اور اب اس کے مترادف بالکل ترچھا راستہ اختیار کیا جو کہ بغیر بل کھائے سیدھا مورچوں تک پہنچتا تھا۔ کین لئے ابھی ہم راستے کے درمیان میں پہنچے ہوں گے کہ طیاروں نے مورچوں پر بمباری شروع کر دی۔ پاؤں کی سکت، جسم کی توانائی چڑھائی پر تیزی کے ساتھ چڑھنے سے بالکل آخری دموں پر پہنچی تو اپنے مقام کے قریب پہنچ گئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی صورت حال پیش آئی اور پل بدلتے نئے سے نئے واقعات ہوتے رہے۔

شام کے قریب شمالی اتحاد اپنے توپ کے گولوں اور ایل۔ ایم۔ جی سے فائر کرتے رہے۔ طالبان کی طرف سے بھی ٹینک کے گولے داغے جانے لگے، دور نظر آنے والے فوجی ٹینک کے گولے لگنے سے بھاگ جاتے۔ ہمارے سر کے اوپر سے گولیوں کی آوازیں تیز ہواؤں کو چیرتی ہوئی ''شائیں شائیں'' کرتی گزرتی۔ ادھر طیارے بھی بمباری میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ عجب منظر اس وقت پیش آتا جب طیارے بموں کے برسٹ چھوڑے جاتے، ان بموں کی بارش میں صرف زمین تک آنے کی آواز ہی خوفناک حد تک کانوں کو چیرتی ہوئی نکلتی اور جب بم پھٹتے تو کلیجے پھٹ جانے کے قریب ہوتے۔ ہر طرف مٹی کے اڑتے ہوئے بادل گھنٹوں چھائے رہتے۔ پورا جسم اور کپڑے گرد و غبار سے بھر جاتے۔ کئی ساتھی منوں مٹی تلے دب کر مورچوں میں شہید ہو جاتے اور کئی ہوا میں بکھر کر شہادت سے سرشار ہوتے رہے۔ اس جگہ مٹی بہت نرم تھی اور امریکی طیارے کنکریٹ کے بنکر توڑنے والے بم استعمال کر رہے تھے جو کہ نرم مٹی میں پیوست ہو جاتے اور اللہ کی مدد سے ہم زیادہ تباہی سے بچ گئے۔ ان مورچوں کے چھ دن اور راتیں بھولنے والی

Uploaded By Muhammad Nadeem

نہیں۔ چھٹے دن دوپہر کے وقت تازہ دم نفری آئی، مورچوں کا کنٹرول ان کے حوالے کر کے ہم نیچے سڑک پر اتر آئے۔

O

مورچوں سے واپسی پر قندوز شہر کے وسط میں ایک گھر میں پڑاؤ ہوا۔ پہلے دن ہی کپڑے دھوئے اور غسل کیے۔ آرام کرنے کے بعد ہم بھی تازہ دم ہو گئے۔ اس گھر کے قریب ہی حاجی ارباب ہاشم کا اطاق اور قندوز کا مرکزی مخابرہ سسٹم تھا۔ یہ ایک قسم کا گیسٹ ہاؤس تھا۔ جہاں پر مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے کمروں کے علاوہ دورویہ دسترخوان کی لمبی لائن لگی نظر آتی۔ سینکڑوں مہمان یہاں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اکثر وقت وہاں پر طالبان سے گپ شپ اور معلومات کے تبادلے میں گزرتا۔ حاجی ارباب ہاشم کے بیٹے کا ڈرائیور ناصر جمال اچھا خاصا دوست بن گیا۔ ایک رات گزرنے کے بعد ہمارے گروپ کا تبادلہ تھوڑی دور ہیلوٹرسٹ کی بلڈنگ میں ہوا۔ یہ افغانستان کا ''من صاف کرنے کا ادارہ تھا۔ ہیلوٹرسٹ کے شمال میں موجود اس ہیڈکوارٹر میں جدید ترین آلات اور مشینریاں نظر آتی۔ یہاں کا عملہ امریکی حملے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ شمالی افغانستان کے دیہاتوں کے نقشے دیواروں پر آویزاں تھے۔ اس عمارت سے چند قدم ہٹ کر ہیلوٹرسٹ کی دوسری بڑی عمارت تھی جو کہ ازبکستان کے مجاہدین کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ان کا تعلق ''اسلامک موومنٹ آف ازبکستان IMU)'' سے تھا۔ واضح رہے کہ امریکہ نے حملے سے قبل جن اسلامی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا تھا۔ اس میں یہ بھی شامل تھی۔ غرض یہ کہ قندوز شہر کے جس طرف بھی ہم جاتے مجاہدین کی پناہ گاہیں نظر آتیں۔ طالبان اور غیر ملکی مجاہدین کی سب سے بڑی تعداد قندوز کے مدرسے تجارستان میں تھی۔ چاروں اطراف سے بمباری کا سلسلہ سمٹ کر شہر میں آ رہا تھا۔ امریکی جاسوس اور جنگی طیارے گھنٹوں فضا میں معلق رہ کر حالات کا جائزہ لیتے تھے۔ کبھی فضا کے اندر ہی دو طیاروں کو تیل دینے کے لئے ایک بڑا جہاز بھی نظر آتا۔ جس سے نکلتے ہوئے پائپ طیاروں کو فضا میں معلق رکھ کر ایندھن پہنچا رہے تھے۔ اتفاق سے انہیں دنوں قندوز کے بڑے سرکاری ہسپتال میں بھی جانا ہوا۔ وہاں پر زخمیوں کی چیخ و پکار سننے اور دیکھنے پر بڑے سے بڑے کلیجے والا شخص بھی دل چھوڑ بیٹھتا۔ ساتھیوں کی عیادت کے لئے وقتاً فوقتاً ہسپتال میں چکر لگانے پڑتے۔ یہاں جگہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ انتظامیہ نے متفرق خالی حصوں کو بھی وارڈوں کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ طالبان مجاہدین کے برعکس مریضوں کی اکثریت قندوز کے مضافات اور شہر

کے مظلوم لوگوں کی تھی جو کہ سفاکانہ بمباری میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ قندوز میں افغانستان جنگ کے دوران شدید ترین بمباری کی گئی۔ آخری دنوں میں قندوز میں واقع مکتب کو خالی کیا گیا تو وہاں کے لوگوں نے سارا سامان لوٹ لیا۔ قریب رہنے والے تاجک نژاد نے تو مکتب کے اندر کھڑی پرانی گاڑی کو بھی نہ چھوڑا۔ اسے چند افراد گھسیٹ کر دروازے کے قریب لے آئے تھے۔ شہر کے وسط میں واقع یہ عمارت بھی امریکی طیاروں کے نشانے پر آنے کی وجہ سے خالی تھی۔ قندوز سے تین میل مشرق میں بنگی نامی گاؤں میں داؤد کے فوجی ٹرکوں سے اترے تو گھات لگائے طالبان سے ان کی جھڑپ ہو گئی۔ بزدل اتحادیوں کی اگلی صف گھبراہٹ میں پیچھے ہٹی تو ان کے ٹرک آپس میں ٹکرا گئے اور اپنے فوجیوں کو کچلتے چلے گئے۔ تین اتحادی فوجی جہنم رسید ہو گئے۔ ہفتے کے وسط تک طالبان نے بنگی خالی کر کے تین میل مغرب میں سلیبر کی پہاڑی پر مورچے بنا لئے۔

O

17 نومبر کو امریکی طیاروں نے دن بھر قندوز کے اردگرد طالبان کی پوزیشنوں پر لگاتار بمباری کی یہ امریکی حملوں کی شدید ترین بمباری تھی۔ قندوز کے دشتِ ارچی کے محاذوں سے پکڑے جانے والے مجاہدین طالقان کی آٹھ کوٹھریوں پر مشتمل جیل خانے میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں وہ اپنی شہادت کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ قندوز، ازبک، تاجک اکثریت کے صوبوں میں گھرا پشتون اکثریت کا صوبہ ہے۔ شمالی اتحاد کے بھیڑیے قندوز کے محصورین کے قتل عام کے لئے تیار تھے۔ طالبان نمائندوں کی جانب سے شہری آبادی کے تحفظ کی یقین دہانی پر اقوام متحدہ کی وساطت سے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کے جواب میں عالمی ادارے نے مجرمانہ لاتعلقی اختیار کی۔ ان مسلمان حکمرانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے جو امریکی خوشنودی کی خاطر قندوز کے مسلمانوں کے متوقع قتل عام پر دم سادھے ہوئے تھی۔

سی این این پر مسلسل دو ماہ سے چلنے والی سرخی Strike Against Terror اب War in Afghanistan میں بدل چکی تھی۔ یہ ایک ایسی غیر متوازن جنگ ہے جس میں جارح فریق کو ہر طرح کی عسکری برتری حاصل ہے مگر ہزاروں بے گناہ افغانیوں کے قتل عام کے باوجود پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ یہ ابھی شروعات ہے۔ یہ عجیب جنگ ہے۔ جس میں پوری دنیا کا میڈیا ایک طرف ہے۔ دنیا بھر کے انسانی حقوق کے ادارے جو پچھلے پانچ سال سے افغانستان میں مردوں کی داڑھیاں رکھوانے اور عورتوں کو برقعہ پہنانے جیسے ظالمانہ اقدامات کے باعث

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

طالبان کے خلاف انسانی حقوق کی پامالی کا شور مچاتے تھے۔ کئی دنوں سے مزار شریف، ہرات، طالقان اور کابل میں پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں والی سینکڑوں لاشیں دیکھ رہے ہیں۔ مگر خاموش ہیں کیونکہ شہید ہونے والے داڑھی والے تھے۔ انسانی حقوق کے ادارے بھی انسان کو دیکھنے کے بعد ان کے حقوق کا نعرہ لگاتے ہیں۔ طالبان اور ان کے حامی ان کی ڈکشنری میں شاید انسان ہی نہیں۔

قندوز میں تیس چالیس ہزار کی آبادی، دس سے بیس ہزار تک پناہ گزین، پشتون، اور چند ہزار طالبان تھے جن کے ہمراہ چند سو عرب، پاکستانی اور چیچن وازبک تھے۔ جو اردگرد کے تمام تاجک اور ازبک علاقوں سے سمٹ کر ایک جگہ پر پناہ گزین تھے۔ طالبان کے مقامی کمانڈر اور طالبان کی ہائی کمان کی جانب سے خود مختاری ملنے کے بعد مسلسل اقوام متحدہ سے تحفظ کی یقین دہانی کے بعد ہتھیار ڈالنے کی بار بار پیشکش کر چکے تھے۔ مگر اقوام متحدہ کے نمائندے نے کہا ہمیں کوئی ایسی پیشکش نہیں ہوئی۔ تقریباً پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کی زندگی خطرے میں تھی مگر پوری دنیا کی قیادت بشمول اسلامی ممالک مجرمانہ خاموشی کا شکار تھی۔ دراصل اقوام متحدہ امریکہ کے ٹاؤٹ کا کردار سر انجام دے رہی تھی۔ ریڈ کراس، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر انسانی حقوق کی تنظیمیں خاموش تھیں۔ لگتا ہے پوری انسانیت مر چکی تھی۔ دنیا میں اس ڈھٹائی سے بے شرمی کی یک طرفہ زیادتی کی مثال ملنا مشکل ہے۔ 19 نومبر کو شمالی اتحاد کی فوجوں نے قندوز پر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ شہر پر امریکی بمباری سے درجنوں شہری شہید ہو گئے۔ اس روز پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا نے تسلیم کیا کہ قندوز میں کسی بھی وقت کوئی المیہ رونما ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا وہاں لوگ ہتھیار ڈالنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام قبول کیا جانا چاہئے لیکن موجودہ حالت میں ایسا بندوبست کرنا مشکل ہے۔ ان کا بیان برطانوی سیاست کی روایتی مکاری اور فریب کاری کی عکاسی کرتا تھا۔

قندوز میں محصور رہتے ہوئے نت نئی خبریں سننے کو ملتیں۔ حاجی ارباب ہاشم کے اطاق آنا جان لگا رہا کیونکہ وہاں پر جمال ناصر سے حالات کا پتہ چلتا رہتا۔ ایک دن جمال ناصر نے بتایا کہ مذاکرات کا سلسلہ جو کہ ٹیلی فون کے ذریعے ہو رہا تھا۔ اب مذاکرات اور نمائندوں کی ملاقات کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ مزید یہ کہ آج مزار سے شمالی اتحاد والوں کا ایک وفد بھی حاجی ارباب ہاشم کے اطاق آیا ہے۔ مذاکرات کے حالات طالبان کے ایک کمانڈر کی زبانی جو آپ کو [illegible]

ہوں جنرل عبدالرشید دوستم نے سیٹلائٹ فون پر مُلا فضل خند سے رابطہ کیا اور کہا کہ اگر طالبان اپنے ہتھیار مجھے دے دیں تو میں انہیں قندھار کے لئے راستہ دینے کا یقین دلاتا ہوں اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا، مزید مذاکرات کے لئے کمانڈر غوث الدین بلخی اور کمانڈر رشمک کو قندوز روانہ کیا۔ انہوں نے یہ بات بھی سامنے رکھی کہ طالبان اپنی گاڑیاں اور چھوٹا اسلحہ بھی ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ مُلا فضل اخند نے کمانڈروں کی شوریٰ بلائی اور دوستم کی پیشکش سامنے رکھی۔ دوستم کی اس پیشکش پر غور کرنا اس لئے بھی اہم سمجھا گیا کہ قندوز میں محصور رہ کر طویل جنگ کا فائدہ نہ تھا، اسلحہ ختم ہو رہا تھا، رسد میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ شوریٰ کے دوران کمانڈروں نے مختلف آراء دیں۔ بعض نے کہا ہم آخری دم تک لڑتے لڑتے شہید ہوں گے اور بعض معاہدے کے حق میں تھے۔ اس لئے آپس میں اختلاف ہونے لگا۔ آخر علماء کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ ہوا کہ علماء کا فیصلہ سب کو منظور ہوگا۔ مواصلاتی ذرائع سے علماء سے استفتاء کیا گیا۔ مولانا عبدالعلی مفتی اعظم، مولوی سندوزئی آغا، مولوی نور محمد ثاقب نے ٹیلی فون کے ذریعے جواب دیا کہ اگر جنگ کی صورت میں کامیابی کا کوئی امکان نہ ہو تو معاہدہ کرنا جائز ہے۔ علماء کا فیصلہ تمام کمانڈروں کو ریکارڈ کر کے سنایا گیا جسے سب نے تسلیم کر لیا۔ جب معاہدے کا فیصلہ ہوا تو طالبان کا مشہور دلاور کمانڈر ملا داد اللہ مجلس سے اٹھا اور سب کو مخاطب کر کے اپنی کلاشنکوف اور روسی ساخت کا میکاروف پستول دکھاتے ہوئے کہا کہ میں کبھی یہ اسلحہ دوستم کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں زندہ ہوتے ہوئے دوستم کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ ملا داد اللہ نے مُلا فضل سے کہا کہ آپ مجھے اللہ کے سپرد کرتے ہوئے رخصت کی اجازت دیں۔ مُلا داد اللہ معاہدے پر عمل درآمد سے پہلے ہی بلخ کے ایک کمانڈر کی گاڑی میں تین ساتھیوں کے ہمراہ خفیہ طور پر روانہ ہو گیا۔ وہ مزار شریف سے گزر کر بلخ کے ایک گاؤں میں جا ٹھہرا۔ مُلا داد اللہ نے چونکہ شمالی اتحاد والوں سے بہت جنگیں لڑی تھیں اور یہ لوگ ان کے سخت جانی دشمن تھے۔ رات کو مشورہ ہوا۔ صبح طالبان کے کمانڈر انچیف مُلا فضل اخند، قاری فیض محمد کو جو قندھار کے جہادی مدرسے کے ناظم تھے ساتھ لے کر مزار شریف روانہ ہو گئے۔ وہاں پر دوستم، استاد عطا اور استاد محقق سے طویل مذاکرات شروع ہو گئے۔ دوستم نے مُلا فضل کو پیش کش کی کہ افغان طالبان قندوز چھوڑ دیں تو وہ انہیں غیر مشروط طور پر ہرات تک جانے کی راہداری فراہم کرے گا جہاں سے با آسانی طالبان قندھار پہنچ سکتے ہیں۔

[illegible] فضل نے اچانک ہی سوال کر ڈالا ''ہم انہیں امریکیوں کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

حوالے کردیں گے" دوستم نے جواب دیا۔

لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، مُلا فضل نے بہت زور لگایا کہ دوستم غیر ملکی طالبان کو جانے دے۔ دوستم نہ مانا جس سے طالبان کے کمانڈر غیر ملکی مجاہدین کے متعلق سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھی۔ اور ان کو بحفاظت نکالنے کی تدبیریں بنانے لگے، مذاکرات کی خبریں گرم تھیں پوری دنیا کے میڈیا کی نظر اس وقت قندوز میں محصور طالبان مجاہدین پر تھی۔ مُلا فضل وغیرہ مذاکرات سے واپس آئے اور بتایا کہ دوستم سے معاہدہ طے ہوگیا ہے۔ ہم قندوز سے باہر دشت ریگنک کے مقام پر بھاری اسلحہ دوستم کے حوالہ کریں گے۔ اس نے قندھار جانے تک ٹرک فراہم کرنے کا بھی کہا۔ اس وقت طالبان کے پاس سینکڑوں گاڑیاں تھیں۔ معاہدے کی رو سے طالبان کو پچاس گاڑیاں ساتھ لے جانی تھیں۔

مُلا فضل اور طالبان کمانڈروں نے غیر ملکی مجاہدین کو بچانے کے لئے کئی مجاہدین کو بھیس بدلنے کا کہا۔ پورے قندوز سے کپڑوں کی دکانوں پر سفید اور کالے رنگ کی پگڑیاں خریدی گئی اور غیر ملکی مجاہدین کو پہن کر طالبان میں گھل مل جانے کا کہا اور پشتو بولنے والوں کو حکم ہوا کہ وہ افغانستان کے جنوبی صوبوں کے ضلعوں اور گاؤں کے نام یاد کرلیں۔ پوچھنے پر مذکورہ پتہ بتائے۔ آخری دنوں میں ہر مجاہد کے سر پر سفید اور کالی پگڑی نظر آتی۔

ہلکے اسلحے کے ساتھ ٹرکوں اور گاڑیوں میں غیر ملکی مجاہدین کو لے کر قندوز سے چار درہ پہنچا۔ ہم نے نہایت ہوشیاری سے سفر کرنا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی رات کے وقت سپہ سالار مُلا فضل اخند نے ہمیں دعاؤں کے ساتھ ریگنک پُل تک رخصت کیا۔ ہم نے مُلا فضل سے الوداعی ملاقات کی اور دشت ابدان میں سفر شروع کردیا۔ راستے میں بلخ کے اس کمانڈر شمک سے ملاقات ہوئی جو مُلا داد اللہ کو محفوظ مقام پر چھوڑ کر واپس قندوز آرہا تھا۔ اس نے ہماری رہنمائی کے لئے اپنے معاون کماندان کریم آغا کو ہمراہ کردیا۔ رات کے پچھلے پہر تاشقرغان پہنچے۔ دوستم کے پہریداروں نے ہمیں پھاٹک پر روکا کماندان کریم آغا نیچے اترا اور ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھاٹک کھول دیا گیا ہم روانہ ہوگئے۔ ہماری منزل بلخ تھی۔ ہم نے مزار شریف سے گزرنے کی بجائے حیرتان کی دوراہی سے پھر کر مزار شریف سے باہر ہوکر کچے راستے کے ذریعے رات کے وقت گزرنا تھا لیکن شمک کا کمانڈر ہمیں حیرتان دوراہی سے سیدھا مزار شریف لے گیا۔ اس پر مجھے شک گزرا۔ مزار شریف کے ہوائی اڈے کے قریب آنے والے پھاٹک سے ذرا پہلے ہمارا قافلہ [illegible]

Uploaded By Muhammad Nadeem

کریم آغا یہ کہہ کر پھاٹک کی طرف روانہ ہوگیا کہ میں آگے دیکھ کر آتا ہوں کیا صورت حال ہے؟

فجر کا وقت ہوگیا ہم نے تیمم کیا اور نماز میں مشغول ہوگئے۔ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی روزہ رکھ لیا تھا۔ کمانڈر کریم آغا نے واپس آکر اطلاع دی کہ دوستم کو ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کمانڈر کریم آغا نے غداری کی۔ مجھے یقین تھا کہ اسنے ہماری آمد کی اطلاع دوستم کو کسی طرح پہلے کردی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلی تو ہمیں سڑک کے دونوں طرف صحراء میں کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ جب روشنی ذرا زیادہ ہوئی تو ہمیں پتہ چلا کہ ہم مکمل محاصرے میں آچکے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف دور دور صحرا میں مسلح سپاہی اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ مزار شریف کی طرف سے ٹینک بھی آنا شروع ہوگئے۔ فضا میں طیارے اور ہیلی کاپٹر نمودار ہوکر نیچی پرواز کرنے لگے۔ بڑے بڑے امریکی طیارے فضا میں گشت کرکے ہمیں خوف زدہ کرنے لگے۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ ہم کچھ نہ سمجھ پائے یقیناً انہوں نے پہلے سے منصوبہ بنالیا تھا۔ اب ہم وہاں سے نکل کر کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ہم نے غیر ملکی مجاہدین کے انخلا کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہوتا ہوا نظر آیا۔

ہم نے مُلا فضل اخند، مُلا عبدالقیوم اور امیر المومنین مُلا محمد عمر مجاہد سے وائرلیس پر رابطہ کرکے صورت حال سے آگاہ کیا۔ مُلا عبدالقیوم نے مشورہ دیا لڑیں ہتھیار نہ پھینکیں۔ مُلا فضل اور امیر المومنین نے کہا کہ جنگ کا فائدہ نہیں کیونکہ قندوز میں موجود طالبان کا نقصان ہوگا۔ اسلحہ رکھ دیں جنگ نہ کریں۔ مُلا فضل نے کہا کہ میں نے بات کرلی ہے تم اسلحہ دے دو کمانڈر آمر جان تمہیں بلخ لے جائے گا۔ دوستم کی طرف سے پانچ رکنی وفد ہم سے ملاقات کے لئے آیا۔ اس وفد میں کمانڈر نادر علی ہزارہ، کمانڈر اسد ہزارہ، کمانڈر ہمایوں فوجی، کمانڈر آمر جان اور ایک نمائندہ کمانڈر استاد عطاء کا تھا۔ مذاکرات کی تین نشستیں ہوئیں جو چار گھنٹے جاری رہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ تم ادھر کیوں آئے ہو؟ ابھی معاہدے پر عمل کا وقت باقی تھا تم بغیر اطلاع کے آگئے؟

ہم نے اپنی آمد کا جواز بیان کرتے ہوئے انہیں جواب دیا کہ علی آباد کا دفاعی خط ٹوٹ گیا تھا اور قندوز میں امریکی طیاروں کی سخت بمباری تھی وہاں ٹھہرنا مشکل تھا۔ اس لئے ہم ادھر چلے آئے۔ وہ ہمارے ہتھیار جمع کرنے لگے عربوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہتھیار ساتھ لے کر جائیں گے یا آخر دم تک لڑتے ہوئے شہادت کو ترجیح دیں گے۔ میں مُلا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

فضل اخند سے رابطہ کیا، انہوں نے وائرلیس پر کمانڈر آمرجان سے جو بلخ کا پختون قبائلی تھا بات چیت کی، کمانڈر آمرجان نے ہتھیار ڈالنے کی صورت میں مجاہدین کو دوستم کے حوالے کرنے کی بجائے اپنے ہمراہ بلخ لے جانے کا وعدہ کیا۔ ملا فضل نے حکم دیا تم اپنے ہتھیار کمانڈر آمرجان کے حوالے کر دو۔ وہ تمہیں بلخ پہنچا دے گا۔ سخت سردی تھی۔ ہم سب لوگ کھائے پیئے بغیر روزہ سے تھے۔ دوستم کے لوگ سگریٹ پی رہے تھے۔ پورا دن وضو کے لئے پانی نہ ملا ہم نے ظہر کی نماز تیمم سے پڑھی۔ ہم سے چھوٹی گاڑیاں لے لی گئیں۔ پھر کمانڈروں کے مطالبے پر مجاہدین نے تمام اسلحہ ایک جگہ ڈھیر کرنا شروع کر دیا، اسلحہ رکھنے کے بعد دوستم آیا۔ اس نے دور سے اسلحہ کا ڈھیر دیکھا اور مجاہدین کو ٹرکوں میں سوار ہونے کا حکم دیا۔ مجاہدین کی تلاشی لینے اور ہاتھ باندھے بغیر ٹرکوں میں سوار کر دیا گیا۔ شہر کی پہلی چیک پوسٹ کے پاس دوستم کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ امریکی اور کچھ صحافی تھے۔ پھاٹک سے شہر اور شہر سے قلعہ جنگی تک سڑک کے دونوں جانب مسلح افراد کھڑے کئے گئے تھے اور تماشائیوں کی بڑی تعداد بھی موجود تھی جو قیدیوں کی گزرنے والی گاڑی کو پتھر مارتے، ان پر تھوکتے اور گالیاں دیتے۔ بعض اوباش نوجوان اپنی تازہ مونڈھی ہوئی داڑھیوں پر ہاتھ پھیر کر تمسخر اڑاتے کہ او طالب! دیکھو ہم نے داڑھی مونڈ ڈالی ہے۔ چیک پوسٹ عبور کرتے ہی سڑک کے دونوں جانب مسلح نفری اور گاڑیوں کا رُخ بلخ کی بجائے کسی اور طرف دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارے ساتھ دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ معاہدے کے مطابق ہمیں جانے نہیں دیا جا رہا لوگوں کا رویہ اور دوستم کی بدعہدی دیکھ کر میں نے ٹرک میں جاتے ہوئے دل سے دعا کی! "یا اللہ تو جانتا ہے کہ میں خالص تیری رضا کے لئے تیرے راستے میں تیرے دین کی سربلندی کے لئے نکلا ہوں۔ میں اپنے گھر سے کسی مکان، دوکان یا دنیاوی تجارت کے لئے نہیں نکلا تو مجھے شہادت نصیب کر یا رہائی دلا دے میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں"۔ ہر ساتھی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور قنوت طاری تھی۔ شام کا وقت تھا کہ ہمارے قافلے کو قلعہ جنگی پہنچا دیا گیا۔ حالانکہ ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہمیں بلخ پہنچانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ہماری گاڑیاں قلعہ جنگی میں گھوڑوں والی جگہ پر جا رکیں۔

کسی قیدی کو بلا اجازت اترنے کی اجازت نہ تھی۔ میں نیچے اترا تو کمانڈروں نے مجھے ساتھ کھڑا کر لیا۔ مجاہدین کو ایک طرف بٹھا دیا جاتا۔ ان کی جیبوں سے نکلنے والی رقم اور سامان چادر بچھا کر اس میں ڈالا جانے لگا۔ قیدیوں کے بوٹ، سسپنڈری واسکٹ، ٹوپی، پگڑی اور رومال وغیرہ سب اتارے جا رہے تھے۔ سامان کا ڈھیر لگ گیا۔ اس موقع پر ایک امریکی صحافی مرد اور ایک

عورت موجود تھے جو فلم بندی کر رہے تھے۔ نماز مغرب کا وقت تنگ ہونے لگا تو میں نے کمانڈر آمرجان اور نادر علی وغیرہ سے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی، انہوں نے نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ اتنے میں عرب قیدیوں کی گاڑی کی باری آئی، دو عربوں کی تلاشی لی گئی جبکہ تیسرا اتر کر کچھ فاصلے پر تھوڑی دیر رُکا اور پھر ہاتھ میں گرنیڈ پکڑے آگے بڑھا جو اس عرب نے جیب میں چھپا رکھا تھا۔ میرے قریب تقریباً چار میٹر کے دائرے میں تلاشی لینے والوں کے ساتھ کمانڈر نادر علی سربراہ پولیس مزار شریف اور حزب وحدت کا کمانڈر اسد ہزارہ کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ عرب مجاہد نے پن نکلا ہوا ہینڈ گرنیڈ ہتھیلی پر رکھا اور بازو آگے بڑھا دیئے، زوردار دھماکہ ہوا۔ میں زمین پر لیٹ گیا، مجھے کسی قسم کی چوٹ نہ آئی، قریب کھڑے پولیس سربراہ نادر علی اور کمانڈر اسد ہزارہ دھماکے سے پانچ میٹر دور جا گرے۔ ان کے چیتھڑے اڑ گئے اور وہ موقع پر ہلاک ہو گئے، تلاشی لینے والا بھی ہلاک اور بیمار عرب مجاہد بھی شہید ہو گیا۔

یکدم بھگدڑ مچ گئی، حزب وحدت کے دونوں کمانڈر مارے گئے تھے۔ ہزارہ قوم کے بندوق برداروں نے طالبان کمانڈر پکڑ لیا کہ ہمارے کمانڈروں کو تو نے ہلاک کیا۔ کیونکہ تو ان کے پاس کھڑا تھا وہ تو ہلاک ہو گئے اور تو صحیح سلامت ہے۔ کمانڈر نے انہیں بتایا کہ حملہ آور یہ زمین پر پڑا ہوا عرب تھا۔ وہ بندوقوں کا بٹ مار کر اپنا غصہ نکالتے۔ اس دوران ہمارے کمانڈر کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے آپ کو طالبان قیدیوں میں شامل کر لیں اور ان کے اندر گھل مل جائیں کیونکہ بحیثیت کمانڈر شناخت کرنے والے دونوں کمانڈر نادر علی اور اسد ہزارہ ہلاک ہو چکے تھے۔ ان کے بعد انہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ ہزارگان کے جنگجو سیخ پا ہو کر اپنے کمانڈروں کی لاشوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ طالبان کمانڈر آہستہ آہستہ چل کر قیدیوں کے مجمع کی طرف بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ قیدیوں کے مجمع میں پہنچ گیا۔ اپنے ساتھیوں میں شامل ہونے کے بعد بتایا کہ اب میں کمانڈر نہیں اور مجھے عبدالغفار کے نام سے پکارنا۔ ہم نے اس ہلڑ بازی کے دوران نماز مغرب فرداً فرداً تیمم سے پڑھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ہزارگان کے مسلح جنگجو بپھرے ہوئے آئے اور ہم پر بندوقیں تان کر فائر کھولنے لگے تھے کہ دوستم کے ازبک سپاہی آڑے آ گئے، انہوں نے ہمیں بچا لیا۔ ازبک سپاہیوں نے ہزارہ جنگجوؤں کو سختی سے دور دھکیل دیا، ازبک سپاہیوں نے درمیان میں آ کر ہزارہ گان کے جنگجوؤں پر گنیں تان لیں، ان کے آپس میں ٹکراؤ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نیا باب

اندھیرا پھیلنے لگا قلعہ میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ حزب وحدت کے کمانڈروں کی ہلاکت کا سن کر جوق در جوق مسلح نفری قلعہ میں داخل ہونا شروع ہو گئی۔ مسلح جنگجو انتقام میں آگ بگولا ہو کر قیدیوں کی طرف لپکتے، قیدی فصیل کے ساتھ گھاس پر سہمے بیٹھے غیر یقینی صورت حال کا سامنا کر رہے تھے۔ بڑے کمانڈروں کی مداخلت پر وقتی طور پر خون خرابا رُک گیا اور ایک مرتبہ پھر قیدیوں کی تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے۔ تلاشی کے بعد 600 قیدیوں کو ایک تنگ و تاریک تہہ خانہ میں بند کر دیا گیا، اس چھوٹے سے تہہ خانہ میں جگہ کم تھی۔ سب نے بیٹھ کر رات گزاری، ٹانگیں لمبی کر کے نہ سو سکتے تھے۔ روٹی، پانی نہ تھا۔ سب کے منہ خشک اور نقاہت بڑھ گئی۔ ہم بھوک کے پیاسے تھے اور روزہ بھی سب نے بغیر کھائے پیئے رکھا تھا۔ سب نے عشاء کی نماز اپنی اپنی جگہ تیمم کر کے اشاروں سے پڑھی۔ سجدہ تک کی جگہ نہ تھی۔ عرب مجاہد مجھ سے شکوہ کرنے لگے کہ ہم نے آپ کے کہنے پر اسلحہ ان کے حوالے کیا اور انہوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں قید کر کے قلعہ میں بند کر دیا۔ میں عرب مجاہدوں کو جوابی تسلی دیتے ہوئے کہتا کہ اس وقت میں بے اختیار ہوں کچھ نہیں کر سکتا، میں بھی آپ کے ساتھ قید ہوں۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ تہہ خانہ زوردار دھماکے سے گونج اٹھا اور بارود کی دھوئیں اور بو سے بھر گیا۔ شمالی اتحاد کے خونخوار جنگجوؤں نے چند گرنیڈ روشن دانوں کے ذریعے اندر پھینکے تھے جس کے نتیجے میں سات طالبان موقع پر شہید ہو گئے اور زخمیوں کی ایک بڑی تعداد رات گئے تک زخموں کی وجہ سے کراہتی رہی، اندھیرے میں پتہ نہ چلتا کہ کون کتنا زخمی ہوا۔ رات بیٹھے بیٹھے بے چینی میں گزر گئی۔ ذکر و تلاوت کرتے کرتے فجر ہو گئی۔ نماز فجر بیٹھے بیٹھے تیمم سے پڑھی۔ 25 نومبر کی صبح ہوتے ہی ایک ایک قیدی کو باری باری تہہ خانے سے باہر نکال کر تلاشی لے کر اور ہاتھ پیچھے باندھ کر بے تحاشہ زدوکوب کرتے ہوئے نامعلوم مقام کی طرف لے جانے لگے۔ قیدیوں

کو خدشہ تھا کہ قتل کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ دن کے گیارہ بجے تہہ خانے میں 50 قیدی رہ گئے۔ اچانک باہر سے تکبیر بلند ہونے کی آواز کے ساتھ زوردار دھماکہ ہوا اور ساتھ ہی گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ جنگ اس وقت شروع ہوئی جب حزب وحدت سے تعلق رکھنے والے ایک ہزارہ نسل کے جنگجو نے عرب مجاہد کی تلاشی کے دوران اس کی جیب سے قرآن پاک کی حمائل نکالی اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرب مجاہد نے جواب میں کہا کہ یہ قرآن مجید ہے۔ بدبخت ہزارہ جنگجو نے حقارت سے مغلظات بکتے ہوئے اسے دور پھینک دیا، عرب مجاہد قرآن پاک کی توہین برداشت نہ کر سکا، اس نے پیچھے کھڑے عرب مجاہد کو اشارہ کیا جو پہلے سے ہینڈ گرنیڈ چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے نعرہ لگا کر گرنیڈ کی پن نکالی اور ہزارہ جنگجوؤں کی طرف اچھال دیا، کئی ایک دھماکے سے اڑ گئے۔ باقی ماندہ جنگجو بدحواسی کے عالم میں اپنی گنیں وہیں چھوڑ کر خوف زدہ ہو کر الٹے پاؤں بھاگے چھتوں اور برجوں پر پہلے سے متعین بندوق برداروں نے چاروں طرف سے طالبان پر فائر کھول دیا۔ عرب مجاہدین نے بھی ان کی بندوقیں چھین لیں اور گرا ہوا اسلحہ اٹھا کر مردانہ وار مقابلہ شروع کر دیا۔

فائرنگ شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور اتنی تیز فائرنگ شروع ہو گئی کہ ہم سر اٹھا کر بلند دیکھ سکتے تھے۔ قلعہ کی چاروں دیواروں اور برجوں پر کھڑے شمالی جنگجو پیٹھ پیچھے ہاتھ بندھے قیدیوں پر بارش کی طرح گولیاں برسانے لگے، حتیٰ کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ہم نے نماز پڑھی سورۃ یٰسین کا ورد کیا اور اللہ سے مدد مانگنے کے ساتھ سب ساتھیوں نے ایک دوسرے کو گلے مل کر کہا سنا معاف کیا اور آخری ملاقات کے طور پر ملنے لگے۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ باہر نکالے جانے والے تمام قیدیوں کو شہید کر دیا گیا ہے اور اب ہمیں بھی ضرور شہید کر دیا جائے گا۔ اچانک تہہ خانے کا بند دروازہ کھلا اور ایک عرب مجاہد اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کیا ہوا؟

اس نے جواب میں کہا ''**الحمد اللہ** کامیابی شکراً'' میں عرب مجاہد کی بات سن کر اٹھا اور اس کے ساتھ باہر نکلا۔ باقی ساتھیوں کو انتظار کے لئے کہہ دیا۔ میں جب تہہ خانے سے باہر نکلا تو قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ قلعہ کے وسط میں دور دور تک شہداء کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ شہیدوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ''عرب مجاہد شاید شہادت کو کامیابی کہہ رہا تھا۔''

شہیدوں کے درمیان پڑے ہوئے بڑی تعداد میں زخموں سے چور چور زخمی قیدی کراہ رہے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھے جبکہ 20 زندہ سلامت طالبان سامنے دیوار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور کچھ طالبان نے گڑھوں میں آڑ لے رکھی تھی۔ ان کے پاس گنیں تھیں اور مقابلہ کر رہے تھے۔ چاروں طرف برجوں سے فائرنگ بغیر کسی وقفے کے جاری تھی۔ شمالی اتحاد نہتے قیدیوں کا ردِعمل برداشت نہ کر سکا تو اس نے ان پر قابو پانے کے لئے امریکی طیاروں کی مدد طلب کر لی۔ ظہر کی نماز کے بعد فضا میں طیارے نمودار ہو کر قلعہ کے جنوبی حصے پر بم برسانے لگے۔ دوستم کے ٹینک قلعہ کے شمالی حصہ سے آگے بڑھ کر گولہ باری کرنے لگے۔ باہر سے قلعہ کے اندر مارٹر توپوں سے گولے پھینکے جا رہے تھے۔ ٹینک توپیں اور طیارے اکٹھے آگ برسانے میں مشغول تھے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں چھا گیا، سخت غبار اڑنے لگا، اس گرد و غبار کی وجہ سے ہماری نقل و حرکت آسان ہو گئی۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مقابلہ کرنے والے مجاہدین ادھر اُدھر جا رہے تھے اور دشمن کی گولیوں سے محفوظ تھے۔

اتنے میں ایک زخمی عرب مجاہد میرے پاس آیا جس کا کٹا ہوا ہاتھ لٹک رہا تھا۔ صرف جلد کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میرا ہاتھ کاٹو۔ شاید اس کے ذہن میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کرنے کا خیال آیا تھا۔ میں نے اس کے لٹکے ہوئے ہاتھ کو اس کے بازو کے ساتھ باندھ دیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ زیادہ تکلیف تو نہیں تو وہ جواب میں "الحمد للہ شکراً" جوزیم جوزیم (میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں) کہتا ہوا پھر لڑنے کے لئے خندقوں کی طرف چلا گیا۔

جنگ شروع ہونے سے قبل تہہ خانے سے نکال کر باہر لائے جانے والے طالبان اور عرب مجاہدین کو قطار میں بٹھا کر امریکی سی آئی اے کے دو افسران تفتیش کر رہے تھے۔ سی آئی اے کے ایجنٹ تصاویر کھینچتے اور ویڈیو فلمیں بھی بنا رہے تھے۔ ان دونوں افسران نے اپنی ٹانگ کے ساتھ پستول باندھے ہوئے تھے۔ ایک نے افغانوں جیسا حلیہ بنا رکھا تھا اور داڑھی رکھی ہوئی تھی جبکہ دوسرے کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ وہ خاص کر صبح کے عرب مجاہدین سے خصوصی تفتیش کر رہے تھے جو کیمرے اٹھائے ہوئے صحافیوں کا روپ دھارے ہوئے تھے جب تہہ خانی کے قریب سے دھماکے اور فائرنگ کی آواز آئی تو مونچھوں والے سی آئی اے کے ایجنٹ نے اپنا پستول نکال کر سیدھا طالبان پر فائر شروع کر دیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے قدموں کے قریب تفتیش کے لئے اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے عرب مجاہد نے جھپٹ مار کر اس کا پستول والا ہاتھ قابو کر لیا اور دوسرے

مجاہدین نے آگے بڑھ کر اسے دبوچا اور دیکھتے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوسرا ایجنٹ اپنے پستول سے فائر کرتے ہوئے جان بچانے کی خاطر الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔

امریکی طیاروں نے قلعہ میں محصور قیدیوں پر 2000 پونڈ وزنی بم گرانے شروع کر دیئے۔ آگ لگنے کے بعد عمارتیں گرنے لگیں۔ میدان میں گڑھے بن گئے۔ بموں کے دھماکوں کی لہر سے مجاہدین 20 میٹر دور جا گرتے اور جسموں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑتے۔ زوردار دھماکوں سے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔ امریکہ نے حاص قسم کے کیمیاوی بم بھی استعمال کئے۔ طیاروں کی بمباری اور دوستم کی ٹینکوں کی گولہ باری سے ان کے اپنے سینکڑوں گھوڑے ہلاک و زخمی ہو گئے جو قلعہ کے اندر اصطبل میں بندھے ہوئے تھے۔

اسی اثناء میں عرب مجاہدین جو مقابلے کے کسی ہتھیار کی تلاش میں بے تاب تھے میرے پاس آئے اور پوچھا کہ قلعہ کا اسلحہ خانہ کہاں ہے۔ میں نے چونکہ گاڑی میں سوار قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ ایک ورکشاپ کے دروازے پر بورڈ پڑھ لیا تھا۔ "ورکشاپ ہوا ان ڈپو" یعنی مارٹن گنوں کا ڈپو اور ورکشاپ۔ اسی لئے گولیوں کی بوچھاڑ میں بھاگتے ہوئے میں عرب مجاہدین کو لے کر سیدھا اسلحہ گودام پہنچا۔ دروازہ توڑ کے اندر داخل ہوئے تو وہاں سے ایک عدد مارٹن گن بھی حالت میں مل گئی جبکہ دو عدد بڑی مشین گنیں، ایک کلاشنکوف، ایک اینٹی ایئر کرافٹ گن اور آر پی جی کے راکٹ بھی مل گئے۔ ہماری فوری ضرورت پوری ہو چکی تھی۔ اب ہم محصور ہو کر بھی اپنے دل کا ارمان نکال سکتے تھے۔ عرب چونکہ بہت جفاکش اور اسلحہ کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ایک عرب کو ٹینک شکن راکٹ اور دوسرے کو اینٹی ایئر کرافٹ دے کر قلعہ کے دروازے کے قریب بٹھا دیا۔ جہاں سے ٹینکوں کے آنے کا امکان تھا۔ باقی اسلحہ مجاہدین میں تقسیم کر کے انہیں مختلف پوزیشنوں پر بٹھا دیا گیا۔ اب عملاً قلعہ پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ دشمن کی بھاری نفری قلعہ کے باہر جمع ہو گئی۔ انہوں نے قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں بھی لائی گئیں جن میں امریکی اور برطانوی بکتر بند گاڑیاں شامل تھیں۔ دشمن کی جانب سے پھینکے جانے والے ٹینکوں کے گولوں کے جواب میں ہم قلعہ کے اسلحہ خانہ میں پڑے پرانے لوگو اور راکٹوں کو آگ جلا کر چلا دیتے۔ وہ قلعہ سے باہر جا کر دھماکے سے پھٹ جاتے۔ اس شدید ترین جنگ کے دوران ایک عرب مجاہد قلعہ میں گھومتا پھرتا بلند آواز سے پُرجوش آواز میں کہتا جاتا تھا۔ "واللہ رائحۃ المسک، واللہ رائحۃ المسک" (اللہ کی قسم مشک کی خوشبو آ رہی ہے) مجاہدین مختلف

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

گروپوں میں تقسیم ہو کر لڑ رہے تھے۔ شام تک یونہی جنگ جاری رہی۔ جب گولہ باری میں کچھ کمی واقع ہوئی تو ہم نے پانی سے روزہ افطار کیا اور نماز مغرب پڑھی۔ میرے گروپ کے ساتھی پوچھنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ ہمارے پاس کافی اسلحہ و خوراک نہیں ہے، کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں چونکہ مزار شریف کے سارے علاقے سے واقف تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ قلعہ کے جنوب مغربی سمت میں واقع برج پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس برج کی قریبی آبادی پشتونوں کی ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکلنا آسان ہوگا۔ ہم نے یک بارگی جنوب مغربی برج پر حملہ کر دیا جہاں دوستم کے سپاہی مورچہ زن تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر مزاحمت کی پھر برج سے پسپا ہو کر بھاگ گئے۔ ہم نے برج پر قبضہ کر لیا۔ اب قلعہ کے باہر سے بھی اس برج پر گولیاں برسائی جانے لگی۔ قبل اس کے کہ برج پر ٹینک کے گولے آ لگیں ہم نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قلعہ سے اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ برج سے پگڑیاں لٹکا کر ایک ساتھی کو نیچے دیوار سے باہر اتارا جانے لگا۔ دو دو تین تین ساتھی آہستہ آہستہ بچتے بچاتے بستی میں داخل ہو گئے۔ دشمن کے آدمی دائیں بائیں کی گلیوں میں موجود تھے لیکن ان کی پوری توجہ قلعہ کی طرف تھی اور وہ ادھر ہی گولیاں چلا رہے تھے۔ تقریباً 30 عرب، پاکستانی اور افغانی مجاہد قلعہ سے باہر کودنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے باقی عرب مجاہدین کو بھی نکل جانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے:

''اما الفتح واما الشہادۃ'' (فتح شہادت) کہتے ہوئے جانے سے انکار کر دیا۔ جب وہ کسی صورت جانے پر راضی نہ ہوئے تو آخر میں میں بھی قلعہ سے اتر کر آہستہ آہستہ آبادی کی طرف بڑھا۔ قلعہ کے باہر مزید فوج جمع ہو رہی تھی۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزار شریف سے باہر نکل کر ہم تین جماعتوں میں بٹ گئے۔ دو جماعتیں چار برجک کی طرف روانہ ہوئیں اور ایک جماعت بلخ کی طرف۔ ہم ساری رات پیدل چلتے ہوئے سحر کے وقت بلخ کے ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ جب ہم نے ان گاؤں والوں کو بتایا کہ ہم جنگی قلعہ سے آئے ہیں تو وہ ہماری حالت دیکھ کر رونے لگے۔ انہوں نے آگ جلائی گرم پانی لائے ہمارے منہ ہاتھ دھلوائے۔ کئی پہر کھانا نہ کھانے کی وجہ سے نقاہت بھی بہت تھی۔ گاؤں والوں نے ہمیں روٹی دی ہم نے روزہ رکھا۔ اذان کے بعد نماز فجر پڑھ کر پھر روانہ ہو گئے اور کمانڈر ...... کے گاؤں کا پتہ پوچھتے پوچھتے اس کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ وہاں طالبان کے کمانڈر انچیف مُلا داد اللہ، گورنر سمنگان، مُلا عبدالمنان حنفی اور ملا عبدالعلی پہلے سے موجود تھے۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ہم تین دن تک ان کے ڈیرے پر

رہے۔ تیسرے دن ہمیں اطلاع ملی کہ دوستم نے امریکی فوج کی مدد سے قلعہ جنگی پر قبضہ کر لیا ہے۔ سینکڑوں مجاہدین کو شہید کر دیا گیا، اور کچھ کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ امریکیوں نے تہہ خانے میں پانی اور پٹرول چھوڑ کر آگ لگا دی، تہہ خانے میں آگ اور دھواں بھر گیا، پانی اور دھوئیں کی وجہ سے زخمی مجاہدین شہید ہو گئے۔ جو بچ گئے وہ ساری رات ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہے۔ ان کے پاؤں سُن ہو گئے وہ حرکت تک نہ کر سکتے تھے۔ صبح کے وقت ریڈ کراس کے اہلکاروں نے انہیں باہر نکالا پھر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ زخمیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوا۔ ان کے سروں کو بھاری پتھروں سے کچل دیا گیا۔ ان کے پیٹوں کو چیرا گیا۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ دوستم مجاہدین پر قابو پانے کے لئے تیسرے روز مُلا فضل اخند کو قلعہ جنگی میں اپنے ساتھ لایا تھا تاکہ وہ مجاہدین کو ہتھیار ڈالنے کا کہیں اور جو زندہ چھپے ہوئے ہیں وہ حملہ نہ کریں دوستم مُلا فضل اخند کو یہ دکھانے کے لئے لایا کہ وہ یہ دیکھ لے کہ طالبان نے بغاوت کی ہے حالانکہ ہم جانتے تھے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔

○

خوفناک شکری کتے، مرے ہوئے کچھ لوگوں کے پیٹ چاک کر رہے ہیں اور خصائلے ہوئے بے لگام گھوڑے ادھر اُدھر بھاگتے دوڑتے، لاشوں کو روندتے چلے جاتے ہیں اور کچھ ہی فاصلے پر شمالی اتحاد کا ایک دیوہیکل ٹینک، قتل ہونے والوں کے جسموں کو غضب ناک انداز سے کچلتے ہوئے قلعہ کے مرکزی حصے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جہاں بے شمار مقتولوں کی لاشیں اس حال میں بکھری پڑی ہیں کہ ان میں سے اکثر کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ اس دوران اچانک ایک شخص زخمی حالت میں کراہتے ہوئے سر اٹھاتا ہے کہ شاید کوئی اس کی مدد کو آ پہنچے۔ مگر یہ کیا؟ اچانک ایک وحشی فوجی آگے بڑھتا ہے اور پوری درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اس زخمی کے سر پر ایک وزنی پتھر مار دیتا ہے جس کے ساتھ ہی ایک دردناک چیخ بلند ہوتی ہے اور زخمی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے زخموں کی تکلیف سے آزاد ہو جاتا ہے مگر مرنے والوں کو بھی یہاں کوئی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ ایک سفاک شخص مر جانے والے ایک آدمی کے منہ سے سونے کا بنا ہوا مصنوعی دانت نوچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ادھر گلابی رنگ کی عمارت کے پاس انگوروں کی گھنی بیلوں کے سائے میں امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کی لاش رکھی ہے جس کے اوپر ایک عرب مجاہد کی لاش پڑی ہوئی ہے اور ان دونوں [illegible] اس طرح رکھا ہوا ہے کہ اگر ان دونوں لاشوں کو جدا کرنے یا ان

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں سے کسی ایک کو اٹھانے کی کوشش کی گئی تو یہ پھٹ جائے گا۔ انگوروں کی بیلوں کے قریب ہی آگ سے جلی ہوئی لکڑی کی ایک سیڑھی ہے جو ایک تاریک تہہ خانے میں اتر رہی ہے۔ تہہ خانے کی کچی زمین گندے پانی کے جمع ہو جانے کی وجہ سے کیچڑ میں بدل چکی ہے اور اس کیچڑ میں مقتولوں کی لاشیں اور زخمیوں کے جسم بکھرے پڑے ہیں۔

ایک مسلح افغان جنگجو تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور اپنے پاؤں میں پہنے ٹوٹے پرانے چپلوں کو پھینک کر ایک مقتول کے مضبوط بوٹ اتار کر انہیں گندے پانی میں دھوتا ہے اور پھر انہیں پہن کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہے۔ یہاں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہیں جن میں سے کئی ایک چہرے گھوڑوں کے قدموں تلے آ کر مسخ ہو چکے ہیں۔ کئی کے پیٹ شکاری کتوں نے پھاڑ ڈالے ہیں اور ان کی اندر کی آنتیں باہر نکل آئی ہیں۔

O

جی ہاں! یہ افغانستان کے شمال میں واقع مزار شریف کے قریب قلعہ جنگی ہے جو آج سے ایک سو سولہ سال قبل 1885ء میں یہاں کے ایک سردار نے اپنے رہنے کے لئے بنایا تھا۔ اس کی زمین تقریباً 20 میٹر تک بلند ہے۔ اس قلعہ کے ارد گرد کئی برج ہیں جو حفاظتی اقدامات کے پیش نظر مزید بلندی پہ بنائے گئے ہیں۔ سوویت یونین کے افغانستان پر تسلط اور اس کے بعد افغان گروپوں کی مسلح جھڑپوں میں اس قلعہ کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی تھی۔ 1998ء تک جب مزار شریف پر جنرل دوستم کا قبضہ تھا، جنرل دوستم اس قلعے کو جنگ میں استعمال کرتا تھا۔ امریکی حملے کے دوران مزار شریف کی پسپائی کے بعد جنرل دوستم نے اس شہر کا کنٹرول سنبھال لیا۔ جنرل دوستم نے مزار شریف کو اپنی کارروائیوں کا مرکز بنا کر قلعہ جنگی کا اس بار بالکل نئے مقاصد کے ساتھ استعمال شروع کر دیا۔ جنرل دوستم نے اس قلعے کی نگرانی اپنے نائب جنرل مجید روزی کے سپرد کر دی تھی۔ دوستم نے سب سے پہلی بدعہدی میں مزار شریف میں سلطان رضیہ سکول میں محصور طالبان سے کی اور دوسری بدعہدی قندوز سے سب سے پہلے انخلاء کرنے والے محصورین کے قافلے سے کی جن میں اکثر غیر ملکی تھے۔ ان کو ہرات کی راہداری دینے کی بجائے قلعہ جنگی میں لا کر قید کر دیا۔ شروع میں دوستم کا خیال تھا کہ انہیں مزار ایئرپورٹ کے قریب بنی ہوئی بیرکوں میں بند کیا جائے لیکن امریکیوں نے اس مشورے کو رد کر دیا کیونکہ ایئرپورٹ امریکیوں کے قبضے میں تھا اور وہ اپنے قریب ان مجاہدین کو رکھ کر کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ قلعہ جنگی کی تعمیر اس طرز

پر ہے کہ اس میں اندر رہنے والے باہر سے حملہ آور ہونے والوں کا بھرپور جواب دے سکتے ہیں۔

بروز ہفتہ 24 نومبر کو طالبان قیدیوں اور شمالی اتحاد کے درندوں سے تصادم کی تفصیل پیچھے لکھ چکے ہیں۔ پہلے دن ہی خودکش بمبار عرب مجاہد نے بدعہدی کے مرتکب دو کمانڈر اپنی فتح کے نشے میں چور جہنم واصل کیے۔ انہی خونیں واقعات کے ساتھ اگلی صبح اتوار 25 نومبر کی صبح امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے کی ٹیم قلعے میں پہنچی۔ اس کے ساتھ دوسرا اہلکار، ڈیوو، جو کہ بھاری بھرکم، گھنی ڈاڑھی والا تھا۔ یہ ازبکی، فارسی اور روسی مکمل بولتا تھا۔ اس کی ظاہری شکل وصورت افغانیوں جیسی تھی۔ البتہ ڈیوو کی ران کے ساتھ امریکی ساخت کا ریوالور بندھا ہوا تھا۔ 32 سالہ مائیکل سپین کی لمبی مونچھیں اور جینز پہنے ہوئے تھا۔ اس کی گردن غرور سے اکڑی ہوئی تھی اور قلعے میں پہنچنے کا بظاہر مشن جنگی قیدیوں میں شامل ''اسامہ بن لادن'' کی تنظیم القاعدہ کے ارکان کو تلاش کرنے کے لئے قیدیوں سے انٹرویو کرنا تھا۔ مقصد صرف تحقیق کرنا ہوتا تو سی آئی اے جنگی قیدیوں میں پہنچنے کی بجائے ان میں عرب قیدیوں کا چناؤ کر کے الگ تفتیش بھی کر سکتی تھی۔ مگر امریکی فوجی جاسوس اس کی بجائے اپنی فتح کا گھمنڈ دکھانے خود وہاں پہنچ گئے گویا مائیکل سپین کی موت اس کو لے آئی۔ مائیکل سپین کے متعلق جو معلومات ملی ہیں۔ اس کے مطابق وہ امریکہ کی ریاست 'الباما' کے شہر ''ون فیلڈ'' کا رہائشی تھا۔ اکتوبر کو جونہی امریکی فضائی حملوں کا آغاز ہوا۔ وہ سی آئی اے کی طرف سے افغانستان میں داخل ہوا۔ مائیکل سپین دو سال قبل بھرتی ہوا تھا اور یہ اس کی زندگی کا اہم ترین مشن تھا۔ افغانستان مشن میں وہ سی آئی اے کے ''سیکریٹو پیرا ملٹری یونٹ'' کی طرف سے تعینات تھا اور یہ یونٹ کئی ہزار کمانڈوز سے لیس اور ایجنسی کا اہم شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شامل ارکان کی ذمہ داریوں میں جنگ کے دوران دشمن کے علاقوں میں گھس کر بدامنی پھیلانا، جنگ کی معلومات فراہم کرنا اور جنگ زدہ ملک ہی کے اندر اپنے حمایتی گوریلوں کو ڈھونڈ کر انہیں تربیت دینا شامل ہے۔

مائیکل سپین کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے سی۔ آئی۔ اے نے افغانستان میں اسامہ کے القاعدہ کے نیٹ ورک کی انٹیلی جنس اور جنگجو افغان سرداروں کو خرید کر انہیں طالبان کے خلاف لڑانے جیسی اہم ذمہ داری سونپی تھی۔ اس مشن کے لئے مائیکل سپین کو لاکھوں ڈالر خرچ کرنے کا بھی اختیار دے رکھا تھا۔ اس کی تصدیق فرانس کے صحافی کی رپورٹ [illegible] جس میں شمالی اتحاد کے ایک مقامی کمانڈر شمس الحق ناصری کی زبانی لکھتا ہے کہ ''میرا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نائن الیون کے واقعات سے پہلے ہی ترکمانستان میں قائم امریکی قونصلیٹ سے رابطہ ہو چکا تھا اور وہیں میری ملاقات ان امریکیوں سے ہوئی تھی جو افغانستان میں قائم طالبان کی حکومت کے خاتمے یا کم از کم اس میں دراڑیں ڈالنے کے لئے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میرے پاس تین سیٹلائٹ ٹیلی فون تھے جن کے ذریعے میں افغانستان بیٹھ کر امریکیوں سے رابطہ کرتا تھا"۔

افغانستان پر امریکی یلغار شروع ہونے کے بعد امریکہ کی جانب سے جنرل دوستم کو ابتدائی طور پر تین لاکھ ڈالر ادا کئے گئے تھے جن میں سے پچاس ہزار ڈالر کی رقم شمس الحق کے حصے میں آئی تھی۔ چنانچہ کمانڈر ناصری کے ملت فروش فوجی دن کے وقت طرح طرح کے بھیس میں طالبان اور دیگر مجاہدین کے ٹھکانوں اور جنگی مورچوں کے بارے معلومات حاصل کرتے اور پھر رات کے وقت سیٹلائٹ فون کے ذریعے وہ ساری معلومات امریکی افواج کو فراہم کرتے۔ انہی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق امریکی بمباری کر کے اور میزائل داغ کر مجاہدین کو نقصان پہنچاتے۔ مخبری کا یہ مذموم سلسلہ اس قدر بڑھا کہ طالبان کے لئے مزار شریف سے پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مزار شریف کی پسپائی سے قبل شولگرہ کے قریب مجاہدین کے دفاعی مورچوں کی طرف جانے والے غیر ملکی اور طالبان مجاہدین امریکی طیاروں نے سفاک ترین بمباری کی تھی۔ اس آدھی رات کے قریب بمباری کی اچانک واردات سے معلوم ہوا کہ یہ بھی انہی جاسوسوں کی مخبری پر ہوئی تھی اور یہ شہر طالبان نے خالی کر دیا تو طالبان کی فوج کے نکلنے کے بعد مزار شریف پر قبضہ کرنے والی فوج میں کمانڈر ناصری کے افراد بھی شامل تھے۔

مائیکل سپین اور ڈیوو نے غصے کے انداز میں تحقیقات شروع کی تھی جس کی گواہی جرمن ٹیلی ویژن کے ارکان نے بھی اپنی رپورٹ میں کی تھی۔ اب دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ قیدیوں سے سوال و جواب کی اس جگہ تقریباً تیس میٹر کے فاصلے پر ریڈ کراس کا رکن خاص "سیمن بروکس" بیٹھا ہوا تھا اور شہید ہو جانے والے قیدی مجاہدین کی جانب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، کچھ ہی دیر بعد قلعہ جنگی کے نگران جنرل مجید روزی سے مل کر قیدی مجاہدین کے بارے میں طے کئے گئے معاملات دریافت کرنے تھے تاکہ وہ ان سے متعلق اپنے ادارے کو مطلع کر سکے۔

سیمن بروکس کا کہنا ہے: جنرل روزی سے میری ملاقات ٹھیک گیارہ بج کر پچیس منٹ پر ہوئی لیکن ابھی ہم نے گفتگو کا آغاز ہی کیا تھا کہ اچانک ہمیں مشین گن کی گولیوں کے چلنے کی آواز

آئی جنہیں سنتے ہی جنرل روزی اٹھا اور تیزی سے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی جگہ بیٹھا رہا لیکن پھر جب گولیاں چلنے کی آواز تیز ہو گئی اور دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تو میں بھی کمرے سے باہر نکل گیا تاکہ جنرل روزی کے ساتھ مل کر حالات کے بارے جان سکوں۔ میں نے دیکھا جنرل قلعہ کی دیوار کے پاس ایک کھڑکی کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے فوجیوں کو کچھ ہدایت دے رہا ہے اور چیخ چیخ کر انہیں تاکید کر رہا ہے کہ وہ ڈر کر بھاگیں نہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ قیدیوں نے بغاوت کر دی ہے اور قلعہ کے جنوبی حصے پر ان کا کنٹرول ہو گیا ہے۔

شمالی اتحاد کے داؤد نامی فوجی نے جو اس واقعے کے وقت قلعہ جنگی میں موجود تھا۔ بتایا کہ "بغاوت کے پہلے مرحلے میں قیدیوں کے مابین انتقام کی ایک روا ٹھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔ جس کی ابتداء سب سے پہلے قلعہ کے تہہ خانے میں موجود قیدی عرب مجاہدین نے کی۔ ان مجاہدین نے پہلے تہہ خانے کے پاس موجود شمالی اتحاد کے پہریداروں پر دستی بم پھینکے جس سے خوف زدہ ہو کر یہ اپنی جگہ سے بھاگنے لگے تو ان مجاہدین نے آگے بڑھ کر ان سے اسلحہ چھین لیا اور ان پر فائرنگ کر دی جس سے کئی فوجی ہلاک ہو گئے اور باقی بدحواسی کی حالت میں بھاگنے لگے (بغاوت کی اصل وجہ قرآن پاک کی بے حرمتی تھی جس کا ذکر کمانڈر صاحب کے پچھلے بیان میں گزر چکا ہے شمالی اتحاد کے داؤد نے میڈیا پر اس واقعہ کو بیان نہ کیا)۔ اس دوران قیدی مجاہدین کی فائرنگ کے جواب میں سب سے پہلے سی آئی اے کے اہلکار مائیکل سپین کا ردِعمل ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے ریوالور سے مجاہدین پر فائر کرنا شروع کر دیئے لیکن اسے اپنے دفاع کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس کے قدموں میں بیٹھے ایک عرب مجاہد نے جس کی تفتیش کی باری آنی تھی آگے بڑھ کر مائیکل پر جھپٹا مارا اور اس کا وہ ہاتھ دبوچ لیا جس سے وہ فائرنگ کر رہا تھا۔

جرمن ٹی وی کے مطابق امریکی جاسوس ڈیوو نے بھی فائرنگ شروع کر دی اور دو عربوں کو موقع پر شہید کر دیا اس پر بھی امریکیوں کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اور ڈیوو نے شمالی اتحاد کے فوجی کے ہاتھ سے اے کے 47 رائفل لی اور میدان میں خوف سے سہمے دوسرے قیدیوں پر بھی فائرنگ شروع کر دیں اور لاتعداد مجاہدین کو بلاوجہ شہید کر دیا۔ امریکی فوجیوں کے ہاتھوں ظلم کے واقعہ کے خلاف نفرت کی آگ لاوا بن کر ابل پڑی تھی۔ چنانچہ سہمے ہوئے نہتے قیدی ان پر ٹوٹ پڑے اور جرمن رپورٹوں کے مطابق مجاہدین نے مائیکل سپین کو اتنی سختی سے نوچا کہ اسکی انگلیاں اس کے گوشت میں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پیوست ہوگئیں۔ باقی مجاہدین بھی ٹکوں اور گھونسوں سے اس کی مرمت کرتے رہے۔ اس لڑائی کے دوران مائیکل نے دوبارہ پسٹل سے فائر کر کے مزید دو طالبان شہید کر دیئے۔ اس پر ہجوم اور زیادہ مشتعل ہوگیا۔ اور مجاہدین نے امریکی جاسوس کو اس وقت چھوڑا جب ہلاک ہونے کے بعد اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے ایک مجاہد نے مائیکل کے سر میں گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ نے مائیکل سپین کی موت پر کہا کہ "وہ امریکہ کا ہیرو تھا"۔ اس دوران مردار مائیکل کا ساتھی ڈیوو سارا منظر دیکھ رہا تھا اور فائرنگ کرتے ہوئے قلعے کی شمالی جانب فرار ہوگیا کیونکہ قلعے کے جنوبی حصے میں کافی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ قیدی مجاہدین نے بھاگتے ہوئے افغان فوجیوں سے کافی اسلحہ چھین لیا تھا۔ شمالی اتحاد کے مسلح محافظوں کو مجاہدین نے گھیرے میں لے لیا اور 20 محافظوں کو موقعہ پر ہلاک کر دیا۔ ان کا اسلحہ اے کے 47 رائفلیں، گرنیڈ، بارودی سرنگیں، راکٹ لانچرز گولے اور دوسرا آتشین اسلحہ شامل تھا۔ قبضے میں لیا گیا۔ یہ اسلحہ جو کہ وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ بارودی سرنگیں ساتھ لانے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں قلعہ کے اندر بچھا دیا جائے اور قیدی بغیر کسی حملے کے ہلاک ہو جائیں مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا (جنوبی حصے کا اسلحہ ڈپو بھی مجاہدین کے ہاتھ لگ گیا تھا) اسلحہ کے ہاتھ لگنے سے مجاہدین میں جرات اور بیباکی پیدا ہوگئی اور موت کے یقین کے بعد وہ مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ اس واقعے کے بعد قلعہ کی انتظامیہ میں سخت پریشانی اور گھبراہٹ پھیلی، حالات ایسے تھے کہ اندر سے طالبان اور باہر سے شمالی اتحاد کے فوجیوں کا کنٹرول تھا قلعہ کے اندر بدامنی پھیلنے کے بعد چند قیدی قلعے میں باہر جانے والے نالے کے راستے آزاد ہو گئے اور جو اندر رہ گئے تھے انہوں نے شمالی مغربی حصے میں پوزیشنیں سنبھالی تھی دوسری جانب خطرناک اسلحہ سے لیس شمالی اتحاد کے فوجی شمال مشرقی حصے، شمال کی دیوار چھت اور دوسری جگہوں پر پوزیشن سنبھال کر حملے کے لئے تیار ہو گئے۔ دونوں جانب سے حملے شروع تھے۔ مگر طالبان قیدیوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ چاروں اطراف سے محاصرے میں تھے اور ان میں چند ایک کے سوا سینکڑوں نہتے قیدی محض شہادت کے لئے گولیاں کھا رہے تھے۔ قلعے کے میدان میں رسیوں سے بندھے بیمار زخمی و پیاس کی شدت سے دو چار طالبان کو شمالی اتحاد والے فائرنگ کا نشانہ بنا رہے تھے۔

دوسری طرف سیمن جونس بھاگتا ہوا ایک بلند چوکی پر چڑھ گیا۔ جہاں پہلے سے جرمن ٹی وی کی ٹیم بھی سہمی ہوئی موجود تھی اور قلعہ میں چلنے والی گولیوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سیمن

بروکس نے بتلایا کہ ڈیوو نے اس وقت ہم لوگوں سے کہا کہ حالات بہت خراب ہیں کیونکہ قیدیوں نے کئی پہریداروں سے اسلحہ چھین لیا ہے۔ لہٰذا آپ لوگ قلعہ سے باہر نکل جائیں لیکن ہم نے اس کی بات ماننے سے یہ کہتے ہوئے انکار دیا کہ ہم بیس میٹر بلند دیواروں سے کیسے چھلانگ لگائیں؟ اور اگر ہم کسی اور راستے سے نکل بھی جائیں تو بھی حالات بہت خراب ہیں۔ ہمارا بچ نکلنا محال ہے۔ یہ سن کر ڈیوو بھی خاموش ہوگیا اور ہمیں یقین ہوگیا کہ اب ہمارا یہاں سے بچ کر نکل جانا ممکن نہیں۔ مگر پھر اچانک ڈیوو نے جرمن ٹی وی کے ایک فرد سے سیٹلائٹ فون مانگا اور جلدی جلدی کسی سے رابطہ کر کے تقریباً چیختے ہوئے اسے بتلانے لگا کہ قلعہ میں ہمارا کنٹرول ختم ہوگیا ہے لہٰذا جلدی کرو اور ہماری مدد کو پہنچو۔

اتوار کو دن کے دو بجے تک دو منی وینوں اور دو لینڈ کروزر گاڑیوں میں سپیشل امریکن فورس کے کمانڈو اور برطانیہ کے سپیشل آرمڈ سروسز کے چھ کمانڈو بھی قیدیوں کو شہید کرنے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ ایم فور، ایم 6 رائفلوں اور دوسری ہلاکت خیز اسلحہ سے لیس ان کمانڈروں نے پہنچتے ہی شمالی اتحاد کے کمانڈروں کا اجلاس بلا لیا۔ اجلاس میں امریکی کمانڈروں نے فوری سیٹلائٹ فون وارگائیڈ بم انہیں مہیا کرنے کا کہا۔ ابھی تک مرنے والے امریکی ساتھی ڈیوو کو وائرلیس سیٹ کے ذریعے ہدایات دے رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ ہم تمہیں بچانے آ رہے ہیں۔ شمالی اتحاد کے مسلح دستے قلعے کی شمال مشرقی دیوار سے جنگ میں سرگرم تھے اسی دوران انہوں نے قلعے کی جنوبی دیوار کے ساتھ دو ٹینک کھڑے کر کے طالبان قیدیوں پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ عین اس وقت آسمان پر دو امریکی جنگی طیارے آ گئے۔ اور دائرے کی شکل میں قلعے کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ شمالی اتحاد کا جنرل مجید روزی امریکی اور برطانوی کمانڈوز کو کہہ رہے تھے کہ قلعے میں سفید رنگ کی ایک منزلہ عمارت (جس میں شبہ تھا کہ نہتے طالبان قیدی جان بچانے کے لئے چھپے تھے) کو نشانہ بنایا جائے۔ امریکی کمانڈوز ایک بار پھر وائرلیس سیٹ سے جنگی طیاروں کے پائلٹوں کو حملے کے مقام کی نشاندہی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وائرلیس والا امریکی کمانڈو امریکی طیاروں کو شمال 3639984 مشرق 06658945 اور 1299 فٹ اونچائی کی نشاندہی کے ذریعے کچھ سمجھانے کے خفیہ اصطلاحات استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اصطلاحات بدلیں اور چار منٹ، تین منٹ، دو منٹ، تیس سیکنڈ، پندرہ سیکنڈ پکارنے لگا۔ اچانک آسمان پر پرواز کرنے والے طیاروں سے ایک بہت بڑا تیر نما میزائل داغا گیا۔ سینکڑوں میٹر کی بلندی سے پھینکے گئے اس میزائل

Uploaded By Muhammad Nadeem

کی آواز ایسی تھی جیسے کار کو ہائی گیئر میں ڈالتے ہوئے ہے۔ میزائل دیکھ کر غیر ملکی کمانڈوز اور فوجی دیواروں سے چپک گئے۔ وائرلیس سے نشاندہی کرنے والا کمانڈو اوندھے منہ لیٹ گیا۔ قلعے کے اندر سے انسانوں کی چیخوں نے ماحول پر موت کا سوگ طاری کر دیا تھا۔ اسی لمحے میزائل کا ایک ٹکڑا امریکی کمانڈوز کے نزدیک آ گرا جسے ایک کمانڈو نے ہاتھ میں پکڑ کے کہا ''سوغات'' جنگی طیاروں نے قلعے پر مزید چھ حملے کئے۔ امریکی کمانڈوز شمالی اتحاد کے فوجیوں کو حملے کے لئے تیار رہنے کا حکم دینے لگے اور کہا کہ طیارے مزید دو حملے کریں گے اور اس کے بعد انہیں تمام اسلحے سے قلعے کے اندر فائرنگ شروع کر دینی چاہئے۔ طیاروں کے حملوں اور شمالی اتحاد کی فائرنگ کو جو سلسلہ صبح سے شروع تھا سورج ڈھلنے تک جاری تھا اور رات تک اس میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ شاید حملہ آوروں کو یقین ہو گیا کہ تمام قیدی شہید ہو چکے ہیں۔

قلعہ جنگی میں قیدیوں کے خلاف حملوں کے چشم دید گواہوں کے بقول شمالی اتحاد کے فوجی مزار شریف کے نزدیک سے روشنی کے گولے قلعے کے اندر پھینکتے اور قلعہ کی دیواروں پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے امریکی کمانڈوز اور شمالی اتحاد کے فوجی فائرنگ کرتے تھے۔ رات گئے حملوں کے دوران ہی امریکی کمانڈو ڈیوو اور جرمن ٹی وی کے کیمرہ مین اور ریڈ کراس کے نمائندے محفوظ جگہ سے بچ نکل کر شمالی دیوار پھلانگ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

منگل کو علی الصبح شمالی اتحاد کے فوجیوں نے قلعے کے شمال مشرقی برج پر چوکی بنا کر وہاں ایک ٹینک کھڑا کر دیا۔ ٹینک سے کمانڈر محمد اکبر طالبان پوزیشنوں پر گولے داغنے لگا۔ ''بہت خوب'' زبردست نشانہ اور اس طرح کی دوسری آوازیں گولوں کے ساتھ اس کے حلق سے نکل کر باقی سپاہیوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کر رہی تھے۔ صبح دس بجے سپیشل آپریشنز گروپ کے چار اور دسویں پہاڑی ڈویژن کے آٹھ کمانڈوز بھی قلعے میں پہنچ گئے۔

منگل کی صبح دس بجے امریکی و برطانوی کمانڈوز اور بعض افغان کمانڈوز ایک مرتبہ پھر قلعہ کے شمالی حصے میں واقع مرکز عملیات (آپریشن سنٹر) میں جمع ہوئے اور باہمی میٹنگ کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ایک مرتبہ پھر جنوبی حصہ پر خاص طور پر اسلحہ ڈپو پر بمباری کروانی چاہئے۔ جو پہلے سے زیادہ شدید ہو تاکہ قیدی مجاہدین اسلحہ کے ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور یوں ان کو نہتا کر کے سرنڈر ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔

فوجی کمانڈروں کا یہ فیصلہ وائرلیس کے ذریعے قلعہ سے باہر بھجوا دیا گیا جس کے نتیجے میں

Uploaded By Muhammad Nadeem

جنگی طیاروں کو ایک مرتبہ پھر بمباری کا حکم ملا مگر ساتھ ہی انہیں یہ ہدایات بھی دی گئیں کہ چونکہ قلعہ کے اندر اسلحہ ڈپو سے امریکی مرکز عملیات زیادہ دور نہیں اس لئے پوری احتیاط کے ساتھ بمباری کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بم اسلحہ ڈپو کی بجائے مرکز عملیات پر جا گریں اور خود اپنا نقصان ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ قلعہ کے اوپر پہنچ کر جنگی طیاروں نے مرکز عملیات میں موجود فوجیوں سے کہا کہ وہ احتیاط تو کریں گے لیکن رہیں گے یہیں تاکہ وہ طیاروں کو لیزر شعاعیں دکھا کر ہدف کی نشاندہی کر سکیں۔ چنانچہ بمبار طیارے ان کی راہنمائی کے مطابق بالکل اسی علاقہ کے اوپر آ گئے۔ پائلٹ نے کچھ ہی دیر بعد اشارہ دیا کہ وہ میزائل داغنے والا ہے۔ وائرلیس سیٹ والا دوبارہ پائلٹوں کو خفیہ کوڈ بتانے لگا۔

10.53 بجے طیاروں کا داغا گیا ایک آوارہ میزائل اسلحہ ڈپو کی بجائے مرکز عملیات پر جا لگا۔ اب وہاں پر آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ زوردار دھماکے سے اڑنے والی گرد نے شمالی اتحاد والی چوکی کے تمام حصے کو اپنے حصار میں لے لیا۔ گرد کے بادل ختم ہوئے تو قلعے کی دیوار پر ایک چھوٹے سوئمنگ پول کے برابر یوشکل کا سوراخ نمودار ہو گیا۔ برج پر نصب ٹینک ہوا میں اچھالے سکے کی طرح بل کھاتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ چوکی پر موجود شمالی اتحاد کے خون اور گرد سے اٹے ہوئے زخمی سپاہی نے جس کی آنکھوں اور کانوں سے خون رس رہا تھا۔ کہنے لگا میزائل کا نشانہ خطا ہو گیا۔ زخمی سپاہیوں کو کچھ اطلاع نہیں تھی کہ ان کے کتنے ساتھی زخمی اور ہلاک ہوئے ہیں اور وہ کس حالت میں تھے۔

شمالی اتحاد اور امریکی فوجی اس نفسا نفسی میں قلعے کے اندر حملے بند کر کے اپنے زخمی ساتھیوں کی مدد میں مصروف ہو گئے تھے۔ اگلے بیس منٹوں میں ہلاک ہونے والے اور زخمیوں کو سات ہیلی کاپٹروں اور منی بسوں کے ذریعے امریکی فوجی بیس کیمپ تک پہنچایا گیا۔ 9 شدید زخمیوں کو جہاز کے ذریعے مطلوبہ مقام تک لے جایا گیا۔ قلعہ جنگی امریکی میزائل کا نشانہ بننے والے شمالی اتحاد کے فوجیوں میں بیس ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ اس دوران زخمی ہونے والے پانچ امریکی کمانڈوز کو بعد میں جرمنی کے جنوب مغرب میں واقع امریکی فوجی ہسپتال لینڈ تھل ریجنل میڈیکل سنٹر علاج کے لئے پہنچا دیا گیا۔ برطانوی ذرائع کے مطابق ان کے چار فوجی زخمی ہوئے تھے۔ آدھی رات کو امریکہ کے اے سی 120 طیارے بھی قلعہ جنگی پہنچ گئے۔ ان گن شپ طیاروں کے ذریعے قلعہ کے اندر دائرے کی شکل میں پانچ بار گولیوں کی زبردست بوچھاڑ کی گئی۔ کارپٹ بمباری

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کرنے کے بعد یہ طیارے واپس روانہ ہوئے تو اپنے پیچھے قلعہ کے اندر آگ کے شعلے چھوڑ گئے۔ رات بھر ہونے والے حملوں کی آوازیں قلعے کے اردگرد کے 15 کلومیٹر علاقے تک سنی گئیں۔

قلعہ جنگی کے بے بس قیدی مجاہدین پر ایک طرف فضاؤں سے آگ اور بارود کا مینہ برسایا جا رہا تھا اور دوسری طرف ان کے خلاف زمینی جنگ بھی جاری تھی اور منگل کی صبح سے ہی شمالی اتحاد کے کئی ٹینک دور کھڑے ہو کر قلعہ پر مسلسل گولہ باری کر رہے تھے۔ یہ گولہ باری اس قدر شدید تھی کہ قلعہ کی اکثر دیواریں منہدم ہو گئیں۔

قلعہ جنگی میں بدھ کے روز صبح طلوع ہوتے ہی بچے کھچے طالبان جنگی قیدی جھنڈے لہرا کر صلح کے طالب ہوئے۔ شمالی اتحاد کے کمانڈر روزی کا اندازہ تھا کہ قلعے میں 600 طالبان قیدیوں میں صرف پچاس زندہ بچے تھے اور ان کے پاس بھی پانی اور اسلحہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کے پاس خوراک بھی نہیں تھی اور وہ مبینہ طور پر جنرل دوستم کے گھوڑوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو چکے تھے۔ گزشتہ رات ان زندہ بچنے والے قیدیوں کا ایک ساتھی کسی طرح قلعے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر اسے مقامی لوگوں نے پکڑ کر درخت سے لٹکا دیا تھا اور اس کی لاش تماشا کا سامان بنی تھی۔

شمالی اتحاد کے فوجی موت کے اس کھیل کے ختم ہونے پر فتح کا جشن منانے میں مصروف تھے۔ ان کے سپاہی چرس کے لمبے کش لے رہے تھے اور ان میں سے بعض امریکہ کی جانب سے دیئے گئے خوراک کے ڈبوں سے مونگ پھلی، مکھن اور جیلی نکال کر مزے سے کھا رہے تھے۔ صبح دس بجے سپیشل آپریشنز گروپ اور برطانوی کمانڈوز کا 17 رکنی دستہ قلعہ میں پہنچا۔ اس دستے میں ہلاک ہونے والے امریکی مائیکل کا ساتھی ڈیوڈ بھی شامل تھا۔ جس نے اے کے 47 رائفل اٹھائی تھی۔ یہ غیر ملکی فوجی دستہ دیواروں سے پوزیشنیں لے کر قلعے میں داخل ہو گیا۔ شمالی اتحاد کے ایک سو فوجی قلعے کی فصیلوں سے ابھی تک طالبان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ یہ فوجی ابھی تک فصیلوں سے اتر کر قلعے میں داخلے سے خوف زدہ تھے۔ ان سپاہیوں کے سروں پر ابھی تک طالبان قیدیوں کے فضائی حملوں کا خوف سوار تھا۔ کمانڈر کے حکم پر شمالی اتحاد کے چند سپاہیوں کو قلعے میں بھیجا گیا اور جب کسی مزاحمت کا خطرہ ختم ہو گیا تو باقی سپاہی بھی اندر داخل ہو گئے۔ شمالی اتحاد کے سپاہی شہید ہونے والے جنگی قیدیوں کے ہاتھ اور پاؤں کی رسیاں قینچی سے کاٹنے لگے۔ شمالی اتحاد کے ایک سپاہی نے اپنے کام کے دوران ایک زخمی مجاہد کو گھاس میں کراہتے ہوئے دیکھا تو اس کے قریب پہنچ کر گولی مار کر اسے ابدی نیند سلا دیا۔ شمالی اتحاد کے درندوں نے قلعے کے اندر لوٹ مار شروع کر دی

تھی اور وہ شہید ہونے والوں کی بندوقیں، رائفلیں اور اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ ان لٹیروں نے شہید ہونے والوں کی جیبوں کی تلاشیاں لے کر وہاں سے نقدی اور پن بھی نکال لئے تھے۔ اتحادی درندے مرنے والوں کے جوتے بھی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس موقع پر بہت ہی عبرت ناک مناظر دیکھنے کو ملے جن طالبان شہداء کے جوتے اتارے گئے تھے ان کے پاؤں سردی سے نیلے ہو گئے تھے۔ قلعے کے اصطبل میں دوستم کے 30 گھوڑوں کی لاشیں بھی نظر آئیں۔ انسانوں اور جانوروں کی آنتیں بکھری پڑی تھیں۔ شمالی درندے ان دلخراش مناظر سے خوش ہو رہے تھے اور مرنے والوں کی لاشوں کو ٹھوکریں مار کر انہیں "دہشت گرد" اور "خطرناک ملکی" کہہ رہے تھے۔ محمد یاسین نامی شخص نے پُرجوش انداز میں بتایا "اس نے چار چیچن فوجی مار ڈالے ہیں اور وہ شہیدوں کی لاشیں بھی دکھا سکتا ہے"۔

شمالی درندوں کے غصے اور نفرت کی آگ اب بھی باقی تھی۔ قلعے کے ایک تہہ خانے میں جب پانچ زندہ طالبان کی خبر ملی تو اتحادی فوجیوں نے کھڑکیوں سے تہہ خانے کے اندر گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی اپنی رائفلوں سے فائرنگ بھی شروع کر دی۔ اس کے باوجود شمالی درندے تہہ خانوں میں داخل ہونے سے ڈر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے قلعہ کے اوپر ایک ٹینک منگوا لیا۔ یہ ٹینک لاشوں کو کچلتے ہوئے تہہ خانے کے نزدیک پہنچ گیا اور بعد ازاں ٹینک نے گولے داغنے شروع کر دیئے۔ قلعے کی ایک خندق میں ایک نوجوان مجاہد کے ابھی کچھ سانس باقی تھی۔ اتحاد کا ایک فوجی اسے دیکھ کر اس کے قریب گیا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر ایک راکٹ داغ دیا۔ لاشوں کے اس ڈھیر سے سی آئی اے کے افسر مائیکل سپین کی لاش بھی برآمد کر لی گئی۔ ایک ہفتے بعد شمالی اتحاد اور امریکہ کے فوجی قلعہ جنگی کے تہہ خانوں کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔ شمالی اتحاد والوں کا خیال تھا کہ ان تہہ خانوں میں پانچ چھ طالبان زندہ ہوں گے۔ ان زندہ بچ جانے والے طالبان کو باہر نکالنے کا طریقہ سوچا جانے لگا۔ شمالی اتحاد کے پانچ افراد کو قلعے کے تہہ خانے میں بھیجا گیا جس کی سیڑھی لاشوں، زخمیوں اور عمارت کے ملبے سے اٹی ہوئی تھی لیکن ان پانچ افراد میں سے دو کو تہہ خانے سے باہر نکلنا نصیب ہی نہیں ہوا جبکہ باقی تین میں سے دو شدید زخمی اور ایک صحیح سلامت واپس باہر نکلا۔ انہوں نے بتایا کہ تہہ خانے کے اندر کئی قیدی ابھی تک زندہ ہیں۔

اس صورت حال میں امریکی خصوصی فورسز نے اپنی انسانیت سوزی اور جلادی و سفاکی کا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مظاہرہ کرتے ہوئے تہہ خانے کے دہانے پر تیز آگ لگا دی اور اس کا سارا دھواں اندر کی جانب جھونک دیا۔ تاریک تہہ خانے کے اندر جب آگ کی تپش اور دھواں جمع ہوا تو زندہ بچ جانے والے مجاہدین میں سے کئی اور کا دم بھی گھٹ گیا اور وہ اسی حالت میں شہید ہو گئے جبکہ باقی ماندہ زخمی حالت میں کراہتے ہوئے تہہ خانے سے باہر آنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن اب بھی تہہ خانے کے اندر کچھ مجاہد ایسے تھے کہ جنہوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کو ختم کرنے کے لئے امریکی درندوں نے اب ایک اور حربہ آزمایا اور جسم کو شل کر دینے والا ٹھنڈا یخ پانی تہہ خانے کے اندر چھوڑ دیا حتیٰ کہ تہہ خانے میں ایک میٹر کی بلندی تک پانی بھر گیا۔ جس کے نتیجے میں مزید زخمی مجاہدین شہید ہو گئے جبکہ چند باقی مجاہدین جن کی حالت کچھ بہتر تھی وہ پوری رات اس پانی میں کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ اگلے دن 30 نومبر بروز ہفتہ صبح کے وقت جب دشمن کے فوجی صورتحال کا جائزہ لینے قلعہ کے اندر داخل ہوئے تو ٹھنڈے پانی میں پوری رات کھڑے ہونے والے مجاہدین اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ وہ کچھ حرکت کر سکتے۔

O

نیا باب

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے کیا الف لیلیٰ سنانی شروع کر دی ہے لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بعض چھوٹی چھوٹی لیکن تلخ سچائیاں زندگی کا رُخ بدل دیا کرتی ہیں۔ دنیا میں بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی ہو گی جنہوں نے تاریخ بنتے دیکھی ہے لیکن ان سے بھی کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تاریخ کا حصہ رہے ہیں۔

جی ہاں! ہم تاریخ کا حصہ بننے جا رہے تھے۔ آپ سوچیے تو سہی ایک سیدھا سادہ مولوی نوجوان دنیا کی سیاست اتار چڑھاؤ، انسانی منافقت، مکاری اور دھوکے جیسے الفاظ سے بھی آشنا نہیں ہوتا لیکن وقت نے مجھے وہ سب کچھ بنا دیا، سکھا دیا اور اس کا حصہ بھی بنا دیا۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب اچانک نائن الیون کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور ہمارے حکمرانوں نے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنا شروع کیا تو ان ہزاروں مجاہدین پر کیا گزری جو راتوں رات دہشت گرد بنا دیئے گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ جو کل تک اسی جہاد کے ''پشتی بان'' تھے وہ آج ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہو گیا؟ ہمارے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا۔

وقت کا ظالم دھارا اپنے ساتھ سب کچھ بہائے لئے جا رہا تھا، ہم تنکوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ آتش و آہن کا سیلاب ہمیں بہائے لئے جا رہا تھا۔

طالبان کے قندوز محاصرے کے دوران قندوز سے انخلاء کرنے والے مجاہدین کی قلعہ جنگی میں قیدی بنانے کا مسئلہ سب سے زیادہ تشویشناک تھا۔ معاہدے کے مطابق عمل درآمد تو نہ ہوا۔ خلاف ورزی کے علاوہ وحشیانہ طریقے سے تشدد کیا اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ ان جنگی قیدیوں کو مزار شریف کے کوچوں اور بازاروں میں گھمایا گیا۔ ان علاقوں پر جہاں طالبان کا دو ہفتے قبل اقتدار تھا۔ وہاں انہیں جنگی قیدی کے طور پر گھمایا گیا۔ ان لاچار طالبان نے اپنے چہرے کمبلوں اور

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ ان قیدیوں کو غیر اعلانیہ طور پر امریکہ اور اس کا حامی شمالی اتحاد شہید کرنے کی پہلی ہی کوشش کر چکا تھا۔ اس بارے میں امریکہ کے وزیر دفاع ''رمز فیلڈ'' کے بیانات اہم ہیں جنہوں نے واضح الفاظ میں قلعہ جنگی کے قیدیوں کو دہشت گرد اور ان کا انجام موت قرار دیا تھا۔ اقوام متحدہ بھی ان جنگی قیدیوں کی ذمہ داری قبول نہ کرنے میں دوٹوک جواب دے چکا تھا کہ ''ان کے پاس ان قیدیوں کو تحویل میں لے کر ان کے مقدمات کی سماعت اور انہیں سزائیں سنانے جیسے کوئی انتظامات نہیں ہیں''۔ غیر ملکی طالبان کو قبول کرنے سے ان کی اپنی حکومتیں بھی امریکی خوف سے انکاری تھیں۔ حتیٰ کہ جنگ زدہ افغانستان میں بھی عدل وانصاف کا اب کوئی نظام نہ تھا۔ ان حالات میں قیدیوں کو شہید کرنے کے لئے فقط بہانے کی تلاش تھی تاکہ عالمی دنیا میں کہیں بھی اس شرمناک انسانی المیے کے لئے افسوس کی کوئی بھی آواز بلند نہ ہو۔ اس لئے شمالی اتحاد، امریکہ، برطانیہ اور اتحادی افواج کو جلدی ہی موقع ہاتھ آ گیا۔

مذاکرات کے ختم ہونے کے بعد جب قندوز سے روانگی کا آخری دن تھا تو صبح کے وقت ہمارے کچھ ساتھیوں کا ایک گروپ قلعہ بالا حصار روانہ کر دیا گیا۔ قلعہ بالا حصار پر امریکی شدید بمباری کر رہے تھے۔ اس لئے ساتھیوں کی تشکیلات کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ صبح کے وقت ایک ٹرک میں بیٹھے اور قلعے پہنچے۔ قلعے کا مرکزی پھاٹک بند تھا اور طالبان پہرے پر موجود تھے۔ معمول کی کارروائی کے بعد ہم کو اندر داخل ہونے کی اجازت ملی۔ قلعے کا پھاٹک کھلا۔ ہم سب کچے رستے پر پیدل جانے لگے۔ قلعے کے اندر بموں سے تباہ شدہ روسی ٹینک اور گاڑیاں جا بجا کھڑی تھیں۔ ہر طرف بموں کے گولے بکھرے پڑے تھے، کئی جگہ پر توپیں نصب تھیں۔ قلعے کی پچھلی طرف طالبان کے مورچے تھے جو کہ دشمن کی آمد کو روکنے کے لئے بنائے گئے تھے جہاں پر رہنے کے لئے کوئی خاص کمرے نہ تھے بلکہ کنٹینروں کے زمین دوز کمرے بنے تھے۔ ہماری تعداد کے بقدر ایک مجموعہ قندوز شہر واپسی کے لئے بیٹھا تھا جو ہماری آمد کے ساتھ ہی اپنے سامان سمیت چل پڑا۔ ایک زمین دوز کنٹینر میں اپنا سامان رکھا۔ قندوز محاصرے کے دوران امریکہ نے امریکہ و افغان دوستی کے نام سے پشتو اور فارسی میں چھپے ہوئے اشتہار بھی پھینکے جو کافی تعداد میں اس قلعے میں پڑے نظر آ رہے تھے۔ امریکی جنگی طیاروں نے پروازیں شروع کر دیں۔ ذمہ دار حضرات نے ادھر ادھر پھرنے سے منع کر دیا۔ ہم واپس اپنے کنٹینر نما کمروں کی طرف لپکے کیونکہ بمباری اکثر دوپہر اور رات کو ہوتی تھی۔ قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ساتھی نے آواز لگا کر سب کو اکٹھا کیا اور

بتایا کہ فوراً قلعے سے اپنا سامان اٹھا کر نکل جائیں۔ جلدی جلدی تیاری کی اور بیس منٹ پیدل سفر کے بعد ہم قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ راستے میں مُلا فضل اخند کی گاڑی دیکھی اس کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی اندر داخل ہوئی۔ مرکزی دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ پھاٹک کی رسی اب کسی طالب مجاہد کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ جنرل دوستم کے سفاک درندوں کے ہاتھوں میں آ گئی جو کہ تازہ تازہ قندوز شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ان درندوں نے دروازے کے قریب کمروں سے طالبان کو سامان بھی اٹھانے کی اجازت نہ دی، اس پر مُلا فضل اخند نے کہا کہ سب کچھ چھوڑ دو تم صرف اپنے آپ کو یہاں سے نکالو کیونکہ ہم نے شہر کا کنٹرول اور اہم سرکاری عمارتوں کا کنٹرول دوستم ملیشیا کے سپرد کر دیا ہے۔ مُلا فضل اخند کے ساتھ ایک کمانڈر جن کو مُلا صاحب قلعے کی مختلف سمتوں اور مورچوں کے بارے معلومات دے رہے تھے۔ پیرم قل دوستم کا حامی ازبک کمانڈر تھا۔ عین اسی رات ہونے والی امریکی بمباری سے پیرم قلم کے 85 جنگجو ہلاک ہوئے تھے کیونکہ امریکہ اپنی طرف سے طالبان کے مورچوں پر بمباری کر رہا تھا۔ دروازے پر چند ایک گاڑیاں اور ٹرک بھی کھڑے تھے جو کہ ہم سب طالبان کی تعداد کے مطابق کم تھے لیکن پھنس پھنسا کر جگہ بنا کر کئی ٹرک کی چھت پر چڑھ گئے جس راستے سے بھی ہماری گاڑی گزرتی وہاں لاشوں کی فراوانی نظر آتی، ہمارا مجموعہ اب دوبارہ ہیلوٹرسٹ کی بلڈنگ میں پہنچ گیا جہاں سے معلوم ہوا کہ عصر کے وقت تک طالبان قندوز سے انخلاء کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سارا عمل رات تک جاری رہے۔ اب انتہائی عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ طالبان کی طرف سے سفر کے بارے آخری ہدایات سب کو پہنچ رہی تھی اور اللہ کی رضا کی خاطر اطاعت میں رہتے ہوئے مشکل حالات کے مقابلے کے لئے سب تیار تھے۔ سب مجاہدین اپنے ٹرکوں اور گاڑیوں میں ضروری سامان رکھ رہے تھے۔ روٹیاں، کھجوریں، پانی کی کینیں اور گاڑی کے ڈیزل کے ڈرم ہر ٹرک میں تھے کیونکہ معاہدے کی رو سے قندوز سے قندھار جانا تھا جو کہ تین دن کا سفر تھا۔

9 رمضان بروز ہفتہ قندوز سے عصر سے پہلے روانہ ہوئے۔ طالبان مجاہدین کے چہرے اترے ہوئے آنکھیں آنسوؤں میں نم تھی۔ چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ بہت بڑی دولت چھن رہی ہو۔ یہ گلیاں اور بازار جہاں پر کبھی امن و آشتی کے فوارے پھوٹتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ازبک ملیشیا کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈوں اور کیبلوں سے لوگوں کو بھگا رہے تھے اور زبردستی دکانیں بند کروائی جا رہی تھیں۔ افغانستان کے غیور بے بس عوام جانوروں کی طرح

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہانکے جا رہے تھے۔ افسوس! کہ یہ وقت بھی دیکھنا پڑا۔ کئی لوگ اپنے گھروں میں مقید رو رہے تھے اور وہ کیوں نہ روتے انہیں معلوم تھا کہ اب باپ جوان بیٹی کی عزت بچانے کے ڈر سے ساری رات سو نہ سکے گا۔ بھائی کا بھی اپنی عزت اور بہنوں کی حفاظت کے لئے گھر سے نکلنا محال ہوگا۔ کیونکہ یہ لٹی پھٹی فضا اور تاجک، ازبک درندوں کی کارستانیاں کوئی نئی نہ تھیں بلکہ یہ طالبان کے اقتدار سے پہلے ہی اپنی درندگی دکھا چکے تھے۔ رمضان کے روزوں کی پامالی کرتے ہوئے دوستم کے فوجی جگہ جگہ روٹی کھا رہے تھے۔ عصر کا وقت قریب تھا۔ قندوز شہر میں مدرسہ تخارستان کے قریب نماز عصر سڑک پر پڑھی اور گاڑی میں سوار ہو کر قندوز کے اسلام پسند مسلمانوں کو روتے چھوڑ کر یہ قافلہ چار درہ کی طرف روانہ ہو گیا اور مغرب کے وقت چار درہ کے نہر والے پل کے قریب ٹھہرے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔

اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ ہی سب نے روزہ افطار کیا۔ نماز مغرب کے بعد روٹی اور کھجور پانی کے ساتھ کھا کر شکر ادا کیا۔ رات اسی جگہ کھلے آسمان تلے بسر اوقات کرنا پڑا کیونکہ طالبان قیادت نے فیصلہ کیا کہ سب طالبان یہاں پر جمع ہو کر اکٹھے جائیں گے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایک دم قندوز سے انخلاء ناممکن تھا۔ سڑک کے کنارے ہی سخت سردی کی رات بستر لگا کر سو گئے۔ تقریباً رات کے بارہ بجے بمباری کی آواز اور گاڑیوں کے آمدہ قافلوں کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ دشت پرکنک کے کنارے خاموش صحرا اور بستی میں اچانک ایک نہ رکنے والا شور برپا ہوا اور پھر بھرپور بمباری سے دشت گونج اٹھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹھتے ہی سب مجاہدین گاڑیوں کی طرف لپکے کیونکہ اچانک گاڑیوں کی آمد دیکھ کر روانگی کا اشارہ مل رہا تھا۔ دھماکے کی آواز قندوز شہر سے ہوتے ہوئے دشت تک پہنچ رہی تھی اور اس میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ میزائل اور بموں کی بارش نے ہر طرف گاڑیوں اور گھروں کو جلا کر آگ روشن کر دی۔ یہ اصل میں امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر اور جنگی طیاروں کی بمباری تھی۔ افراتفری کے حالات میں قندوز سے آنے والے مجاہدین سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ شمالی اتحاد کے تاجک دھڑے نے قندوز پر بڑا حملہ کر دیا کیونکہ قندوز سے انخلاء کے بعد وہاں کا کنٹرول ازبک ملیشیا کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ طالبان کا آخری دستہ صرف خانہ آباد میں طالقان سے آنے والی سڑک پر متعین تھا۔ وہ بھی رات کے وقت اپنے مورچے چھوڑ چکے تھے اور تاجک دھڑے سے فائرنگ کے تبادلے میں وہاں سے نکل آئے تھے۔ غرض یہ کہ قندوز کا شہر راتوں رات تین قسم کی فوجوں سے بھر چکا تھا۔ طالبان نے معاہدے کی رو سے ازبک ملیشیا کو آگے

کیا جس سے اب شمالی اتحاد کے ازبک تاجکوں پر شب خون مارتے رہے لیکن رات کو یہ سلسلہ اب قندوز شہر کے وسط تک سر عام سڑکوں اور گلیوں میں شروع ہو گیا۔ ازبک ملیشیا پیش قدمی کو روک نہ سکے اور ان کے قدم اکھڑنے کے بعد قندوز کا شہر تھراتی اور آوارہ گولیوں، ٹینکوں اور بھاری اسلحہ سے گرجتا رہا۔ کئی مکان منہدم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے کئی بے گناہ شہری پانچ سال بعد تاجک اور ازبک دھڑوں کی آپس کی خانہ جنگی کا نشانہ بن گئے۔

پرکنک کے دشت سے مزار شریف کو جانے والی سڑک پر چلتی گاڑیوں میں سے میں بھی ایک ٹرک جس پر دو میلہ فٹ تھا، لٹک گیا۔ ہم سے آگے بھی گاڑیاں اور ٹرک تھے۔ دونوں طرف بے آب و گیا صحرا اور خوفناک ٹیلے بلاؤں کی طرح نظر آتے۔ اس ٹرک کے شروع میں ترپال سے ایک چھپر بنایا تھا۔ باقی چھت خالی تھی۔ بہت زیادہ تعداد دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے کئی ساتھیوں کو اترنے کا بھی کہا۔ اسی ترپال کے نیچے کچھ پاکستانی اور افغانی طالبان پشتو کی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ ان دشتوں سے گزرتے ہوئے مستان خان دشتِ لیلیٰ کی مشہور نظم جسے سن کر ہی انسان کو رونا آ جاتا، پڑھ رہا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آگے جا کر تاریخ ایک بار پھر دشتِ لیلیٰ کی یاد تازہ کرے گی۔ خیر نظمیں سنتے ہوئے جہاز کی آواز کے ساتھ اچانک بم چلنے کی آواز آئی۔ ہم سے آگے کچھ میٹر کے فاصلے پر ٹرک پر بم گرا جو کہ ہمیں نظر آ رہا تھا۔ اس سے پیچھے والا ٹرک بھی نشانہ بنا۔ ویران صحرا میں انسانی چیخیں کانوں کو چیرتی ہوئی ابھی سن رہے تھے کہ تیسرا نشانہ چشم زدن ہی میں ہمارا ٹرک بن گیا۔ چیخ و پکار کے ساتھ پچھلی گاڑیاں بھی مسلسل نشانہ بنتی رہیں۔ ٹرک کے اگلے حصے پر بم گرا اور درمیان والے ساتھی بچ گئے۔ اگلی سیٹ والے تو موقع پر ہی جام شہادت نوش کر گئے اور کئی زخموں کی زیادتی سے اسی ٹرک میں رہ گئے اور کئی زخمی چھلانگ لگا کر اندھیرے میں سامنے نظر آنے والے صحرا میں اتر گئے۔ سب ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ابھی ہم چند میٹر دور ہی تھے تو ایک میزائل پھر ہمارے ٹرک پر لگا۔ خالی ٹرک آگے کے لاوے کی طرح اچھلا پھر زمین پر گرا۔ اس ٹرک کی آگ منٹوں میں بڑھی تو بمباری کا سلسلہ اب پیدل بھاگنے والوں پر شروع ہو گیا۔

قیامتِ صغریٰ کی رات تھی، ٹرکوں کو آگ سے دونوں طرف صحرا میں چلنے والوں پر بم گرنے لگے۔ چھوٹی گاڑیاں اس سڑک کو چھوڑ کر دشتوں میں اتر گئیں۔ تقریباً آدھ میل پیدل سفر کے بعد دل خراش آواز کے ساتھ ایک میزائل ہم بارہ ساتھیوں کے درمیان لگا جن میں آدھے موقع پر شہید ہو گئے اور زخمی حالت میں چیختے رہ گئے، باقی ہم چار ساتھی معجزاتی طور پر بچ گئے۔ ہم بھی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

حیران تھے کہ ہمارے پاؤں میں میزائل گرنے کے باوجود صرف مجھے معمولی سی خراش آئی، چند قطرے خون نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ ہم چار ساتھیوں نے اب صحرا میں منتشر ہونے کا ارادہ کیا۔ اندھیرے اور ریتلے صحرا میں چلتے ہوئے گھٹنے سے اوپر تک پاؤں دھنس جاتے جس کی وجہ سے بھاگتے ہوئے ہمارے پاؤں جلد ہی جواب دے بیٹھے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس سمت رُخ کریں اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ پیچھے ہم ٹرک کو دیکھتے تو وہ جلتا نظر آ رہا تھا۔ اس ٹرک میں کافی ایمونیشن پڑا تھا۔ اس میں لگی بھاری گن کا بکسہ فل لوڈ تھا۔ دوسرا ہم سب ساتھیوں کو معلوم تھا کہ آگ جب درمیان کے ایمونیشن تک پہنچے گی تو ان آوارہ گولیوں اور راکٹ لانچروں کا رُخ ہماری طرف بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے سب محفوظ جگہ کی تلاش میں بھاگے جا رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ہی اچانک ایک قبرستان نظر آیا۔ اس کے باہر پہلے سے ہی خندق نما جگہ بنی ہوئی تھی۔ ہمارے پہنچنے پر دیکھا تو پہلے سے کئی ساتھی ان خندقوں میں اپنے آپ کو ساکت کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ سڑک سے دشت تک پیچھا کرنے والا گن شپ ہیلی کاپٹر اب ہمارے سر پر منڈلانے لگا لیکن ہم اب محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ بمباری جاری رہی، چلتے چلتے ٹرکوں کا ایمونیشن بھی آگ سے جلنا شروع ہو گیا جس نے مزید جلتی گاڑیوں کے چیتھڑے اپنے ساتھ اڑا دیئے۔ تقریباً تین گھنٹے کی مسلسل بمباری کے بعد ہیلی کاپٹر اور جنگی طیاروں کی آواز آنا بند ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اذانیں شروع ہوئیں اور دشت پورا کا پورا زخمیوں کی چیخ و پکار اور کراہنے سے گونج رہا تھا۔ کئی زخمی چیختے چلاتے ہمیشہ کے لئے خاموشی اختیار کر گئے۔ صبح کی ہلکی روشنی کے بعد ہم نے قبرستان سے نکل کر اس کے ساتھ کئی میٹر اونچائی سے نیچے چھلانگ لگائی، اب کھیت اور باغات شروع ہو گئے۔ ایک ساتھی کے پاس مخابر تھا۔ اس پر ہم اپنے ساتھیوں سے رابطے کرتے رہے لیکن ہر طرف ساتھیوں نے اپنے وائرلیس بھی بند کیے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ امریکی جہاز اپنے مخصوص سسٹم کے ذریعے ان لہروں کو پکڑ کر بمباری نہ کر دیں۔ اچانک ایک ساتھی کا کوڈ نمبر ملا تو مخابرے کی ہدایات پر ہم نے اپنا رُخ پکڑا۔ بالآخر خوب روشنی ہونے پر ہم دوبارہ نہر کے پُل کے قریب پہنچ گئے۔ اس نہر کے کنارے بستی پر بے تحاشا بمباری ہوئی، کئی مکان منہدم اور ان شکستہ گھروں سے چیخیں سنائی دے رہی تھیں، وہاں کے افراد قبرستان کی طرف یہ کہتے جا رہے تھے کہ ہم آپ کے شہیدوں کے لئے قبریں کھود کر ان کو دفنا دیں گے۔ آپ کوئی غم نہ کریں۔ تمام مجاہدین بمباری سے متاثر زخمیوں اور شہیدوں کو

اکٹھا کر رہے تھے۔ بموں سے چھلنی شہداء کی لاشیں نہر کنارے پڑی تھیں اور زخمیوں کو کمبلوں میں لپیٹ کر ایک ٹرک میں لاد کر قندوز ہسپتال لے جانے کا بندوبست ہوا۔ راستے ہی میں صبح نو بجے کے قریب طالبان قیادت کے قندوز سے انخلاء کرنے والے آخری قافلے نے ہمارے ٹرک کو موڑ دیا۔ کئی تندرست ساتھی زخمیوں کی چیخ و پکار، کٹے اعضاء دیکھ کر اس ٹرک سے اتر رہے تھے اور کسی دوسری گاڑی کی تلاش میں چل پڑے۔ اس ٹرک کے اندر کا نقشہ ہی عجیب تھا۔ پورے فرش پر زخمیوں کو کمبلوں میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ میں صرف قندوز واپس جانے کے لئے اس ٹرک میں سوار ہوا تھا لیکن گاڑیوں کی قلت کی وجہ سے اترنے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی وجہ سے جب ٹرک ہچکولے کھاتا تو بیچارے زخمی ساتھی اکٹھے آہ و فریاد بلند کرتے۔ افسوس و ملال کے ساتھ ہم زخمیوں کو تسلی دیتے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں کئی گھنٹے ایک پاؤں پر کھڑا رہا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی جگہ نہ ملی کہ دوسرا پاؤں رکھ لوں۔ دونوں پاؤں کو باری باری استعمال کرتا رہا۔ ٹرک کی بناوٹ ایسی تھی کہ بیٹھ کر پکڑنے کی کوئی جگہ نہ ملتی۔ اگر بیٹھ جاتے تو ٹرک کے جھٹکوں سے زخمی ساتھیوں پر گر جاتے، جس سے ان کی چیخیں ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ میرے قریب ہی سلیپنگ بیگ میں لپٹا ہوا ایک زخمی آخری سانس پر تھا۔ بظاہر اس کے پیٹ تک کوئی زخم نظر نہ آتا۔ اس کے ہونٹ خشک اور نیلے پڑے تھے۔ پورے جسم میں اس کا صرف سر ہل رہا تھا۔ اس زخمی کی چیخ و پکار آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی اور مسلسل کراہنے سے ایسی آواز گلے سے نکل رہی تھی جیسا کسی نے رسّی سے اس کی گردن کو سخت باندھ رکھا ہو۔ ایک جگہ ٹرک رکنے کی وجہ سے تھوڑی دیر ٹھہرنا ہوا تو تشویش ہوئی کہ اس سے پوچھوں لیکن وہ آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ میں نے بیٹھے ہوئے کپڑوں پر گیلا پن محسوس کیا کپڑوں کے ساتھ خون لگا ہوا دیکھا جو کہ اس کمبل کو عبور کر کے نکل رہا تھا جو اس کے پیروں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے جب کمبل ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جس کمبل پر میں نے پاؤں رکھا تھا۔ اس کے نیچے زخمی کا ٹخنے تک کٹا پاؤں تھا اور اس کے پاؤں کا آخری سرا میرے پیر کے نیچے تھا۔ یہ منظر دیکھ کر دل کو جھٹکا لگا کہ یہ بے چارہ اتنی دیر سے تڑپ رہا ہے اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اتنا کہہ سکے کہ اے بھائی! مجھ زخمی کے پاؤں پر سے اپنا پاؤں ہٹا دو۔ اسی لمحے شہید کی آنکھیں سیدھی ہو گئیں۔ ٹرک میں شہید ہونے والوں کی چیخ و پکار اب بھی کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ شہید ہونے کے بعد میں نے اسے آگے پیچھے کر کے جگہ بنالی کہ صرف اپنے وزن پر بیٹھ سکوں۔ اسی شہید کے پیچھے ایک بیس سالہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نوجوان زخمی حالت میں تڑپ رہا تھا۔ اس کا پاؤں گھٹنے تک کٹا ہوا تھا جس سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ وہ زخمی فریاد کر رہا تھا۔ ''خدا کے لئے میرا باقی پاؤں بھی کاٹ ڈالو، کوئی چاقو ہی دے دیں کہ میں خود کاٹ ڈالوں اے مجاہدو! میں تمہارا بھائی ہوں مجھ پر تمہیں رحم نہیں آتا''۔

ہم اسے تسلی دیتے کہ ہمیں تو دکھ ہے لیکن تمہارا پاؤں کاٹنے سے درد مزید بڑھے گا۔ تو وہ اس بات پر بضد تھا۔ ایک بار میرا پاؤں کاٹ ڈالو تو مجھے سکون مل جائے گا''۔ وہ زخمی اصل میں شہادت کے سکون کو پانا چاہتا تھا۔ اس کے برابر ایک پچاس سالہ افغانی مجاہد تھا۔ اس کا ناک ہونٹ اور ایک آنکھ بمباری سے متاثر تھے۔ اس کی شکل کو دیکھنے کے لئے بڑا جگر چاہئے تھا، پھر اس کا تڑپنا اور چیختا ہی بے آب سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنے قریب کے زخمیوں کو تنگ کیا ہوا تھا۔ زخمی بے چارے عاجزانہ منت کرتے خدا کے لئے اس بوڑھے کو خاموش کراؤ لیکن یہ بوڑھا اور بیس سالہ نوجوان بھی ہماری آنکھوں کے سامنے خاموش ہو گئے۔ ہماری گاڑی سڑک پر قطار میں کھڑی تھی۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب خم کھاتی ہوئی سڑک پر کئی گاڑیاں آگے پیچھے نظر آ رہی تھیں، تھوڑی دور آگے ازبک ملیشیا جاہدین سے اسلحہ تقسیم کرتے ہوئے نظر آئے۔ اتوار 10 رمضان کا دن تھا۔ بالآخر ہمارے ٹرک کی بھی تلاشی کی باری آئی اور یہی وہ مقام تھا جہاں طالبان غیر مسلح ہو کر تقسیم ہوتے رہے۔ ہم نے تمام اسلحہ اکٹھا کر کے پہلے ہی سے ٹرک کے قریب رکھا تھا۔ سب ساتھیوں نے اپنی رقوم اور قیمتی اشیاء چھپالی تھی۔ تین فوجی ہمارے ٹرک میں دندناتے داخل ہوئے ہم نے منت کی کہ یہ سب زخمی ہیں لیکن انہوں نے کوئی بات نہ سنی۔ وہ زخمیوں کو روندتے ہوئے ٹرک کے آخر تک تلاشی لیتے رہے۔ زخمیوں کی چیخ و پکار نے تو ہمیں ہلا کر رکھ دیا لیکن یہ درندے زخمیوں پر پیر رکھتے ہوئے بھی ایسا محسوس کرتے کہ وہ زمین پر چل رہے ہیں، حتیٰ کہ شہدا کو بھی نہ چھوڑا، ان کی بھی تلاشی لی۔ ایک ساتھی نے تلاشی کے دوران دوستم کے فوجیوں سے کہا کہ یہ شہید ہے، تو غصے میں آ کر ایک نے کہا کہ نعوذ باللہ یہ مردار ہے۔ لیکن ان شہدا کی بے حرمتی کا بدلہ اللہ لے گا۔ ہم اتنا سوچ کر خاموش ہو گئے۔ ہمارا ٹرک تلاشی کے بعد چل پڑا۔ باقی گاڑی والوں کو پیدل چلنے کا کہا جاتا اور اسلحہ سے بھرے ٹرک اور گاڑیاں صحرا میں کھڑی تھیں۔ کئی ازبک درندے اپنی جیبوں کو بھرنے کے بعد پہاڑوں کی طرف بھاگتے ہوئے کئی ساتھیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ہمارے ٹرک سے علاوہ زخمیوں کی گاڑیاں تھیں اور سب سے زیادہ مریض ہمارے ٹرک میں تھے۔ ٹرک ڈرائیور اور ایک ساتھی کو مار پیٹ کر پیچھے بھیج دیا اور اب ازبک درندے خود ٹرک چلانے

لگے۔ انہوں نے خطرناک طریقے سے گاڑی چلائی۔ زخمیوں کی آہ و فغان بلند ہوتی رہی اور کئی خاموش ہوتے رہے۔ تقریباً دو بجے کے قریب کوتل یرکنک کے پیچھے ایک میدان میں کپڑوں اور کمبلوں کے ڈھیر کے پاس ہمارا ٹرک کھڑا ہو گیا۔ ہم سے تھوڑ دور ہٹ کر دوستم کے فوجی حلقہ بنا کر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ طالبان کے ایک مُلا صاحب نے فارسی میں بات کر کے ان سے پیشاب کرنے اور نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ بڑی منت وسماجت کے بعد اجازت ملی، ہم تقریباً چھ افراد نے نیچے اتر کر علیحدہ نماز پڑھی۔ دور سے مجاہدین قطاریں بنائے ہوئے پیدل چلے آ رہے تھے۔ مُلا فضل اخند کی گاڑی بھی چکر لگا رہی تھی کیونکہ اس دن دوستم امریکیوں سمیت ادھر آیا ہوا تھا۔ دوسری طرف قلعہ جنگی کے واقعے کا دوسرا دن تھا۔ قلعہ جنگی کا تو ذکر میڈیا پر آ گیا لیکن دشتِ یرکنک پر ساری رات بمباری اور پھر اس تقسیم ہونے کے دوران کا ظلم دوستم میڈیا کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔

تین بجے کے قریب ٹرک دوبارہ روانہ ہوا اور ہم کچھ ساتھی طالبان ساتھیوں کے ساتھ جو پیدل کوتل یرکنک کی طرف جا رہے تھے، شامل ہو گئے۔ ایک چڑھائی کے بعد پھر تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی جگہ پر کیمرے والے فلم بندی کر رہے تھے۔ مجاہدین سے پگڑیاں اتروا کر ان کے ہاتھ باندھے جا رہے تھے۔ شمالی درندوں کو جو چیز اچھی لگتی وہ اتروا لیتے۔ یہاں پر میرے ساتھ بھی عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک فوجی نے میرے بوٹ اتروا لئے اور اپنی ٹوٹی ہوئی جوتی دے دی۔ آگے چل کے تلاشی لینے والے نے دی ہوئی جوتی بھی اتروا کر اپنے پاس رکھ لی اور مجھے ننگے پیر چلنے کا کہا۔ میرے پاس موجود رومال سے میرے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیئے اور قریب ہی ایک کھائی میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ رمضان کا دسواں روزہ، نہ پانی نہ کھجور ایسے ہی گزر گیا۔ چوبیس گھنٹے ہو گئے کہ کچھ بھی کھایا پیا نہ تھا۔ رات انتہائی سرد تھی۔ وہاں پر ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ کھول دیئے۔ کئی ساتھیوں کے ہاتھ اتنے سخت بندھے تھے کہ خون کی گردش رکنے سے ہاتھ شل ہو گئے۔ سب ساتھیوں نے اپنی مرضی کے مطابق ہلکی گرہ لگا کر ہاتھ علامتی طور پر پشت پر باندھ لئے۔ ہمارے قریب ایک طالب نے اپنی چادر سب کے سروں پر ڈال دی لیکن باقی اطراف سے ہوا نہ رُک سکی۔ ہم سب نے مغرب اور عشاء کی نماز اسی جگہ تیمم کر کے اشاروں سے پڑھی۔ ننگے پیر ہونے کے سبب میرے دوست آصف نے اپنی جرابیں اتار کر دیں جو پہن کر گزارہ کیا۔ اس مقام پر ہزاروں کی تعداد میں مختلف کھائیوں میں بیٹھ کر رات گزاری، مسلح افراد

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہماری ذرا سی حرکت پر سیدھے ہو جاتے۔

ملا فضل نے چار افغان طالبان کو اپنے پاس بلایا اور انہیں تسلی دی کہ پریشان نہ ہوں، سب کچھ واپس مل جائے گا۔ ملا فضل کے آنے سے کچھ دیر پہلے دوستم کی فوج نے ہم لوگوں کے ہاتھ کھول دیئے۔ ملا فضل اخند قریب تشریف لائے اور ایک کھائی میں بیٹھے طالبان سے رقت آمیز تقریر کی کہ سب طالبان رونے لگے۔ ملا فضل اخند قریب تشریف لائے اور ایک کھائی میں بیٹھے طالبان سے رقت آمیز تقریر کی کہ سب طالبان رونے لگے۔ ملا فضل اخند نے کہا کہ ''ہم سب پر اللہ کا امتحان ہے اور انبیاء علیہ السلام کا بھی امتحان ہوا تھا۔ تم اطاعت کرو اللہ اسی میں خیر کرے گا، صبر سے کام لو''۔ دوستم ملا فضل کو اپنے ساتھ مزار شریف لے گیا اور ہمارے ہاتھ پھر باندھ دیئے گئے۔ رات اسی وادی میں کھلے آسمان تلے گزری۔ چاروں طرف سے پہرا تھا۔ پیشاب کے لئے بھی کسی کو اٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لشکر میں زخمی طالبان بھی تھے جن کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ناہموار زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ قریبی خشک نالے سے رات اس وقت زوردار چیخیں بلند ہوئیں جب چند زخمی پاکستانی مجاہدوں کو ازبک درندے گھسیٹ کر لے گئے اور انہیں نالے میں گرا کر اوپر مٹی اور پتھر ڈالتے رہے جو اٹھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے سر پر بڑے بڑے پتھر مارے جاتے اور ساتھ گالیاں دیتے ہوئے کہتے۔ بدمعاشو! امریکہ سے جہاد کرنے آئے ہو۔ اب تمہیں مزہ چکھاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد زخمی مجاہدین کی آوازیں دب گئیں۔

صبح تیمم سے نماز فجر پڑھی، بارہ ٹرک آئے، ان میں طالبان کو ٹھونس کر بھرا گیا جو رہ گئے انہیں پیدل چلنے کے لئے کہا گیا، ہم بھوکے اور تھکے ہوئے تھے۔ ہمیں تیز تیز چلنے کا کہا گیا جو پیچھے رہتے انہیں پتھر مارتے اور گالیاں دے کر ہانکا جاتا۔ ہمارے ساتھ زخمی بھی تھے۔ ہم انہیں کندھوں پر باری باری اٹھاتے، ان میں ملا عبدالرؤف ایک ٹانگ سے معذور بھی شامل تھے۔ ان کے باہمت ساتھی انہیں اٹھا کر صبر کے ساتھ صحرا میں چلتے رہے۔ کاروان امیر کا رخ مزار کی طرف تھا، بھوک اور پیاس زور پکڑتی گئی۔ چلتے ہوئے راستے میں جہاں کہیں گھاس نظر آتی انہیں توڑ کر کھاتے۔ اطاعتِ امیر کی وجہ سے اکٹھے چل رہے تھے ورنہ ہم تقسیم ہوتے وقت منتشر ہو کر چھپ سکتے تھے جب ہم قندوز میں تھے تو دوستم سے معاہدے کی بات سن کر بہت سے طالبان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ ہم کمزور نہیں کہ دوستم سے معاہدہ کر لیں۔ آخری دم تک لڑیں گے لیکن اطاعت امیر کی وجہ سے انہیں ہتھیار حوالے کرنے پڑے۔

صحرا میں تین گھنٹے پیدل چلنے کے بعد مزار کی جانب سے کچھ ٹرک آئے اور ان میں ہمیں ٹھونس کر سوار کیا۔ یہ ٹرک مزار شریف کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے بڑی بے دردی سے پھینکا جاتا۔ خراب راستوں نے تو آنتیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ ظہر کی نماز ٹرک کے اندر بیٹھے اشاروں سے پڑھی۔ تیمم اپنے کپڑوں پر کیا کیونکہ گرد و غبار سے کپڑے اَٹے ہوئے تھے۔ عصر کے وقت تاشقرغان پہنچے۔ وہاں پر سڑک پر صحافی کھڑے تصویریں لے رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے اکثر نے روزہ رکھنے کی طاقت نہ پا کر روزے توڑ ڈالے، مقامی لوگ پہلے سے ہی ٹرکوں پر سوار طالبان کو پانی پلا رہے تھے۔ گاڑیوں کے گرد مسلح پہرے دار چند خدا ترس پانی پلانے والوں کو گالیاں نکالتے اور انہیں مار کر خبردار کرتے کہ انہیں پانی مت پلاؤ۔ حتیٰ کہ پانی پیتے ہوئے منہ سے لگی کین چھین کر پھینک دیتے۔ مسلسل تیسرا دن تھا کہ سب ساتھی بھوک اور پیاس برداشت کر رہے تھے۔ اب ہماری گاڑیاں پختہ سڑک پر رواں تھیں۔ آگے پیچھے کئی ٹرکوں کی قطاریں لگی تھیں۔ مزار شریف شہر میں داخل ہوئے تو لوگ اپنی منڈھی داڑھیوں پر ہاتھ پھیر کر طالبان کو چڑا رہے تھے۔ عورتیں سر سے دوپٹے پھینک کر یہ احساس دلا رہی تھیں کہ ہم نے دوپٹے اُتار دیئے ہیں۔

مزار شریف جس مزار کی نسبت سے منسوب ہے وہاں ہر طرف چراغاں ہوا تھا۔ بلخ کے لوگ اس مزار کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن روایات میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ان کا مزار عراق کے شہر نجف میں ہے۔ مزار سے گزرتے ہوئے گاڑیاں مغربی جانب سڑک کے کنارے واقع قلعہ زینی رکی۔ قلعہ زینی ایک بہت بڑی موچی چھاؤنی ہے۔ اس میں پانی کے چھوٹے نالے بھی بہتے ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ قلعہ کچھ اس طرح بنا ہے کہ بڑی سڑک اس کے اندر سے گزر کر شبرغان جاتی تھی۔ قلعہ زینی کے اندر جا کر جب ٹرک رُکے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ ساتھیوں کا روزہ بغیر افطار گزر گیا۔ ٹرک میں بیٹھے ہی مغرب کی نماز اشاروں سے پڑھی۔ ٹرک ایک کنٹینر کے منہ پر رُکا اور اتحادی درندوں نے ایک بار پھر درندگی دکھائی۔ لاتوں اور گھونسوں سے ٹرک سے نیچے پھینکنے کا عمل ایک بار پھر شروع تھا جس کے ہاتھ کھلے نظر آتے اس بے چارے پر لاتوں اور مکوں کی قیامت ٹوٹ پڑتی۔ چار فٹ اونچے ٹرک سے دھکے دے کر پھینک دیا جاتا۔ ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے کئی ساتھیوں کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اسی تشدد کو جاری رکھتے ہوئے کنٹینروں میں پھینکا جاتا۔ اندھیرا مکمل طور پر چھا گیا تھا۔ ہم چند ساتھی انہیں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

منت کرتے رہے کہ مزید ساتھی داخل نہ کریں، ہماری تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے لیکن ایک نہ سنی، دروازہ بند ہوتے ہی قبر کی طرح خطرناک اندھیرا چھا گیا، ہر ایک کے پاس اپنی جسامت جتنی جگہ بیٹھنے کو ملی۔

آٹھ فٹ اونچائی اور آٹھ فٹ چوڑائی اور چالیس فٹ لمبائی والے ان کنٹینروں کی باڈی لوہے کی ہیوی گیج کی چادر سے بنی تھی۔ کنٹینر کا فرش سخت ترین لکڑی سے بنا تھا اور بعض لوہے کے فرش تھے۔ یہ کنٹینر اس قدر ایئر ٹائٹ (ہوا بند) ہوتے ہیں کہ لاک لگنے کے بعد کوئی ذی روح اس میں نہیں بچ سکتا۔ ان کنٹینروں کا داخلہ افغانستان میں روس کے قبضے کے دوران ہی شروع ہوگیا تھا۔ یہ کنٹینر اب ''گڈز کارگو کنٹینر'' کی بجائے انسان برادر کنٹینر یا چلتی قبروں میں تبدیل ہونے والے تھے۔ قبر نما اندھیرے میں دروازے کے قریب دائیں طرف جگہ ملی۔ میرے ساتھ بیٹھے دو طالبان ساتھیوں نے ٹارچ جلائی اور فرش پر لکڑی میں معمولی سا سوراخ نظر آیا۔ اس سوراخ کو دیکھ کر ان ساتھیوں نے اس کو بڑا کرنے کے لئے کہا۔ ان کی بات پر غور کرتے ہوئے ہم نے اعلان کیا کہ کسی کے پاس پیچ گس یا قینچی وغیرہ ہو تو دیدے۔ کنٹینر کے فرش میں سوراخ کرنا ہے۔ اسی اثناء میں دو عدد چھوٹی قینچیاں اور ایک چھوٹا سا پیچ گس ہاتھ لگ گیا۔ ضرب لگانے کی کوئی چیز نہ تھے۔ اس لئے اپنی ہتھیلی پر کپڑا لپیٹ کر استعمال کیا۔ اب سوراخ بڑا ہوتا گیا اور امید کے آثار پیدا ہوگئے کہ ہوا کہ آمد شروع ہو جائے گی۔ آدھے گھنٹے بعد کنٹینر میں حبس ہوگیا۔ اسی کنٹینر پر تیمم کر کے عشاء کی نماز اشاروں سے پڑھی، اور یہی سمجھا کہ یہ زندگی کی آخری نماز ہے۔ جلدی سے ادا کرلیں، تقریباً دو گھنٹے بعد انتہائی بُری حالت ہوگئی۔ سب ساتھیوں نے بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ کئی ساتھی سورۃ یٰسین پڑھنے لگے اور کنٹینر کی دیوار کے پاس بیٹھنے والوں نے کنٹینر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ یوں ایک شور سا بپا ہوگیا کہ کہیں ہمارے احتجاج پر ان درندوں کو رحم آجائے اور وہ دروازہ کھول دیں۔ ہم دو تین ساتھی جن میں بھائی بشیر بھی سوراخ بڑا کرتے رہے، ایک لوٹے کے بقدر سوراخ ہوگیا، لکڑی انتہائی سخت تھی اور اس کا بورا بھی ہم نیچے نہ گرنے دیتے کہ کہیں باہر پہرے داروں کو معلوم نہ پڑ جائے۔ جب ٹارچ جلائی تو آخری دو پہیے نظر آنے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ کئی ساتھی پیٹتے ہوئے بے ہوش ہوگئے۔ اس صورت حال میں سانس کی بندش کے وقت نکلتی چیخیں اگر یاد کریں تو اب بھی سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔ بچے کھچے ساتھیوں نے مزید شور بڑھا دیا تو باہر سے ظالم درندوں نے کنٹینر پر فائر شروع کر دی، کئی گولیوں کا نشانہ بن کر

زخمی ہوگئے۔ میری پشت کے پیچھے لوہے کی چادر سے سوراخ کرتی ہوئی گولی نکلی لیکن فائرنگ کی آواز سنتے ہی سب لیٹ گئے تھے، کئی ساتھیوں کو اللہ نے بچا لیا۔ کنٹینر کے دونوں اطراف پر آنکھوں کے بقدر سوراخ ہوگئے جس کے قریب یہ سوراخ تھے وہ ساتھی منہ کو اس سوراخ پر لگا کر ہلکی ہی سانس کو جسم میں داخل کرتے رہے، ساتھی وقفے وقفے سے باری بدل کر ان سوراخوں سے منہ لگا کر اپنی زندگی کی آخری رمق کو باقی رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمام آوازیں آہستہ آہستہ خاموش ہوگئیں اور تقریباً آخری دروازے والے حصے کے علاوہ پچھلا سارا حصہ بے ہوش ہوگیا۔ کنٹینر کے اندر نمی پیدا ہونے سے چاروں طرف لوہے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ چھت سے ایسے پانی ٹپکتا جیسے بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ پیاسے مجاہدین کنٹینر کی چھت سے پگڑی اور رومال کو مار کر گیلا کر کے اپنے اور دوسرے مجاہدین کے منہ میں وہ قطرے ٹپکا کر پیاس بجھانے لگے۔ کئی سخت تشنگی برداشت نہ کرتے ہوئے دیواروں سے لگے قطرے چاٹتے رہے۔ بے بسی کی آخری حدود بھی ختم ہونے کو تھی۔ بالآخر نصف شب کے بعد سوراخ کرتے ہوئے ہماری ٹارچ کی روشنی باہر پڑی۔ ایک پہردار آیا۔ اس کے ساتھ ایک ساتھی نے فارسی میں بات چیت شروع کی۔ تین دن کے بھوکے پیاسے اب تازہ ہوا کی بندش سے مزید پیاس محسوس کر رہے تھے۔ اس کنٹینر کا دروازہ کھولنے اور روٹی و پانی کا مطالبہ کیا۔ اس سوراخ کے قریب ہاتھ بڑھا کر فارسی میں بولا۔

''پل بیتی'' ''ڈالر بیتی روپے مدد۔ ڈالر ڈالی دو''۔ طالبان بھی ان کو منت کرتے رہے ''برادر جان، وطن دار''۔ لیکن وہ ڈالر کے بغیر اور کوئی بات کرنا ہی گوارہ نہ سمجھتے۔ ایک طالب نے اعلان کیا کہ سب باقی ماندہ رقم جمع کر کے ان کو دیتے ہیں اگر ہم شہید ہوگئے تو روپوں کا کیا کریں گے۔ ہزاروں پاکستانی اور لاکھوں افغانی روپے اکٹھے کر کے ان کو سوراخ سے دیئے۔ اس کے بعد پانی کے لوٹے بھر کر دیئے اور ڈرائیور سے کہہ کر انہوں نے آکسیجن چلا دی۔ ہم سب آکسیجن چلنے کے بعد گھبرا گئے، گیس کے دباؤ سے تیز آواز نکل رہی تھی جسے سن کر ہم سمجھے کہ ہمیں شہید کرنے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ اب انہوں نے زہریلی گیس چھوڑ دی ہے۔ دوبارہ کلمہ طیبہ کا ورد ہونے لگا لیکن یہ قیاس آرائی پانچ منٹ بعد اس وقت ختم ہوئی جب کنٹینر میں موجود حبس آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔ ہماری سانسیں جو آخری دموں کو چھو رہی تھیں دوبارہ بحال ہوگئیں۔ پورے کنٹینر کے بے ہوش ساتھی دوبارہ ہوش میں آ کر کھڑے ہوتے گئے اور حیرت سے سوال کرتے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ کچھ ساتھی دبنے کے بعد ہمیشہ کی سرفرازی حاصل کر چکے تھے، جن ساتھیوں کے پاس پاکٹ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نی ان کو جلا کر حالات دیکھتے رہے۔ ایک ساتھی لوٹا لے کر ایک سرے سے سب کو پانی دینے لگا۔ انتہائی پیاس والے بے قابو ہو کر لوٹے پر جھپٹ پڑتے تو ان کو پہلے پانی دے دیتے۔ ہمیں اتنا پانی مل گیا کہ سب ساتھیوں کی پیاس بجھ گئی۔ بے ہوش ساتھی پانی کے چھینٹوں کے بعد ہوش میں آ گئے۔ اسی اثناء میں اس سوراخ سے ایک ہاتھ بڑھا تو معلوم ہوا کہ دو تین روٹیوں کے ٹکڑے مل گئے جن کو سب ساتھیوں پر تقسیم کر دیا۔ اکثر نے ایثار کا جذبہ دکھایا اور روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے دوسرے ساتھی کو دینے کا اظہار کیا۔ آدھے گھنٹے بعد آکسیجن بند ہو گئی۔ سوراخ کو بڑا کرنے کا کام مزید جاری رہا۔ اس کے بعد رات کے وقت ہی کنٹینر میں ہتھوڑے کی ضرب لگنے کی آواز شروع ہوئی۔ دیکھتے ہی چھت کے قریب آنکھ کے بقدر سوراخ ہو گئے۔ ان سوراخوں پر بھی ساتھی منہ لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ سوراخ ناکافی تھے۔ ایک بار پھر حبس بڑھا تو شور پھر بڑھا۔ دوبارہ تھوڑی سی رقم دے کر صبح صادق کے قریب آکسیجن چلوائی جو چند منٹ بعد بند ہو گئی۔ گھڑی کے مطابق اشاروں سے نماز فجر پڑھی۔

تیسواں روزہ بھی بغیر سحری کے گزر گیا۔ انتہائی کسمپرسی نے رمضان المبارک کا مہینہ ہی بھلا دیا۔ ساری رات سوراخ کرتے رہے اور دن کی روشنی میں سوراخ اتنا بڑا ہو گیا کہ انسان اپنا سر اس میں داخل کر سکے۔

27 نومبر بروز منگل کو جب روشنی اچھی طرح پھیل گئی تو سوراخ کے قریب مسلح پہرے دار اکٹھے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ایک پہرے دار نے لٹکا ہوا رومال کھینچا اور فارسی میں غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ ان چھوٹے سوراخوں سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً دن کے دس بجے کے قریب رات سے بھی بڑھ کر حبس پیدا ہو گیا۔ رومال چلے جانے کے بعد اپنا سویٹر نیچے لٹکایا اور اس کے بازوؤں کو اندر رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سو پہرے دار دو تین بار سویٹر کھینچتے رہے لیکن ہم دو ساتھیوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا جس کے بعد پہرے دار نے تنگ نہ کیا۔ ان حالات کے ساتھ ساتھ ہمارا سوراخ کرنے کا کام جاری تھا۔ ہم باری باری سوراخ کرتے رہے۔ پیچ کس بھی ٹیڑھا اور قینچی بھی خراب ہو گئی۔ ایک بار پھر حبس کے شکار باقی ماندہ طالبان چیختے چلاتے بے ہوش ہو گئے۔ دن بارہ بجے کنٹینر ہلا جس کے ساتھ ہی ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہمارا پڑاؤ کہاں ہو گا۔ کنٹینر کچے پکے راستوں پر چلتا رہا، دونوں طرف صحرا نظر آتے۔ کئی تو کہہ رہے تھے کہ یہ شبرغان کے دشت لیلیٰ کی طرف لے جا رہے ہیں جس کی زمین طالبان علماء کے لہو سے پہلے بھی سیراب

ہوئی تھی۔ کنٹینر چلنے کے بعد سوراخوں سے اندر ہوا داخل ہوتی رہی اور ساتھی ہوش میں آنے لگے۔ خم کھاتے راستوں پر آگے پیچھے لمبی کنٹینروں کی قطاریں نظر آ رہی تھی، تقریباً تیرہ کے قریب چلتی قبریں، اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ ظہر کی نماز بھی اشاروں سے پڑھی اور کنٹینر تقریباً عصر کے وقت سے ایک آدھ گھنٹہ قبل شبرغان جیل کے باہر بڑی سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف مسلح ازبک درندے کھڑے سوراخوں سے نظر آتے، طالبان ساتھیوں نے جیل کو پہچان لیا کہ یہ شبرغان جیل ہے۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس قبر میں بند رہنے کے بعد بالآخر غروب آفتاب سے آدھ گھنٹہ قبل ہم شبرغان جیل کے اندر داخل ہوئے تو ہتھوڑے کی ضرب لگی، اچانک دروازہ کھلا تو نیم بے ہوش ساتھی روشنی دیکھ کر آہستہ آہستہ ہوش میں آتے گئے اور دروازے کی طرف لپکے، سب ساتھی اپنی جیکٹ، سویٹر اور قمیض وغیرہ اتار چکے تھے کیونکہ دھوپ کی تپش نے جسم کو گویا بھٹی بنا دیا تھا اور ہوش ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے کئی بغیر قمیض پہنے ننگے بدن اور ننگے پاؤں ہی کنٹینر سے اتر گئے، ایک نظر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو تقریباً دو سو کے قریب افراد میں ہم پچیس کے قریب ساتھی کنٹینر سے اترے اور کئی بے ہوش پڑے رہنے کی وجہ سے حرکت نہ کر سکے [illegible] دروازہ ان پر بھی بند ہو گیا اور کنٹینر جیل سے باہر چلا گیا۔ جیل کے اندر موجود [illegible] دوستم کے فوجی درندے ہم پر پل پڑے اسی طرح ہانکتے ہوئے جیل کے مرکزی دروازے سے دور ایک ہال میں لے آئے جو کہ انتہائی بدبودار اور بھیڑ بکریوں کی مینگنوں سے بھرا پڑا تھا۔ عصر کی نماز آخری وقت میں داخل ہونے سے پہلے ہی پڑھ لی۔ ابھی دو کنٹینر باقی تھے وہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے خالی ہوئے اور ہر کوئی اپنے دوستوں کو ڈھونڈ کر حال احوال پوچھنے لگا۔

امارت اسلامیہ کے سقوط پر جہاں سب نوحہ کناں تھے، ساتھ ہی قرآن مجید کی بے حرمتی کے متعدد واقعات نے بھی دل کو ٹھیس پہنچائی۔ قرآن کی بے حرمتی مزار شریف کے رضیہ سلطان گرلز سکول سے شروع ہوئی جب کئی شہید سینوں سے قرآن کو لگائے جام شہادت نوش کرتے رہے اور شمالی درندے ان لاشوں اور بمباری زدہ عمارت کے ڈھیر تلے ان شہیدوں کو روندتے رہے۔ حتیٰ کہ قلعہ جنگی میں لڑائی کی اصل وجہ ہی قرآن کی بے حرمتی بنا اور اس پر بھی بس نہ تھی کہ جب قندوز سے اہل حق کا آخری قافلہ انخلاء کرتے ہوئے ہرگنک کے دشت میں تسلیم ہوا تو ہزاروں کے لشکر میں سینکڑوں علماء اور حفاظ کے پاس قرآن موجود تھے لیکن دوران تلاشی شمالی درندے قرآن پاک کو بھی جیبوں سے نکال کر پھینکتے رہے اور جب شبرغان جیل میں پہنچے تو قرآن کی بے حرمتی کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کوئی واقعات بھی ساتھیوں نے بتائے جو کہ ہر ایک کی زبان پر تھے، یوں تاریخ میں چنگیز خان کی اولاد نے اپنے جد امجد کے کردار کو دوبارہ دہرایا جو بغداد پر قبضے کے بعد ادا کیا تھا۔

بے ہوش زندہ اور شہیدوں کے بھرے کنٹینر دوستم کے درندے جیل سے باہر نکال کر دشت لیلیٰ لے گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ ان سب کو بڑے بڑے گڑھے کھود کر دفنا دیا گیا اور کئی ہزاروں کی تعداد میں شہادتیں ہوئیں حتیٰ کہ ساتھیوں نے بتایا کہ دو سو سے زیادہ افراد بھی کئی کنٹینروں میں شہید ہوئے۔

ایک لمبی قطار میں ڈنڈوں اور کیبل کے سائے میں چلتے ہوئے "برو (جاؤ) تیز شو (چلتے رہو)" کی آوازیں سنتے جا رہے تھے۔ خستہ حالت پانچ دن کی بھوک اور پیاس سے پورے جسم کو گویا بے جان سا بت بنا رکھا تھا، گرتے لڑھکتے چند قدم کا فاصلہ کئی میل محسوس ہو رہا تھا۔ آخر ایک چھوٹے دروازے کے بعد پھر ایک دروازہ آیا۔ یوں تین بلاک دائیں بائیں اور ایک بالکل سامنے بلاکوں کے باہر ملحقہ صحن میں بے کس و مظلوم طالبان کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ معلوم تو ہو گیا تھا کہ ہم شبرغان جیل میں ہیں لیکن اب اپنی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیا۔

شبرغان جیل افغانستان کے شمالی صوبے جوزجان کے شہر شبرغان میں واقع ہے، یہ جیل 1920ء میں روس کی شمالی افغانستان کی تعمیرات کے دوران بنی۔ اس جیل کے بڑے دروازے سے داخل ہونے کے لئے دو دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جیل کے داخلی دروازے کے اوپر بھی کمرے بنے ہوئے ہیں اور اس کی چھت بطور مورچہ استعمال ہوتی تھی۔ اس کے چاروں طرف مٹی کی تقریباً چار فٹ موٹی دیوار بطور فصیل اور ان دیواروں پر لوہے کی تاروں میں بجلی گزاری گئی تھی۔ جیل کے چاروں کونوں پر حفاظتی برج بھی بنائے گئے ہیں جو کہ اپنی اونچائی کی وجہ سے جیل کے اندر کی تمام حرکات کے جائزے میں سہولت فراہم کرتے ہیں۔ بڑے بڑے دروازے سے داخل ہونے کے بعد دائیں ہاتھ چند کمرے اور ان کو عبور کر کے زنانہ محبس کے آٹھ کمروں پر مشتمل بلاک اور بائیں طرف مدیریت جیلر اور استخبارات (انٹیلی جنس) کے دفاتر ہیں۔ ان سے چند قدم پر جیل کا چھوٹا سا شفاخانہ (ہسپتال) اور پھر اس کے ساتھ ہی کرہ خانہ بالغ لڑکوں کے لئے بنائے گئے دو بلاک ہیں، بڑے دروازے کو جانے والی سڑک سیدھی بلاکوں کی طرف جاتی ہے لیکن چند قدم سیدھے چلنے کے بعد ایک دروازہ اور اس کے دائیں طرف مطبخ بنا تھا۔ اس دروازے کو پار کرنے کے بعد دورویہ شہتوت کے درخت وقفے وقفے پر لگے تھے اور اسی

بائیں طرف بڑا میدان جو بعد میں فٹ بال گراؤنڈ بن گیا، موجود تھا۔ چلتے ہوئے بائیں طرف چونے کی بھٹیاں اور ان سے آگے گھنے درختوں کی چھاؤں میں گدلے پانی کا ایک بڑا تالاب موجود تھا جو کہ جیل سے باہر چلنے والی نہر کے پانی کو اندر سے گزار کر بنایا گیا۔ یہ صوبہ سری پل سے آنے والی نہر کا پانی تھا۔ بلاک میں داخل ہونے سے پہلے بھی کمرے بنے تھے۔ ایک دلچسپ بات کہ شبرغان جیل کے بلاک اس طرز پر بنے ہیں کہ اگر آپ اس کے نقشے کا فضائی جائزہ لیں تو ہو بہو عیسائیوں کے صلیب والا نشان بن جاتا ہے۔

ان بلاکوں سے ملحقہ صحن میں ہمارے داخل ہونے کے ساتھ ہی کالی اور سفید پگڑیاں بکھری پائی گئیں، کئی جگہ پر کیچڑ میں لت پت پگڑیاں بھی نظر آئیں۔ یہ پگڑیاں دوستم کے درندوں کی سفاکی کا پتہ دے رہی تھیں اور وہ جس مجاہد طالبان کو کالی یا سفید پگڑی یا رومال پہنے دیکھتے تو پہلے مار پیٹ اور بعد میں وہ پگڑی یا رومال چھین کر پھینک دیتے۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم جو طالبان سر پر سجاتے تھے۔ ان درندوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے اسے چھپا چھپا کر رکھ رہے تھے کہ سنت رسول کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ بلاک کے صحن تک بانپ کر لانے والے سفاک واپس چلے گئے اور کمروں کی چھت پر بھی پہرہ داروں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ سورج نے پھر آج کے دن کو لانے والے ظلم و ستم کو دیکھتے دیکھتے منہ چھپا لیا۔ اب تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا کہ کیبل اور ڈنڈا برادر کڑکتی آوازوں میں سب کو بلاکوں میں داخل کر رہے تھے۔ تڑاک تڑاک کی آواز کے ساتھ ہم پر بلاک کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ دروازے پر جیل کے افسران معائنے کے لئے آئے تھے اور طالبان سے پشتو اور فارسی میں یہ کہہ رہے تھے "تم ہمارے مہمان ہو اور جلدی ہی تم اپنے گھروں کو چلے جاؤ گے"۔

بے بس طالبان یہ کلمات سن کر زبان حال سے نہ سہی مگر دل میں یہ ضرور کہہ رہے تھے کہ "بڑی اچھی خاطر تواضع دیکھی، پانچ دن کے بھوکے پیاسے مہمان کو ایک نوالہ روٹی نہ دینے والے اور ایک گھونٹ نہ پلانے والے معلوم نہیں کس زبان سے خود کو میزبان ظاہر کر رہے ہیں۔ کیا تم اس کہاوت "قہر افغان رحم از یک" کو زندہ کرنے کے لئے کہہ رہے ہو کہ یہ ہے ہم دوستوں کی مہمان نوازی، تم ہمارے خلاف جہاد کرنے آئے تھے۔

مہمان نوازی اسی پر ختم نہ تھی بلکہ جب بلاکوں کے اندر کمروں میں داخل ہونے لگے تو تمام کمرے بالکل بھرے پڑے تھے۔ کمروں میں ہر فرد کے لئے اتنی جگہ تھی کہ وہ اکڑوں بیٹھ سکے اور

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پیروں کو لمبا کرنے کی تو بالکل جگہ نہ تھی۔ ایک کمرے میں ہمیں بھی جگہ مل گئی اور شکر ادا کیا کہ سر چھپانے کا ٹھکانہ تو ملا ورنہ سردی تو اپنے جوبن پر تھی، اس کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی اور ٹوٹے پھوٹے دروازے کی طرف ٹھنڈے ہوا کے جھونکے آتے۔ مٹی نما فرش سے بھیڑ بکریوں کے فضلاء کی بدبو آ رہی تھی۔ تاریکی اس قدر سخت تھی کہ کمرے میں بیٹھے اپنے ساتھ والے کا چہرہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ خیر رات جوں توں گزری علماء حضرات اور طالبان کے کمانڈر مختلف گروپوں میں تقسیم ہو کر ہر اوطاق (کمرے) میں جا کر مجاہدین کو صبر و استقامت کی نصیحتیں کر رہے تھے۔ ان حالات میں ایسے درد اور کرب سے بیان کرتے کہ سب طالبان دھاڑیں مار کر رو دیتے، علماء حضرات ان تکالیف کو جب قرآن و حدیث کے مطابق کھولتے اور اس پر ملنے والے اجر اور خوش خبریاں سناتے تو ساری بھوک و پیاس اور دل کے غم اور مایوسی کا غبار نکل جاتا۔ آنسوؤں کے بے تحاشہ سمندر نہ صرف سختی اور تکلیف سے تھے بلکہ ہر ساتھی کی عاجزی اور کمزوری کے مقابلے میں عظیم ترین امتحان سے معجزانہ طور پر گزرنے کے احساس سے پُر تھے۔ ایمان کی سلامتی اور عافیت کی دعائیں ان حالات میں اکثر نکلتی تھیں۔ صبح ہوتے بادلوں سے ڈھکا ہوا شبرغان سردی کی شدت میں مزید اضافہ کرنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا جسموں کو تیزے کی اَنی کی طرح چیرنے لگی۔

تقریباً صبح نو بجے کے قریب دروازے پر ایک شخص آیا اور پشتو میں ہمارے کمرے کے امیر کو بلایا: ساری رات سردی ٹھنڈ سے گویا ہاتھ پاؤں اور پورا جسم سن تھا۔ اس شخص کی گفتگو کی طرف دھیان نہ تھا لیکن جب پشتو بولتے ہوئے ''ڈوڈی'' روٹی کی آواز پڑی ''لو بھائی!؟ ظالموں نے کچھ روٹیاں دی کہیں''۔ امیر صاحب بھی اس کے قریب افراد میں چند روٹیوں کو تقسیم کرنے پر پریشان تھے۔ بیٹھے بیٹھے ساتھیوں میں گروپ بندی ہو گئی، جب آٹھ آدمیوں نے ایک روٹی کا سنا تو پہلے والے احساس خوش پر پانی پھر گیا لیکن پھر ماتھا ٹھنکا اور ہوا یہی تو اصل آزمائش ہے۔ سب ساتھی فراخدلانہ وعظ اور صبر کا درس دیتے نظر آتے سورۃ یٰسین کی تلاوت کر کے روٹی پر دم کیا کرتے جس سے اللہ رب العزت ایک نوالے سے سب کا پیٹ بھر دیتے۔ آزادی میں اکثر علماء کرام سے سنتے رہتے تھے کہ ''روٹی پیٹ بھرنے میں اللہ کے حکم کی محتاج ہے، روٹی پیٹ نہیں بھر سکتی''۔ اس بات کا عین الیقین ہو گیا کہ واقعی اللہ کے حکم سے ایک نوالے پر چوبیس گھنٹے گزار سکتے ہیں اور بغیر پانی کے بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکل کر بلاک کی صورت حال کا جائزہ لینے کی ٹھانی، شبرغان جیل والے مہمان مجاہدین اگلی صبح کے ایک نوالے اور دو گھونٹ پانی کے انتظار

کی گھڑیاں گن رہے تھے کہ خدایا! کب صبح ہو گی اور یہ معمول کئی ماہ تک رہا۔

اس دن عصر سے پہلے مزید چلتی قبریں شبرغان جیل کے باسیوں میں اضافہ کے لئے آ گئیں، پہلا سٹاپ شبرغان جیل کا اور دوسرا دشتِ لیلیٰ کا قبرستان تھا جو چند سال پہلے بھی طالبان کا مقتل اور مدفن بنا تھا اور بعد میں طالبان نے اپنے قبضے کے دوران دشت لیلیٰ کو شبرستان کے خصوصی مقام کی حیثیت دی تھی۔ ہر مرتبہ آنے والے ساتھیوں کا استقبال ڈنڈوں اور کیبلوں سے ہوتا تھا۔ تینوں بلاکوں میں زخمیوں کی کافی تعداد موجود تھی، ان کے لئے ہر بلاک میں علیحدہ کمرے مخصوص تھے اور کچھ ساتھی ان کی خدمت کے لئے ہر وقت موجود رہتے۔ شبرغان کے شہر کے ہسپتال سے ڈاکٹروں کی ٹیمیں آئیں اور صرف زخموں پر پائیوڈین لگا کر اور پٹی کر کے چلے جاتے۔ غرض یہ کہ زخم کے لئے نہ مرہم نہ دوا، اسی حالت میں زخمی آہ و بکا کرتے رہتے۔ جس جیل میں روٹی کا نوالہ اور پانی کے دو گھونٹ بروقت نہ ملتے ہوں وہاں ان بے چارے مریضوں پر کیا گزرتی ہو گی۔ کئی ساتھی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو جاتے اور کئی ایسے بھی تھے کہ ان کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اب زندہ درگور ہمارے درمیان موجود تھے۔

جیل کے حالات دیکھنے کے لئے وہاں پر ملکی اور غیر ملکی میڈیا کا تانتا لگا رہتا۔ بڑے بڑے جدید کیمرے اور دور مار کرنے والے مائیکروفون لئے کئی یورپی اور امریکی صحافی بلاکوں سے ملحقہ صحن کے ساتھ کمروں کی چھتوں پر موجود تھے۔ امریکی فوجی تو اول روز سے ہی شبرغان جیل میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور شروع دنوں میں امریکی کمانڈوز چھت پر سے روٹیاں پھینکتے اور بھوکے پیاسے مجاہدین کو ترسانے کے ساتھ ساتھ قہقہے لگا کر اپنی تسکین کا سامان کرتے۔ مجاہدین کی اکثریت کے لئے یہ کٹھن تجربہ تھا۔ دوسری طرف دوستم کے جیل حکام ڈھٹائی سے جھوٹ بول کر خوش ہوتے، جس میں جیل سپرنٹینڈنٹ جوہر بیگ پیش پیش تھا۔

شبرغان جیل کے کھڈے اور چھوٹی کھولیاں کھچا کھچ بھری تھیں۔ حشرات الارض میں جوؤں کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھی جہاں پر انسانوں کو ایک نوالہ چوبیس گھنٹے بعد ملتا ہو، وہاں پر کیڑے مکوڑے کیا خاک بسیرا کریں گے۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر کے مجاہد جیل میں موجود تھے۔ پشتون حضرات پہلے اور پھر بالترتیب پنجاب، سندھ، اور آزاد کشمیر کے ساتھی تھے۔ ان میں ڈاکٹر، سکولوں کے اساتذہ، یونیورسٹی اور کالجوں کے طالب علم، تاجر، سیلز مین، زمیندار اور ڈرائیور گویا سب کے سب ایک دوسرے سے گھل ملے گئے تھے۔ گو شبرغان جیل میں مختلف طبقے قوم اور زبان

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کے افراد کے مجموعے نے اس بلاک کو خالص پاکستانی طالبان کا بلاک بنادیا تھا۔ ایک مولانا اکثر کہا کرتے تھے کہ ''شبرغان جیل اصل میں ایک لیبارٹری ہے اور اس لیبارٹری میں کھرا کھوٹا الگ الگ ہوجائے گا۔''

مالاکنڈ ڈویژن کے ساتھی جو مزار شریف سے پکڑے گئے تھے، چند روز ان بلاکوں میں رہنے کے بعد جیل کے اندر موجود زنانہ بلاک منتقل کردیے گئے۔ ان میں تقریباً سو کے قریب سفید ریش تھے۔ سب کے سب تہجد گزار اور راتوں کو رونے والے عظیم بوڑھے مجاہد تھے۔ چند روز بعد صوبہ فاریاب سے پکڑے جانے والی تبلیغی جماعت کے سات افراد کو بھی ہمارے ساتھ بند کردیا۔ سخت برف باری کے دنوں میں اکثر اوقات جیل کا عملہ تمام قیدیوں کو بلاک سے باہر نکال کر گنتا۔ اس دوران جیل کے صحن میں برف جمی رہتی اور ننگے پیر اکثر ساتھی اس فرش پر کھڑے رہتے، ہاتھ پاؤں سن ہوکر جسم کا حصہ ہی معلوم نہ ہوتے۔ گنتی کے خاتمے پر ساتھی ننگے پیر والوں کا مساج کرتے ان کو گرم کرتے تو پھر خون گردش کرتا۔

جیل میں سب سے اہم مسئلہ پانی کا تھا۔ اس کے بغیر بڑی دشواری تھی۔ شبرغان شہر سے فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی چوبیس گھنٹے میں آتی اور پانی پہنچاتی۔ اس پانی میں پٹرول کی بدبو ہوتی اور خس و خاشاک سے بھرا ہوتا۔ مشکل حالات میں بھی اس پانی کے پینے کو کجا استنجا کرنے کو بھی دل نہ کرتا۔ ہر بلاک کے اندر دروازے کے قریب دو ڈرم رکھے ہوئے تھے جن کو فائر بریگیڈ والی گاڑی کے طویل پائپ کے ذریعے بھرا جاتا۔ جیل کے صحن میں ایک کونے کی طرف دو ڈرم پانی گرم کرنے کے لئے رکھے تھے۔ جہاں سے کبھی تھوڑا سا گرم پانی یا قہوہ جیل حکام کی مرضی سے مل جاتا، جیل کے عملے نے ایک قیدی کو روٹی کے بہانے روپیوں پر پانی بیچنے کے لئے رکھا تھا۔

ریڈ کراس کے مسٹر جوزف کی سربراہی میں آنے والی ٹیم نے شبرغان جیل میں دسمبر کو رجسٹریشن کے بعد مستقل ڈیرہ ڈال دیا اور زندگی میں پہلی دفعہ ان سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کے عملے کے ہر فرد نے اپنی جیب پر سینے کی طرف ریڈ کراس والا صلیبی کارڈ لگایا ہوا تھا اور یہ جب بھی آتے تو فرداً فرداً ساتھیوں سے مشکلات معلوم کرتے اور اپنی کاپی پر لکھ لیتے۔ جیل کے اندر بڑے دروازے کے ساتھ بنے کمروں میں باقاعدہ طور پر انہوں نے اپنا دفتر بھی بنایا جس کی دیواروں پر اپنی تحریک کے پوسٹر آویزاں کیے تھے، اس دوران انہوں نے اپنے طور پر چھاپے ہوئے خط کے کاغذ بھی دینے اور تمام ساتھیوں کو گھر میں خط لکھنے کا کہا گیا، جس میں گھریلو باتوں کے علاوہ کسی قسم

کی بات لکھنے کی اجازت نہ ہوتی، کئی ساتھیوں نے تو کاغذ پھاڑ ڈالے اور کئی ساتھیوں نے ان کاغذوں کو پلیٹ کے طور پر چاول کھانے کے لئے استعمال کیا اور کئی نے ان میں حکیمی اور دیسی نسخے اور رنگا رنگ کے کھانوں والی ڈشوں کے بنانے کے طریقوں سے بھر لیا۔ الغرض ریڈ کراس والے ہمیں اپنا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ انہیں دنوں ایک افغانی ترجمان سے پوچھا! خط کتنے دن بعد گھر پہنچے گا؟ جواب میں دو ماہ کا بتادیا۔ اس بات سے اندازہ ہوا کہ ہماری آج کل رہائی والی خبریں بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں کیونکہ جھوٹی تسلیوں نے کافی الجھن میں ڈال رکھا تھا اور نفسیاتی طور پر ہمیں بھرپور اذیت پہنچائی جاتی لیکن بلاک سے متصل بیت الخلا کے قریب کسی نے ایک فقرہ لکھا تھا۔ ''یہ وقت بھی گزر جائے گا'' جو کہ شبرغان جیل والوں کے لئے ایک محاورہ بن گیا بلکہ ہر ایک کی زبان پر اکثر جاری رہتا۔ یہ معمولی فقرہ ذہن میں لانے سے تمام مشکلات اور نفسیاتی دباؤ ختم ہوجاتا۔ ریڈ کراس والوں نے چھوٹی عید کے بعد تک کا وقت خط لکھنے کے لئے دیا۔

عید سے پہلے استخبارات والوں کی ٹیم آئی اور سرسری تحقیق شروع کی جو کہ نہایت ہی بداخلاق تھے، ایک ایک قیدی کو بلا کر تحقیق کی جاتی، قیدیوں سے مختلف سوالات پوچھتے کہ تم کیوں آئے؟ کس عالم نے جہاد کا فتویٰ دیا؟..... جہاد میں کتنا عرصہ ہوا؟.. رشتہ داروں کا پوچھتے، مکمل نام و پتہ لکھ لیا اور آئندہ جہاد نہ کرنے کی نصیحت کرتے ملا عمر اور اسامہ کو برا بھلا کہتے اور اکثر اپنی ڈاڑھیوں کی طرف مخاطب ہوکر کہتے دیکھو ہم نے طالبان کے ختم ہونے کے بعد ڈاڑھی مونڈھ دی ہے۔ لہٰذا تم بھی کٹوا دو اب طالبان ختم ہوگئے ہیں۔

14/ دسمبر بروز اتوار صبح بادلوں کے سائے میں عید آئی جیل حکام کی جھوٹی تسلیوں کے باوجود عید کے روز رہائی نہ ہونے پر اکثر پر غموں کے بادل چھا گئے، آزادی والے کپڑے اور جوتے خرید چکے تھے لیکن شبرغان جیل کے اکثر مجاہدین کو نہ جوتی نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا نصیب تھا۔ بیس دن گزر رہے نہ پیٹ چند نوالوں سے زیادہ کھا سکا اور نہ سینے کی آگ چند گھونٹوں سے بجھ سکی۔ 27/ رمضان کو پوری روٹی ملی تھی جس کی سب نے خوشی منائی مگر وہ بھی دوسرے بلاک والوں کو کم روٹی دے کر ہم کو دی، یہی ڈرامہ ہمارے ساتھ بھی ہوتا۔ جیل میں موجود ذمہ دار حضرات کی طرف سے عید کے دن ایک بسکٹ کا پیکٹ اور چھوٹا کیک ملا۔ انتہائی بھوک کی حالت تھی اس لئے وہ اب تک نہیں بھولا۔ جیل کا عملہ بھی عید کی مبارکباد دینے آیا مطبخ کا انچارج اکرم خان ہر کمرے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں ''اختر مبارک'' کی آواز لگاتا اور ساتھ ہی یہ کہتا کہ آج آپ کے لئے عید کی خوشی میں پلاؤ آرہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی چہرے خوشی سے کھل اٹھتے کہ کافی دن بعد آج پلاؤ ملے گا۔ چاول کے طشت کو دیکھ کر ہی یقین آیا، ساتھی ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیتے، عید کے روز بزم بھی ہوئی جس میں نظمیں بیانات اور درد کر دعائیں بھی مانگی گئیں۔

صدیوں پرانی روایات بھی مجاہدین شبرغان ہی پر زندہ ہوئیں جس میں کچھ درپیش احوال کا تذکرہ ضروری ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی دنیا میں چلا جائے، اسے بنیادی طور پر کچھ چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان میں لباس ایک اہم مسئلہ ہے۔ شبرغان جیل والوں کی اکثریت نے ایک جوڑے پر ہی کئی مہینے گزارے، جس کے پاس چادر ہوتی آدھی نیچے بچھالیتا اور آدھی اوپر اوڑھ لیتا۔ وہی چادر مصلے، دھوتی، پردہ وغیرہ کا کام دیتی، تقریباً آدھے سے زیادہ مجاہدین کئی ماہ ننگے پاؤں پھرتے رہے۔ درختوں کے پتے اور گھاس پیٹ بھرنے کے لئے استعمال ہوئی، سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو کر کھایا جاتا۔ حیرت والی بات یہ ہے کہ پانی پینے کے لئے کوئی مستقل برتن کئی ماہ نہیں تھا اور چاول بھی اتنے ملتے کہ تقسیم ہونے کے ہاتھ پر رکھ کر کھا جاتے بسکٹ کے خالی پیکٹ اور پرانے شاپر بطور پلیٹ استعمال ہوتے۔ پلاسٹک کے لفافے کی قدر سو کے نوٹ جتنی تھی۔ اکثر ساتھی اپنے ہاتھوں کو اور روٹی کو پلیٹ بنا لیتے تھے۔ بارٹر سسٹم (چیز کے بدلے چیز کا تبادلہ) یا بغیر روپوں کے تجارت کا اصول رائج ہو گیا تھا۔ رقم ہر کسی کی پاس تو نہ تھی لیکن جو بھی سامان ریڈ کراس یا دوسری تنظیمیں استعمال کے لئے دیتی، ضرورت سے زائد اور اکثر کسی دوسری چیز کے حصول کے لئے وہ دے دی جاتی اور اپنی مطلوبہ چیز حاصل کی جاتی، بالفرض کسی ساتھی کو چادر کی ضرورت ہوتی تو وہ دوسرے کو اپنی جیکٹ یا سویٹر دے دیتا از بک عملہ بھی ملنے والی چیزوں کے بدلے بازار سے چینی، نسوار، پرمٹ اور نمک وغیرہ لا کر دیتا۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت نمک بن گیا تھا۔ جیل کا عملہ جان بوجھ کر چاول میں نمک نہ ڈالتا اور وہی نمک لا کر طالبان کے ہاتھوں چیزوں کے بدلے بیچتے، شبرغان جیل کا شاید ہی کوئی قیدی بچا ہو جس نے بارٹر ٹریڈ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ ایسا نہ کیا ہو کیونکہ یہی وقت کی ضرورت تھی، اگر اسے نصرت الٰہیہ کہیے تو بہتر ہوگا، ورنہ پانی کی عدم موجودگی میں صابن اور بھوک پیاس میں دوسری اشیاء کی زیادتی کو کوئی کیا کرتا۔ کئی ساتھی پیک صابن گنتی کی وقت بیت الخلاء میں پھینک دیتے کیونکہ گنتی کے وقت تلاشی میں استعمال شدہ صابن بھی عملہ نہ چھوڑتا، سب کچھ چھین لیتے۔

دن رات بغیر بجلی کے گزارتے رات کے وقت تو انتہا ہو جاتی۔ سردی اور برف باری نیند میں خلل ڈالتی تو دوسری طرف ساری رات ''او بھائی مار ڈالا اللہ تجھے ہدایت دے'' کی آوازیں سننے کو ملتیں اور آئے روز کبھی خود بھی رات کے کسی حصے میں یہ الفاظ کہنا پڑتے۔ کیونکہ اندھیرے میں کھڑے ہونے سے پاؤں کسی نہ کسی ساتھی پر ضرور آ جاتے۔

پرانے زمانے میں پتھروں کو رگڑ کر آگ جلانے کا کام لیا جاتا تھا لیکن شبرغان جیل والے پتھروں کو ہتھوڑے کے لئے استعمال کرتے۔ ریڈ کراس والے پائپ فٹنگ کے دوران سریے اور کلیاں دیواروں میں لگاتے لیکن دوسرے دن وہ سلاخ چھینی بن جاتی جو زمین کی کھدائی اور پکی دیواروں میں سوراخ کرنے کا کام آتی، مطبخ میں روزانہ گئی ٹین گھی کے استعمال ہوتے، خالی ٹین لے دے کر بیرک میں پہنچ جاتے۔ اگر اس میں سوراخ ہو جاتا تو ضائع کرنے کی بجائے فرائی پین یا شلف بن کر اس پر کتابیں اور دوسری چیزیں رکھی جاتی۔ غرض معمولی سی چیز بھی کام میں لائی جاتی۔ پنسلوں کے سکے ختم ہونے پر اس کے خول تین پنسلوں والے ازار بند بنانے کے کام آتے۔ شروع میں چائے کی پتی انتہائی قلت کی بنا پر استعمال ہونے کے بعد دھوپ میں اس کے پتے دوبارہ ترو تازہ کر کے چائے بنا لیتے یوں پتی چار مرتبہ تک استعمال ہوتی رہتی، وہ قہوہ کا ہی طرف دل بہلانے کے لئے گرم پانی کی معمولی رنگ بدلنے پر پی لیتے۔

جنرل دوستم کے زیر قبضہ شبرغان کے صد بستر ہسپتال میں بھی زخمی عرب اور خارجی مجاہدین کو تقریباً دس دن بعد منتقل کیا گیا، وہ بھی سب مجاہدین کے کہنے پر کیونکہ ساتھیوں سے اپنی آنکھوں کے سامنے سسک سسک کر شہید ہونے والے مجاہدین کا حال نہ دیکھا جاتا اور بڑے کمانڈر حضرات نے بھی جیل انتظامیہ کو اصرار کے ساتھ انہیں علاج کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ انہیں شفاخانے میں ایک علیحدہ چھوٹے دو منزلہ بلاک میں کڑے پہرے میں رکھا گیا۔ اس میں دروازے کی دائیں طرف ہسپتال کے ازبک عملے نے ایک کمرہ مخصوص رکھا تھا۔ جہاں پر وہ چاول کھانا وغیرہ پکاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دو بیت الخلا موجود تھے۔

اس چھوٹے بلاک کے چند کمروں پر مشتمل نچلی منزل پر ہمارا کمرہ تھا جس میں خالد، مستان خان، آصف، میں اور ایک افغانی تھا۔ ہمارے ساتھ والے کمرے میں ایک ترکی کا مجاہد اور باقی طالبان تھے اور بائیں طرف سے پہلا کمرہ جس میں کچھ مالا کنڈ ڈویژن اور عربی مجاہد تھے، پھر اس کے ساتھ ایک کمرے میں ایک افغانی اور باقی عرب مجاہد تھے، اسی طرح تیسرے میں اور چوتھے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں ایک قفقاز کا چیچن مجاہد، باقی پاکستانی اور اسی طرز پر دوسری منزل بھی تمام کمروں میں ملے جلے مجاہد زخمی حالت میں تھے۔ کیونکہ شبرغان جیل سے ان زخمیوں کو بُری طرح گاڑیوں میں لاد کر پھینک دیا گیا اور جیل کے عملے کو بھی پہچان نہ تھی کہ اس میں عرب اور غیر ملکی علیحدہ کر لیتے، بہر حال اس بلاک میں 54 غیر ملکی اور ملکی مجاہد تھے اور عرب زیادہ تعداد میں تھے۔ اس بلاک کا ایک دروازہ تھا جو کہ ہر وقت مقفل رہتا اور اس کے باہر مسلح پہرے دار کھڑے رہتے۔ ہر روز یورپی اور امریکی صحافیوں کی ٹیمیں ادھر کا چکر لگاتیں اور ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ وہ عرب مجاہد سے انٹرویو لے، کئی ملے جلے سوالات صحافی پوچھتے رہتے۔ ہمارے بلاک میں ایک بخاری تھا اور جب ہم اسے کمانداں کہا کرتے تو وہ مزید خوش ہو جاتا۔ اس کا نام معلوم نہ تھا البتہ ہم اسے شہاب کماندان کہتے تھے تو وہ اس پر بھی خوش ہو جاتا کہ جو مرضی سہی میری ذات تو کماندان ٹھہری۔

امریکی ایف بی آئی جس طرح خفیہ طور پر شبرغان جیل کے چکر کاٹتی، اسی طرح وہ شفاخانے میں بھی چکر لگاتی اور ان کے کہنے پر ہی کئی چلنے پھرنے والے زخمیوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال گئیں اور کئی بستر کے ساتھ بھی زنجیر سے بندھے رہتے۔ ایک دن ہسپتال میں شور شرابے کو سانپ سونگھ گیا اور جیسا کہ چھٹی والے دن ہوتا ہے۔ پورے ہسپتال کے باہر سیکورٹی الرٹ کر دی گئی اور خاص کر اس بلاک کی طرف بھی مسلح افراد کے اضافے کھٹکا لگا، نامعلوم آج کیا ہونے والا ہے اس صورت حال کے چند گھنٹے بعد امریکی ایف بی آئی اپنے فوجی دستے سمیت آئی اور بلاک سے دور کھڑے ہو کر وہ صورتحال کا جائزہ لیتے رہے وہاں کے عملے کو انہوں نے بتایا کہ ہم زخمی مجاہدین کی تحقیق کرنے اور دیکھنے آئے ہیں، اس لئے آپ ان تمام کمروں کی اچھی طرح تلاشی لے لیں، ڈرے ہوئے امریکی رنل سے بھی ڈرنے والی حالت میں بلاک میں داخل ہوتے ہی اسلحہ تان لیتے، ان کے ساتھ چند ایجنٹ زخمیوں کے پاس پہنچ کر ان کے زخم کو دیکھ کر اس زخمی کا نام، ولدیت لکھتے رہے اور ہمارے زخمیوں کو زخمی حالت میں کھڑا کر کے زنجیروں سے بندھے چلنے کا حکم دیتے اور سب کی حرکت کہ وہ زخمی حالت میں چلنے کے قابل ہیں یا نہیں لکھتے رہے، اس پہلی مرتبہ میں ایف بی آئی کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہمیں معلوم پڑ جائے کہ ان 54 زخمیوں میں کتنے غیر ملکی ہیں اور ان کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگاتے کہ ہم پر کوئی زخمی حملہ نہ کر دے، اصل میں یہ تحقیق کا پہلا راؤنڈ تھا اس روز ایک دل سوز واقعہ بھی پیش آیا، وہ ایسے کہ ہر مریض کے پاس اس ٹیم کا جمگھٹا سا بن جاتا، انہیں میں ایک مریض جس کی پیشاب والی جگہ پر زخم تھا، اس کو یورن بیگ ہر

وقت لگا رہتا تھا۔ اس تھیلی میں پیشاب بھر جاتا، اس زخمی مجاہدین کی چھان بین کے دوران امریکی کا پاؤں اس تھیلی پر آ گیا، بھری تھیلی پر دباؤ سے اس زخمی نے ایک دم زور سے چیخ ماری جو کہ تکلیف کی وجہ سے تھی، اس ساتھی کی چیخ کا سننا تھا کہ سب امریکی گولیاں بلٹ پر چڑھاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگ گئے اور وہاں کے ازبک پولیس والے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بزدل امریکی فوجیوں نے معلومات کروائی تو انہیں پتہ چلا کہ ہمارے پاؤں رکھنے سے یہ زخمی تکلیف کی وجہ سے چیختا تھا۔ اس کے بعد امریکی ایف بی آئی اپنی کارروائی پوری کر کے چلے گئے۔

آخری بار ایف بی آئی والے آئے تو اس دفعہ وہ اپنے ساتھ تحقیقی سامان بھی لائے۔ ہر مجاہد زخمی کے فنگر پرنٹ اور ڈی این اے کے لئے تھوک کے نمونے وغیرہ لیتے رہے۔ چونکہ ان کو پہلے سے معلوم تھا، اسلئے عید الفطر کے بعد سب سے پہلے غیر ملکی عرب اور چیچن مجاہدین کو ادھر سے منتقل کرنا تھا۔ زیادہ عرب مجاہد زخمی حالت میں ہی قلعہ جنگی سے لائے گئے تھے۔ اور ان عربوں کو امریکیوں نے الٹا لیٹا کر سٹریچر کے ساتھ ان کے بدن کو آہنی زنجیروں سے باندھ دیا اور ان کے منہ اور آنکھوں پر سیاہ پٹیاں سختی سے باندھ کر سٹریچر سمیت گاڑی میں بھیڑ بکریوں کی طرح پھینکتے رہے۔ اس بے بسی میں باقی پاکستانی اور افغانی طالبان غصے سے پیچ و تاب ہو رہے تھے ان ظالموں کی قید اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے اندر ہی اندر اس غصے کی آگ پر صبر استقامت کا پانی چھڑک کر ٹھنڈی کرتے رہے۔ یہ تمام قیدی گوانتاموبے کی جیل میں لے جائے گئے۔

ریڈ کراس والے دو دفعہ اپنے کارندوں کے ساتھ آئے اور دو تین بسکٹ نما پیکٹ دے کر چلے گئے، اس کے علاوہ ان کے ڈاکٹروں نے کوئی خاص توجہ زخمی مریضوں پر نہ دی اور خوارک کا مسئلہ بھی جوں کا توں تھا۔ ایک روٹی صبح اور دوپہر کو تھوڑے سے چاول، آدھی روٹی اور شام کو بھی ایک روٹی، چاول اسی مقدار سے ملتے اور دوائی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، ہسپتال سے واپس شبرغان جیل اس وقت پہنچاتے جب مریض کے زخم مندمل ہو جاتے اور ڈاکٹر ان کا معائنہ کر کے ڈسچارج کر دیتے۔

شبرغان جیل میڈیا کے خاص توجہ کا مرکز بننے کے ساتھ ساتھ امریکی کمانڈوز اور خفیہ ایجنسیوں کی بھی آماجگاہ بنی رہی۔ قیدیوں کی تحقیق سے پہلے تک بالواسطہ یا بلا واسطہ امریکی کمانڈوز نے شبرغان جیل کا کنٹرول سنبھال رکھا تھا جس کی بڑی وجہ شمالی اتحاد والوں کی بداعتمادی تھی کہ کہیں یہ لوگ ڈالروں کے عوض قیدی نہ چھوڑ دیں۔ دوسری وجہ افغانستان میں سب سے زیادہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

طالبان قیدیوں کی تعداد شبرغان جیل میں تھی اور قلعہ جنگی کے واقعہ میں امریکی طالب عبدالحمید کے ہاتھ لگنے کے بعد ان کو یقین تھا کہ مزید اور بھی القاعدہ سے تعلق رکھنے والے ان قیدیوں میں ہوسکتے ہیں اور چیچن عرب مجاہدین بھی شبرغان جیل میں موجود تھے۔

امریکی خفیہ اداروں کے اہلکار اکثر قیدیوں کو باہر نکلوا کر ان کے شکل سے پہچاننے کی کوشش کرتے، کئی ساتھیوں کو ظاہری شکل وصورت پر بھی تحقیق سے پہلے پوچھ گچھ کے مراحل سے گزرنا پڑا اور چھت پر کھڑے امریکی قیدیوں کے مجمع میں مشکوک افراد کو عربی اور انگلش میں مخاطب بھی کرتے لیکن یہ طریقہ باضابطہ طور پر موثر نہ سمجھا گیا۔ پینٹاگون نے بھی اس جیل کی تعداد کے پیش نظر سی۔ آئی۔ اے کی جگہ فیڈرل بیورو انویسٹی گیشن ایف بی آئی کو منتخب کیا۔ اس کی وجہ شاید قلعہ جنگی کے واقعے میں سی آئی اے کا کردار تھی یا امریکہ ایف بی آئی کی بدکرداری بھی دکھانا چاہتا تھا تاکہ دنیا والوں کو پتہ چل جائے کہ سب بدکرداریاں امریکہ ہی میں ہیں۔

شمالی اتحاد کے جنرل دوستم نے ایف بی آئی کو جیل میں آنے سے پہلے ہی شبرغان شہر میں موجود اپنے محل سے بڑے بڑے کمانڈروں کو گرفتار کروایا۔ امریکہ نے بھی پوری طرح اس جنگی سردار پر ڈالروں کی بارش کر رکھی تھی۔ ایف بی آئی کے لئے شبرغان جیل اور مرکزی ہسپتال جہاں کئی غیر ملکی مجاہد زخمی پڑے تھے اور دوستم کے محل کے دروازے کھلے تھے۔ ایف بی آئی کو اختیار تھا کہ وہ ہر قسم کی کارروائی کیے اور اپنے مطلوب افراد کو جہاں چاہے منتقل کرے۔ اس سے دوستم کو کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کمانڈوں میں افغان نائب وزیر دفاع مُلا فضل اخند، شمالی افغانستان کے انتظامی سربراہ مُلا نوراللہ نوری، ولایت سمنگان کے والی مُلا عبدالجبار اخند، مایہ ناز کمانڈر شہزادہ اختر، والی بادغیس مولوی ولی جان اور کمانڈر اختر زادہ گجر سمیت کئی اہم کمانڈروں کو بھی خفیہ طور پر ایف بی آئی نے بگرام اور قندھار ایئر بیس پر لے جا کے وہاں سے گوانتا نامو بے ایکسرے کیمپ منتقل کر دیا تھا۔ مُلا فضل اخند کی قربانی اس لحاظ سے عظیم ہے کہ مجاہدین کے قندوز سے انخلاء اور تسلیم ہونے تک واضح طور پر امریکیوں اور دوستم سے براہ راست مذاکرات کرتے رہے، آفرین ہو اس مرد قلندر پر کہ ان کو معلوم بھی تھا کہ میرے ساتھ یہ بدعہد لوگ مستقبل میں کیا کریں گے لیکن اپنی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مُلا فضل اخند کی ایک ٹانگ شہید ہو چکی تھی اور دوسری پر چند سال پہلے طالبان کی فتوحات کے وقت درہ کیان پر حملہ کے دوران زخم آئے، قندوز کے محاذ پر ایک ہاتھ گولیوں سے چھلنی ہوا، وادی غوربند میں سر میں لگنے والی گولی دماغ کے

وسط میں پہنچ کر رک گئی تو ڈاکٹروں نے کہا یہ شخص اب زندہ نہیں رہ سکتا مگر مُلا فضل اخند اس کے باوجود زندہ ہیں اور اللہ رب العزت نے ان کے ہاتھ پر شمال کے آٹھ صوبے فتح کروائے تھے۔ یہ مرد آہن آج بھی اپنی زندگی کے ایام آہنی تاروں کے بنے پنجرہ نما کوٹھری میں کیوبا کے گوانتانامو بے کیمپ میں گزار رہا ہے۔ اللہ ان کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب کریں۔ آمین!

28 دسمبر سخت سردی والے دن امریکی ایف بی آئی ٹیم جن میں کمانڈوز عورتیں بھی تھیں آ گئیں، اگرچہ یہ تحقیق کا پہلا مرحلہ تھا اور قیدیوں کو بھی معلوم نہ تھا، افسران آئے اور بلاک کے ذمہ داروں کو گیٹ پر بلایا، پہلے مرحلے میں عرب چیچن اور دیگر اسیرن کو رہائی کا جھانسہ دے کر تفتیش کے لئے لے گئے۔ سب غیر ملکی رہائی کا سن کر نکل پڑے لیکن چند گھنٹوں بعد جو ہر بیگ پھر آیا اور انگلش بولنے والے قیدیوں کو صحافیوں سے انٹرویو لینے کے بہانے باہر آنے کا کہا، اس وقت 51 پاکستانی نکلے جو کہ نہیں جانتے تھے۔ ہمارے ساتھ آئندہ کیا پیش آئے گا۔ کئی ساتھی ایسے بھی تھے کہ وہ رہائی کا سن کر نکلے تھے۔ اس روز غیر ملکی، افغانی اور پاکستانی ساتھیوں کو ایف بی آئی کی مخلوط ٹیم کھلے آسمان کی چھت کے نیچے برہنہ کر کے تصویریں بھی لیتے رہے اور اپنی کارروائی بھی کرتے رہے۔ دوپہر گزر گئی، شام ہوئی، رات آ گئی لیکن اس روز نکلنے والے ساتھی لوٹ کر بیرک میں نہیں آئے۔ اللہ ہی جانے ان کو امریکی کمانڈوز اپنی نگرانی میں بنائی گئی گاڑیوں میں ڈال کر کہاں لے گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا لیکن شک سا گزرا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

29 دسمبر کو جیل حکام میں جو ہر بیگ دروازے پر آیا اور پاکستانی بلاک کے باہر کھڑا ہو کر آواز لگوائی کہ مزید انگلش بولنے والے آ جائیں، ان کی رہائی ہے۔ اس دن دروازہ بھی ویران سا تھا۔ اکثر ساتھی اپنے کمروں میں گھس گئے تھے اور باہر بلاک میں بیٹھے ساتھی بھی دروازے کے قریب جانے سے گریزاں تھے۔ جو ہر بیگ نے دو ماموروں کو اشارہ کر کے بلاک کے اندر داخل ہونے کا کہا اور اپنی ازبکی زبان میں کھسر پھسر کی جو کہ ہماری سمجھ سے بالا تھی۔ وہ دونوں افسراب ہر کمرے میں جا کر اپنی مرضی سے شکل وصورت کو دیکھ کر ساتھیوں کو باہر نکلنے کا حکم دیتے۔ ہمارے بلاک کے مقصود کو بھی دھکا دے کر باہر لے گئے اور جس ساتھی کی زلفیں دیکھتے وہ باہر لے جاتے۔ میں اور آصف بھی نکل گئے یہ ڈرامہ ہوتے ہوتے تقریباً گیارہ بج گئے اور کھانے کے لئے ابلے چاول کے طشت بھی رکھ دیئے۔ ساتھیوں نے پیٹ بھر کر کھائے اور جو بچا اس کو احترام کی خاطر اپنی جیبوں میں پڑے پلاسٹک کے شاپر میں ڈال لیا کیونکہ روٹی کی قدر ان حالات میں بہت زیادہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بڑھ گئی تھی۔ ایک ایک ساتھی کا نام ولدیت لکھ کرآ گے بھیج دیتے اور کمرے میں موجود ایک عسکر نے مکمل جامہ تلاشی لے کر ساتھیوں کی جیب سے بچی کچی رقم، قینچی، ناخن تراش وغیرہ سب کچھ نکال لیا اور امریکیوں کی طرف سے دی گئی ہتھکڑی سے پشت کی طرف ہاتھ باندھ دیئے اور چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے مسلح امریکیوں کے حوالے کر دیا۔ امریکی فوجی پشت سے بندھے ہاتھ کو پکڑ کر لے جاتے ہوئے اتنے کانپتے تھے کہ ان کی تھراہٹ واضح محسوس ہوتی، مطبخ کے ساتھ والا صحن کرسیوں اور میزوں سے بھرا تھا جن پر ایف بی آئی کی مرد و عورت کی مخلوط ٹیم بیٹھی تھی۔ اوپر نیچے ہر طرف مسلح امریکی ہائی الرٹ پوزیشن لئے کھڑے تھے۔ کسی ساتھی کی معمولی حرکت انہیں چوکنا کر دیتی جھکے ہوئے سر کو بائیں جانب موڑ کر دیکھا تو اس کھلے آسمان تلے سب کے سامنے قیدیوں کو برہنہ کیا جا رہا تھا۔

اس صحن میں ایک ہی وقت میں یہ ٹیم علیحدہ علیحدہ کام انجام دے رہی تھی، کچھ تو کرسیوں پر بیٹھے لکھنے اور پوچھنے کا کام کر رہے تھے۔ ایک طرف صرف انگلیوں کے نشانات لئے جا رہے تھے اور میز پر ٹیپ ریکارڈر رکھے ہوئے گفتگو ٹیپ ہو رہی تھی اور کیمرے سے پوری تحقیق کی فلم ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ دو امریکی صرف جامہ تلاشی کے لئے قریب کھڑے تھے اور ایک امریکی سر اور ڈاڑھی کے بال کاٹ کر لفافوں میں سیل بند کر رہا تھا۔ کچھ ہٹ کر میز پر پڑے لیپ ٹاپ میں تصاویر اور ڈیٹا فیڈ کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی حصار بنائے ہوئے اکثر الرٹ پوزیشن میں کچھ سیاہ فام کمانڈوز بھی تھے جو کہ صرف قیدیوں کی نقل و حرکت کو بھانپ رہے تھے اور بڑے دروازے کی چھت پر بھی مورچے بنائے کئی امریکی پہرہ دے رہے تھے۔ اس دن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کہیں امریکہ کے اندر کسی جیل میں قید ہیں، ایک سوال ذہن میں گھوم رہا تھا کہ ہم سے امریکی اتنا خوف کیوں کھا رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے تحقیق پر جانے والے تقریباً فارغ ہو چکے تھے کہ اچانک سٹینڈ اپ کی آواز کانوں میں پڑی لیکن کوئی حرکت نہ کرنے پر پیچھے سے پکڑ کر کھڑا کر کے مجھے تحقیقی ٹیم کے سامنے پیش کیا، ان کے منہ سے مجاہدین کے خلاف غلیظ گالیاں نکل رہی تھی جنہیں یہاں پر نقل کرنا مشکل ہے۔ قینچی ہاتھ میں لئے ہوئے ایک امریکی تیزی سے میری طرف لپکا اور بغیر کسی بات کے سر پر ہاتھ پھیرا بال چھوٹے دیکھ کر ڈاڑھی کو پکڑا اور ایک طرف سے ڈاڑھی کاٹ ڈالی، اس قبیح حرکت پر بہت شرمندگی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ آنکھوں کے سامنے یہ بال ایک پلاسٹک کور میں ڈال کر اس سے اگلی حرکت نے گویا جسم و قلب پر چھریاں چلا دیں اور وہ امریکیوں

نے لپک کر پکڑا، ایک نے تو تیزی سے ہتھکڑی کھول دی اور دوسرا مکمل جامعہ تلاشی لینے لگا۔ قریب ہی ایف بی آئی کا مخلوط عملہ بھی متوجہ تھا۔ ایک فوجی نے میز پر پڑی مشین اٹھالی جو کہ غالباً بم ڈیٹکٹر کا کام دیتی تھی کہ جس میں کسی جگہ بذریعہ سرجری بارودی مواد تو نہیں چھپا رکھا۔ تلاشی لینے والے امریکی نے تلاشی کے دوران کپڑے اتارنے کی کوشش کی لیکن اس کو روکنے پر پیچھے والے نے اپنی رائفل کے بیل کو کمر پر مارا اور ہاتھ اٹھانے کو کہا، سب کمانڈوز الرٹ ہو گئے اب آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دوسرے ساتھیوں جیسا برہنہ کرنے والا سلوک ہوا۔ پورے جسم پر مشین پھیرنے لگے۔ چشم زدن ہی میں ڈاڑھی کاٹنے کے بعد اس حیا سوز واقعے نے اور سامنے اغیار کے جھرمٹ میں بیٹھی عورتیں بھی تماشا دیکھ رہی تھیں، سخت کوفت ہوئی اور پورے جسم میں بجلی کی کڑک سر سے پاؤں تک گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا محسوس ہوا۔

اب کرسیوں پر بیٹھی ٹیم کی طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے ترجمان شکل سے پاکستانی اور انڈین دکھائی دیتے تھے۔ انگلش میں ''ویئر آر یو فرام'' اور عربی میں ''مین این انت'' آپ کہاں سے ہیں۔ بالآخر اردو میں پوچھا ''آپ کس ملک کے ہیں؟''

پاکستانی سن کر نام ولدیت اور بہن بھائیوں اور مکمل ایڈریس کا پوچھتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی پوچھا؟ اسامہ بن لادن اور ملا عمر کو جانتے ہو وہ کہاں ہیں؟

نفی میں جواب دیا.....

پھر کس لئے افغانستان آئے؟

''امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اس لئے امریکہ کے خلاف جہاد کرنے آئے ہیں''.....

اس جواب پر ایف بی آئی کے آفیسر اور ترجمان اپنی پیشانیوں پر تیور چڑھا کر ایک دوسرے سے مصروف گفتگو تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے سامنے رکھے سوالنامے پر نشانات لگا رہے تھے اور غالباً ہر مجاہد ساتھی کا اس سوال کا نہایت صاف جواب سن کر حیرت محسوس کر رہے تھے۔ خیر اس جگہ پر انگلیوں کے نشانات بھی لئے گئے اور پھر قریب جیل کے اندر موجود ہسپتال کی دیوار کے ساتھ امریکی متعلقہ قیدی کی فائل مرحلہ وار ایک میز پر لے جاتے۔ اسی جگہ متعلقہ فائل نمبر ایک چمڑے کی چپ پر موٹے مارکر سے لکھ کر یہ پٹی بازو سے اتنی سخت باندھ دیتے کہ خون کا دورانیہ رک جاتا۔ قریب کھڑے بعد والے مرحلے میں ایک امریکی ڈاکٹر ڈی این اے کے لئے روئی نما تنکے سے منہ کھولنے کو کہتا اور پھر پورے منہ میں تالو اور زبان پر اسے پھیر کر پلاسٹک کور میں سیل کر کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نمبر لگاتا رہا جو کہ بازوؤں والی جیپ پر لکھا تھا۔ اب سب سے آخری مرحلے پر ایک پیچ پڑے لیپ ٹاپ اور قریب ہی کھڑے امریکی فوٹوگرافر سے پالا پڑتا۔

فائل بھی گھومتی گھماتی اس آخری مرحلے میں جمع ہو رہی تھی۔ فوٹوگرافر سامنے اور دائیں بائیں اور پشت کی جانب سے تصویریں لیتا رہا اور لیپ ٹاپ میں ہمارا سارا ریکارڈ بمع تصاویر فیڈ ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اتنے مراحل سے گزارنے کے بعد اب امریکی ہمیں ازبک عملے کے حوالہ کر دیتے جو کہ اسی جگہ ہمارے ہاتھ باندھ کر قریب کے بلاک میں داخل کر دیتے، ہم سب پر گھونسوں اور مکوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی، جب دروازہ بند ہوا تو سکون ملا۔

اس بلاک میں داخل ہوئے تو یہ چھوٹی چھوٹی کھولیوں پر مشتمل بلاک کھلے آسمان کی جھلک دکھاتا تھا لیکن جب اس بلاک کے تین آدمیوں پر مشتمل کمروں کی حالت اور گندگی دیکھی تو سر چکرا جاتا۔ پھر سردی نے بھی پورا بدن سن کر دیا تھا اور بدقسمتی یہ کہ اپنا ایک عدد کمبل جو شبرغان جیل کا اثاثہ تھا وہ بلاک میں چھوڑ آئے، ان چھوٹے کمروں کے دروازے تک بھی بند تھے، کمرے پاخانے سے بھرے تھے اور اس بات کا احساس ظہر کی نماز اس کمرے میں پڑھی، سجدے کی صورت میں ناک اور پاخانہ میں سے لگنے کے بعد ہوا، دماغ بدبو سے متعفن ہو گیا۔ ساتھیوں کی تحقیق جاری تھی پیچھے رہنے والوں کو وقتاً فوقتاً تحقیق کے بعد ہمارے ساتھ بند کیا جا رہا تھا۔ عصر کے وقت تحقیق ختم کر کے امریکی بوریا بستر لپیٹ کر چلے گئے۔ ہم تقریباً سو سے زائد ساتھی اس بلاک میں جمع تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس روز چودہ مزید پاکستانی بلاک سے کیوبا لے جانے کے لئے علیحدہ کر دیئے۔ ان کی غلطی صرف ان کی شکل و صورت یا انگلش کے چند لفظوں سے آشنائی تھی، امریکہ کے نزدیک کسی کے دہشت گرد ہونے کے لئے یہی کافی تھا، عملے سے کچھ ساتھیوں کے کہنے کے بعد سردی سے بچاؤ کے لئے کمبل مل گئے جو نا کافی تھے۔ تقریباً پانچ افراد ایک کمبل کو اوڑھ کر سوئے۔ ہم سے پہلے اس بلاک میں دو پاکستانی رحیم اللہ شاہ اور شوکت موجود تھے جو کہ پہلے دن ہی تحقیق کے بعد علیحدہ کر دیئے گئے تھے۔ کمروں میں ساتھیوں کو تقسیم کر دیا اور لیٹنے کو صرف اتنی جگہ تھی کہ انسان ایک بازو پر لیٹ سکے، ایک روٹی بھی مل گئی، خیر سخت سردی کی رات بھی ٹھٹھر کر گزاری۔ صبح کی نماز کے بعد خوب دعائیں ہوئیں کہ اللہ ان ظالموں کی قید سے رہائی نصیب فرما۔ صبح کے وقت ایک دوسرے سے گفتگو کے تبادلے ہوتے رہے کہ اب ہمارا کیا بنے گا اور ایف بی آئی نے دوسرا آدھا دن گزرنے کے بعد تحقیقات کو مختصر کر دیا اور بعد والے ساتھیوں کو برہنہ کرنے کی بجائے سرسری جانچ پڑتال کرنے لگے کیونکہ ایف بی آئی نے غیر ملکیوں اور انگلش بولنے والے ساتھیوں کو علیحدہ کر لیا تھا۔ اس لئے آئندہ آنے والوں سے بال کاٹنا اور برہنہ کرنے کا سلسلہ صرف مشکوک افراد تک رہا لیکن تھوک کا نمونہ ہر ساتھی سے لیا گیا تھا۔

ڈی این اے ٹیسٹ کے علاوہ ایف بی آئی ''پولی گراف ٹیسٹ'' بھی دوران تفتیش کرتی ہے، یہ بلڈ پریشر، سانس اور انگلیوں کا پسینہ جانچنے کا ٹیسٹ ہوتا ہے یہ بالکل غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے۔ خود امریکی عدالتیں اس کو نہیں مانتی۔

20 دسمبر اتوار کے دن سب ساتھی صبح کے وقت کرہ خانے کے دروازے کے سوراخوں سے باہر جھانک رہے تھے اس جگہ سے بڑے دروازے اور جیلر کا دفتر صاف نظر آتے، سب تذبذب کا شکار اب کیا ہوگا۔ ہزاروں کی تعداد میں سے ہم ایک مخصوص تعداد کو علیحدہ رکھنا اور دونوں میں اکثر ساتھیوں کا جیل سے باہر لے جانا یہ سب ایسے سوالات تھے جنہوں نے ہمیں پریشان کئے رکھا، دوپہر کو پونی روٹی مل گئی اور تھوڑے سے چاول، جس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے امریکی بھی آئے۔ اب پیر کی صبح کے انتظار کے ساتھ عجیب بات یہ تھی کہ بلاک میں رہتے ہوئے بہت زیادہ مشکلات تھیں اور اس چھوٹے بلاک کرہ خانے میں تمام مشکلات کے باوجود ختم ہونے کے دوگنی ہوگئی تھیں.....

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پیر کی صبح دروازے سے باہر دیکھا تو امریکی آ گئے، اب پھر وہی پرانی داستان لیکن آ نے روز امریکیوں کی تحقیقات کرنے میں تیزی آ گئی، اس روز پہلے سے دگنی تعداد میں تحقیق ہوئی اور اب باقی آنے والے ساتھیوں کے پاؤں میں امریکی پلاسٹک کے سفید کڑے ڈال دیتے جس نے کئی ساتھیوں کے پاؤں میں خون جما دیا۔ تحقیقات کے ختم ہونے کے بعد ایف۔ بی۔ آئی کی بے حیا ٹیم جیل کے افسران کو ہاتھ کے اشاروں سے بریفنگ دیتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایف۔ بی۔ آئی پھر شام کو چلی گئی، جیلر آیا اور سب ساتھیوں کو دوبارہ بلاک جانے کا کہا، ایک لمبی قطار بنا کر جاتے ہوئے راستے میں ایک شمالی فوجی روٹیوں کی بوری رکھ کر بیٹھا تھا اور ہمارے حصے کی ایک روٹی ہمارے ہاتھ میں پکڑا کر جتلا رہا تھا اور ساتھ ہی یہ کہتا "خوش باش" خوش رہو۔

اپنے بچھڑے ہوئے بلاک کے ساتھیوں سے دوبارہ ملاقات ہوئی، سب ساتھی ایک دوسرے سے یوں گلے مل رہے تھے کہ "جیسے صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آتا ہے" والدین، بہن، بھائیوں اور عزیزوں کی دوری کی وجہ سے ساتھی ہی ایک دوسرے کے غم خوار بنے ہوئے تھے، اصل میں جیل میں جگہ کی کمی کے باعث ہمیں واپس بلاک منتقل کر دیا۔ کیونکہ امریکیوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ تحقیق والے ساتھیوں کو واپس بھیجنے پر پتہ نہ چل جائے کہ امریکی کیا سوالات کرتے ہیں لیکن ہمارے واپس آنے پر باقی ماندہ ساتھیوں پر ساری صورت حال واضح ہو گئی کہ امریکی کیا سوالات کرتے ہیں۔ دو دن بعد پاکستانی مجاہدین کی تحقیق مکمل ہو گئی، باقی دن افغانیوں کی تحقیق 10 جنوری تک ہوتی رہی، اس تحقیق کے بعد نئے تجربات سامنے آئے اور کچھ ساتھیوں کے کیوبا لے جانے پر بچھڑنے کا بھی احساس ہوتا رہا۔ ان کے لئے دعاؤں کے تحفے ہر ایک نے بھیجے۔ تحقیق کے بعد پاکستانی بلاک میں تقریباً 700 نفر رہ گئے تھے لیکن شبرغان جیل میں جگہ کی کمی پانی اور خوراک کی قلت برابر اپنی جگہ پر رہی۔

ریڈ کراس امریکی تحقیق کے فوراً ختم ہوتے دوبارہ وارد ہوئی اور تحقیق کے دوران تو ایک روز بھی جیل کا چکر لگانے کی زحمت نہ کی، ایسا محسوس ہوتا تھا سوچی سمجھی سازش کے تحت ریڈ کراس کو دوبارہ بھیج دیا گیا، قیدیوں نے ریڈ کراس کی ٹیم سے سوالات پوچھے کہ ہمارے ساتھی کہاں گئے، اس کا نفی میں جواب ملتا، اس کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو ماہ گزرنے کے بعد انتہائی بھوک اور خوراک کی قلت نے بیماریوں کو جنم دیا، ان حالات میں خونی پیچش اور قبض عام رہتی۔ چند ساتھی بیماری کی وجہ سے جیل کے اندر ہی سسک کر شہید ہو گئے کیونکہ جیل کے اندر بنا چھوٹا ہسپتال بھی ڈیتھ سنٹر بنا ہوا تھا، شدید مریض کو یہاں پر زہر کا انجکشن لگا کر طبعی موت گردانا جاتا اور اس خونی کھیل میں ازبک ڈاکٹر حاجی پیش پیش تھا اس کا ثبوت جیل میں ہمارے ساتھ قید رہنے والے بھائی غلام نبی ہنگرام والے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے شدید مرض کی حالت میں لگنے والی ڈرپ میں نیلے رنگ کا زہر یلا انجکشن بھرتے دیکھ لیا، کئی ماہ سے ہسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے غلام نبی ہمارے اتار چڑھاؤ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈاکٹر کے باہر جانے پر اس نے چالاکی کے ساتھ کمزوری کی حالت میں حرکت کر کے ڈرپ کو پیچھے والی بالٹی میں بہا دیا، دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے پوچھا کہ کیا ڈرپ ختم ہوئی! لیکن دل ہی دل میں ڈاکٹر بھی حیرت زدہ تھا کہ یہ کیا بلا ہے کہ زہر یلے انجکشن سے بھی اس کا کام تمام نہیں ہوا۔ مارنے والے سو تدبیریں کر بیٹھیں لیکن بچانے والے اللہ کے آگے کوئی تدبیریں نہیں چلتیں، یہ ساتھی اب آزاد فضاؤں میں صحت مند زندگی گزار رہا ہے۔

زہر کے ٹیکے لگانے میں تو پھر بھی کوئی لحاظ رکھا جاتا لیکن جیل کے شروع کے دنوں میں جب کہ شمالی اتحاد کے ازبک جنگجوؤں کا انتقام لاوے کی طرح قیدیوں پر ٹوٹا تھا ان دونوں کو شبرغان جیل کے کرہ خانہ بلاک میں ایک ازبک مجاہد ڈاکٹر سعدی کو جیلر جوہر بیگ اور اس کے معاون اختر خان نے زندہ ذبح کر دیا، سوات اور ملک کے دوسرے حصوں میں جاری شورش کے دوران سیکورٹی فورسز کے لوگوں کو ذبح کرنے والے یہی درندے ہیں جو طالبان کی صفوں میں گھس چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس ڈیتھ سنٹر میں پانچ طالبان مجاہدین کو بڑی بے دردی سے گلے پر تیز دھار چھرے چلا کر ذبح کیا گیا، شبرغان جیل کے تمام قیدی ان حالات سے خبردار تھے لیکن مظالم کی انتہا میں کسی ساتھی کی جرأت نہ پڑتی کہ وہ اس کی شکایت جیل کے دروازے پر آئے ہوئے مغربی میڈیا کے صحافیوں سے کرے۔ شبرغان جیل میں ظلم و ستم کے واقعات تو بہت ہیں لیکن ان میں ایک اور واقعہ ان حالات سے تنگ آ کر دو طالبان مظلومیت کی زندگی کو خیر باد کہنے کے لئے جب جان ہتھیلی پر

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

رکھ کر کسی طریقے سے بیت الخلا کے فرش کو توڑ کر فرار ہوتے پکڑے گئے تو ان بے چاروں کی حالت زار پر ہمارا تمام بدن آنکھیں بن جاتا اور ہر آنکھ اس پہ روتی رہتی تو بھی کم تھا۔ ظالم عملہ بیرکوں سے ملحقہ صحن میں ان طالبان کو سب قیدیوں کے سامنے عبرت کا سبق سکھانے کے لئے مارنا شروع ہوا۔ شہتوت کی لکڑی کی تیکھی ٹہنیاں اور بڑی کیبل سے ہر طرف سے پے در پے وار شروع تھے۔ بیچارے طالبان کی آہ و فغاں سے سب قیدیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ مدد کے لئے پکارنے والے ان ظالموں کا نشانہ بننے والے اللہ اللہ...... کی مسلسل آواز نکالتے رہے۔ ان کی چیخیں ہمارے کانوں کے پردے چیرتی ہوئی کلیجے چھیدتی رہیں۔ ہم چند ساتھی صرف چند سیکنڈ تک ان کو مارنے والوں کا منظر دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے کہ کہیں دل ہی اچھل کر باہر آ جائے۔ زوردار چیخیں اور اس اللہ اکبر اور کلمہ پڑھنے والے کی آواز میں تقریباً دس منٹوں بعد کمی آنی شروع ہوئی اور پھر اسی لمحے اگلے پانچ منٹ میں ایک طالب ہمیشہ کی سرفرازی پا گیا اور دوسرا بھی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے آخری دموں پر بے ہوش ہو گیا لیکن ظالموں نے زبان پر کان کی سرگوشی سے بھی کم حرکت کرنے والوں پر اپنے وار مسلسل جاری رکھے اور ان کے ٹھنڈے ہونے پر بھی ان درندوں کے کلیجے ٹھنڈے نہ ہوئے۔ تقریباً ایک ہزار سے بھی زیادہ کوڑے اور ڈنڈوں کے وار ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے رہے۔

○

میں نے زندگی میں کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کبھی انڈیا جاؤں گا یا میرا واسطہ ''را'' سے پڑے گا لیکن آج اندازہ ہوتا ہے کہ ہر کام پر اللہ نے انسان کو اختیار نہیں دیا۔ ''را'' سے میرا پہلا تعارف شبرغان جیل میں دوران اسیری ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے انہوں نے تب ہی مجھے اگلے عذاب کے لئے منتخب کر لیا ہو۔

ازبک جرنیل دوستم سے بھارتیوں کی دوستی شمالی اتحاد کے ذریعے ہوئی تھی۔ یہ بات جاننا ضروری ہے کہ شمالی اتحاد کے کمانڈروں کے ''را'' سے ہمیشہ قریبی تعلقات رہے ہیں۔ طالبان نے افغانستان میں حکومت بنائی تو مفرور شمالی لیڈروں کا ٹھکانہ بھارت ہی تھا کیونکہ روس تو خود اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ نائن الیون ہوا تو بھارتیوں کی لاٹری نکل آئی۔ انہوں نے نہ صرف سی۔ آئی۔ اے کی مدد سے افغانستان میں قدم جمائے بلکہ اپنے پرانے رشتے بھی مضبوط کرتے ہوئے شمالی اتحاد حکومت کے کمانڈروں کو بھارت کے دورے کروانے شروع کئے اور جنرل دوستم کو

بھی بھارت کا دورہ کروایا۔ یہاں ان کی جنرل دوستم سے کوئی خفیہ سازش طے پائی کیونکہ دوستم جب بھارت کے دورے سے واپس آیا تو اس کے ساتھ ''را'' کی ایک ٹیم بھی موجود تھی۔ یہ لوگ دوستم کے خصوصی مہمان تھے اور ان کے چاؤ چونچلے ایف۔ بی۔ آئی سے بھی کچھ زیادہ ہی اٹھائے جا رہے تھے۔ اگر میری یادداشت دھوکہ نہیں دے رہی تو یہ لوگ تین سے سات فروری کے دوران شبرغان جیل میں آئے تھے۔ ان کی آمد سے ایک روز پہلے ہی کشمیر کے رہنے والے تمام پاکستانی مجاہدین کی لسٹ بنائی گئی تھی اور ان کو جیل سے نکال کر ان کے پاس پہنچایا گیا۔ بزدل اتنے تھے کہ جیل میں آنے سے خوف زدہ تھے جن ساتھیوں کو ان سے ملایا گیا ان کی زبانی علم ہوا کہ انہوں نے اپنا تعارف پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی کے حوالے سے کروا کر دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ لوگ کشمیری مجاہدین سے عموماً اس نوعیت کے سوالات کرتے۔

پاکستان میں ان کا ایڈریس، خاندانی پس منظر، رشتہ داروں کی تفصیل وغیرہ...... کشمیر میں کہاں جہاد کیا؟ کتنا عرصہ رہے؟ کس تنظیم سے منسلک رہے؟ پاکستان میں کیا معمولات ہیں؟ بھارت کب گئے؟ اور وہاں کیا کچھ کرتے رہے؟

اس تحقیق میں ایک موٹی سی کالے رنگ کی ہندو عورت بھی تھی اور چند مرد اور یہ پوری طرح اردو پنجابی اچھی طرح جانتے تھے لیکن کسی جگہ پر منہ سے ہندی کا لفظ نکلنے سے ان کا ہندو پن ظاہر ہو گیا اور ساتھی سمجھ گئے کہ یہ ''را'' کے ایجنٹوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ فرداً فرداً کئی گھنٹے انہوں نے ساتھیوں سے تحقیق کی اور زیادہ تر وہ تنظیموں سے منسلک کرنے پر زور دیتے کہ آپ کا تعلق پاکستان کی مجاہد تنظیموں سے ہے۔ تمام تنظیموں کا ٹریننگ کیمپ کس علاقے میں ہے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں کے نام کے علاوہ سارا ملبہ آ جا کے پاکستان پر پھینک دیتے اور ان کی نظر میں یہ مجاہدین پاکستانی فوج اور ایجنسیوں کے کارندے گردانے جاتے تھے۔ تحقیق کے دوران پاکستان سے نفرت کے اظہار کو بھی وہ خفیہ نہ رکھ سکے۔ چند روز بعد تحقیق کر کے ساتھیوں کو دوبارہ جیل لے آئے اور اب انہوں نے تمام قیدیوں کی ویڈیو فلم بنانے کا پروگرام بنایا۔ جیل حکام امریکیوں کی طرح ان کے سامنے بھی دم ہلاتے نظر آتے اور بلاک کے صحن سے ملحقہ چھت پر چڑھ کے اپنے ہیوی کیمرے فٹ کر دیئے۔ ''را'' کے ایجنٹوں کی مکمل تیاری کے بعد پورا بلاک ایک ایک کر کے ان کیمروں کے سامنے سے گزارا گیا۔ یوں ''را'' کے ایجنٹ اپنی مطلوبہ معلومات کرنے کے بعد چلتے بنے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''را'' کے ایجنٹ پاکستان کے دشمن ہمارے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ساتھ آؤ تاؤ کر کے چلے گئے لیکن جیل میں کسی پاکستانی حکومت کے اہلکار، یہاں تک کہ ہمارے سفیر نے بھی آنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ ایک صاحب آئے بھی تو وہ بھی پرائیویٹ طور پر تشریف لائے تھے۔

جیلوں کے اکثر قانون ہوتے ہیں کہ خوشی کے تہوار میں سزا کی تخفیف یا رہائی کا اعلان ہوتا ہے، اکثر قیدی عید کی آمد سے پہلے مختلف قسم کی نیکوئیاں کرتے ایسی جگہ جہاں پر باہر کے حالات سے بے خبر ہو تو پیدل خبریں بہت سننے کو ملتیں، امریکیوں کی طرف سے خبروں کے ذرائع ریڈیو وغیرہ رکھنے اور جیل کے عملے کو بھی قیدیوں سے حالات حاضرہ نہ بیان کرنے کے احکامات تھے۔ ان احکام کا یہ بڑی وفاداری سے پاس رکھتے، کئی ساتھی اپنی قید کے دورانیے کو انگریزی قانون کے مطابق ایک مہینہ کو دو مہینے شمار کرتے، لیکن کئی ساتھی ازراہ مزاح کہتے یہ افغانستان ہے۔ یہاں اپنی مرضی سے آتے ہیں اور جاتے ان لوگوں کی مرضی سے ہیں۔ ایک برف باری والے دن ایسا ہوا کہ جیل کے اندر موجود زنانہ بلاک والے قیدیوں میں مالاکنڈ ڈویژن سے دیر سے تعلق رکھنے والے بھائی گلاب الرحمٰن کو ورزش کرنے کی پاداش میں اپنے علاقے والوں سے علیحدہ کر کے پاکستانی بلاک میں ڈال دیا۔ اس کو سزا کے طور پر علیحدہ کیا تھا، آتے ہی اس نے بتایا کہ حکومت کی طرف سے بوڑھے افراد کی رہائی کی لسٹیں تیار ہوئی ہیں جن میں سے 60 سے 85 سال تک کے سفید ریش بوڑھے شامل تھے۔ ان سب کی رہائی کے ساتھ مزید کچھ اور ساتھیوں کی رہائی کا بھی چانس ہے۔ یہ خبر بلاک کے 29 کمروں سے ہوتی ہوئی باہر نکلی اور دیکھتے ہی پوری جیل میں پھیل گئی، شبرغان جیل میں تو صرف موضوع ملنے کی دیر ہوتی۔ اب روٹی کتنی آئی اور چاول کتنے ملیں گے ختم ہو کر یہ تبصرہ عام ہو گیا کہ عید تو آئے لیکن کتنے جائیں گے؟ بعض تو تعداد بھی متعین کر دیتے، مردہ لاشوں میں جیسے ایک بار پھر روح پڑ گئی اور رہائی کی خبر وقت کے مطابق ایسی خوشی نصیب کرتی کہ مریض ساتھی بھی رہائی کا سن کر آدھے تندرست ہو گئے اور اب اکیلے بیت الخلا تک جانے کے قابل ہو گئے۔ افسوس یہ اطلاع غلط تھی ہمیں تو ابھی ڈھائی سال گزارنے تھے۔ صبح کے انتظار میں تھے اور عید سے ایک دن پہلے ہی بوڑھوں کی رہائی کا پروگرام تھا لیکن یہ بے چارے شبرغان سے گئے، پل چرخی اٹک گئے۔ رہائی کی اطلاعات میں یہ بھی تھا کہ پشتون جلد رہا ہوں گے۔ اسی روز دوپہر کو جیل کا عملہ کاپی پنسل لے آیا اور بتایا کہ پاکستانی بلاک سے 60 نفر زنانہ بلاک میں منتقل ہوں گے۔ پشتون اپنا نام لکھوائیں یہ سنا۔ تو ہم نے سمجھا کہ اب تو خبر پر مہر

ثبت ہو گئی۔ کئی دل بجھے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ نہ پشتون نہ پنجابی باہر قطار میں بیٹھ گئے۔ میں اور امین خان آپس میں آدھ گھنٹہ محو گفتگو رہے، آخر حتمی فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں پشتو جانتے اور بولتے تھے اور پیدائشی پشتون ہونے شرف نے ہمیں بھی قطار میں بٹھا دیا۔ اپنے بوریے بستر سمیت پہلے ہی معافی تلافی لے کر نکل پڑے تھے۔

ایک لمبی قطار بنائے ہوئے جیل کے کیچڑ بھرے راستے سے چلتے بڑے دروازے پر پہنچے تو اوپر کمرے کی کھڑکی سے جوہر بیگ نے گلاب کو کہا اس دفعہ تمہیں چھوڑ دیتے ہیں، آئندہ اگر کوئی حرکت ہوئی تو تم کو بھی ذبح کر دیں گے۔ ہم سب یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کئی ماہ بعد دروازے سے باہر نکلے اور جیل کی دیوار کے ساتھ ہوتے ہوئے مشرق کی طرف بنی ہوئی حفاظتی برجی کے ساتھ والے دروازے میں داخل ہوئے۔ زنانہ مجلس میں داخل ہوتے ہی یہاں دیکھا کہ کھلے آسمان تلے عجیب دنیا آباد تھی۔ سب بالا کنڈ ڈویژن کے مجاہدین اس جگہ جمع تھے اور ہماری آمد کی اطلاع بھی ان کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ اس بلاک کی خصوصیات یہ تھیں کہ کھلی آب و ہوا اور ایک بڑی ٹینکی پانی کی بھری ہوئی موجود تھی۔ اس احاطے میں چند درخت بھی تھے جو کہ کچھ خزاں اور کچھ مجاہدین کے ہاتھوں شکار بن گئے تھے۔ یہاں کے ساتھیوں نے ہم سب کی بڑی جوئیں اور میل کچیل سے بھرے جسم اور کپڑے دیکھ کر جلدی سے وہاں پر چھوٹا ڈرم لے کر پانی گرم کیا۔ حیرت کی بات پوری جیل میں سب سے زیادہ گیس اس بلاک میں تھی۔ تین ماہ بعد نہائے اور کپڑے دھوئے تو بوجھ سر سے اترا اور تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں کے امیر شاہ دوران صحاب نے ایک کمرہ خالی کروایا اور ان میں کچھ ساتی پشتون نہ تھے اس لئے یہ پنجابیوں کا اوطاق مشہور ہو گیا۔ اس کمرے میں تیس کے قریب ساتھی ٹھہرے۔ اس بلاک میں آٹھ کمرے بنے تھے اور صرف ایک غسل خانہ تھا۔ کل 25 کی تعداد میں یہاں ساتھی موجود تھے۔ ان کمروں سے ملحقہ گیلری بھی مسافر خانہ بنی ہوئی تھی۔ میں اور امین خان کمرے کی بجائے اس مسافر خانے میں مقیم ہو گئے۔

شبرغان کا موسم ایسا تھا کہ بارشوں کا سلسلہ سردی میں شروع ہوتا، جب بارش ہوتی تو بستر گول ہو جاتے کیونکہ کمروں کی چھتیں جگہ جگہ سے ٹپکتی تھیں۔ وہ کمرے جہاں بیٹھنے کو بمشکل جگہ ملتی اب ان میں کھڑے ہونے کو جگہ نہ ملتی۔ اس بلاک کے باہر مٹی سے بنی جڑواں بیت الخلاء میں جانے والوں کا اکثر منہ چادر سے چھپا ہوتا کیونکہ اس درمیان مٹی کی چھوٹی سی دیوار حائل تھی جو اتنی کہ دونوں اطراف میں بیٹھے افراد آنکھیں چار کر سکتے، اس صورت حال کو دیکھ کر کسی دردِ دل رکھنے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

والے نے درمیان میں بوری کاٹ کر پردہ لٹکا دیا تا کہ آنکھیں چار نہ ہو سکیں۔ ایک دفعہ سخت بارش سے روی باقیات بھی زمین بوس ہو گئیں۔ امدادی کارروائی کے بعد اب اس کی چھت کے سائے سے بھر محروم ہو گئے تھے۔ بارش ختم ہونے کے بعد چھتوں پر مٹی ڈالنے کا کام شروع ہوا۔

O

خدا خدا کر کے عید الاضحیٰ بھی آ گئی۔ قیدی انتہائی خوش تھے کہ عملے کی طرف سے بڑی عید پر تو گوشت ملے گا لیکن ہم سے زیادہ خوشی بلاک والوں کی تھی جن کے سامنے اونٹ ذبح کیا گیا۔ قیدیوں میں تذکرے شروع تھے کہ کئی ماہ بعد گوشت کھائیں گے اور جیل کا عملہ جن کو دوستم کی وفاداری نے اندھا کر دیا تھا ان میں کئی افراد بغیر تنخواہ کے بھرتی تھے اور ان کا خرچہ پانی قیدیوں کے آٹا اور چاول وغیرہ سے پورا ہوتا جسے یہ چوری کر کے گھر لے جا کر بیچ دیتے۔ اصل عید تو جیل کے عملے کی تھی کہ وہ سارا گوشت ہڑپ کر گئے اور مجاہدین کے نصیب میں بچی کھچی ہڈیاں تھیں اور زنانہ بلاک والوں کو تو عید کے روز روٹی بھی رات کو ملی جب اکثر ساتھی پیٹ کو جھوٹی تسلیاں دے کر اور بھوک کی شدت سے لڑ کر نیند کے ہلکورے لے رہے تھے جگا کر گوشت نما سالن دیا گیا۔

زنانہ بلاک کی طرف میڈیا بالکل نہ آتا تھا۔ جیل میں آمدہ صحافی اور نمائندے بڑے بلاکوں سے چکر لگا کر چلے جاتے۔ ریڈ کراس کا عملہ بھی بہت کم چکر لگاتا، بلاک کے پشتون ساتھیوں کی اکثر ملاقات بھی آتی رہتی، یوں تھوڑا بہت باہر کے احوال سے باخبر ہو جاتے، ایک دن لسٹ آئی اور چودہ ساتھی رہا ہو کر چلے گئے لیکن چند گھنٹوں بعد دو ساتھی دوستم بادشاہ کے محل سے دعوت کھا کر واپس آ گئے، اصل میں ملک زرین خان کنٹر والا ان کی رہائی کا کام کرواتا تھا اور رہائی کے بدلے بھاری رقوم وصول کرتا، ریڈ کراس والے ایک دفعہ آئے تو زنانہ والوں سے پوچھا تم میں سے کوئی ایسا شخص جو جیل سے باہر گیا ہو اور پھر واپس آ گیا ہو، جس سے حیرت ہوئی کہ یہ سوال اگر امریکی کرتے تو کوئی بات نہیں، ان کا کیا تعلق، ایک دفعہ ہم سے پوچھا کہ آپ کے نام آپ کے سفارت خانے کے حوالے کر دیئے جائیں تو کوئی اعتراض تو نہیں، سب نے کہا بھائی ہمارے نام آپ دے دیں تا کہ جلد از جلد ہماری رہائی ہو سکے۔ ریڈ کراس والوں نے اس مرتبہ کچھ خط بھی دیئے جو کہ ہمارے گھر والوں سے آئے تھے۔ یہ خط امیر صاحب نے تقسیم کر دیئے جن ساتھیوں کا گھر سے پہلی مرتبہ خط آیا وہ بہت خوش تھے، ان خطوں نے گویا ہمارے مردہ جسم میں جان ڈال دی اور گھر والوں کو ہماری اطلاع ہونے پر خوشی سے اکثر ساتھیوں کے آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساتھ ہی

یہ خوش خبری ملی کہ ریڈ کراس والے سب قیدیوں کو کپڑے کا ایک جوڑا دیں گے، کئی ساتھیوں نے نیا سوٹ پہن کر پھر دوبارہ پیک کر دیا۔ کئی تاجر دغا باز شمالی سوداگروں (یعنی جیل کے عملے) کے دھوکے کا شکار ہوئے۔ برج والے پہرہ داروں کے اب دن پھر گئے ایک نئے جوڑے کی قیمت سو روپے تک لگی۔ ان حالات میں سو روپیہ ایک لاکھ کا کام دیتا تھا۔

برف باری اور بارش گئی، اب ہوا کے جھکڑ چلنے کا موسم شروع ہو گیا۔ برف باری کے دنوں میں کافی عرصہ سخت سردی میں گزارنے کے بعد زنانہ محبس میں سردی سے بچاؤ کا گویا ٹھکانہ مل گیا کیونکہ (گیس کی انگیٹھی) جب اندر رکھی جاتی تو سب کو گرمائش اتنی ملتی جیسا کہ بخار ہو گیا ہو لیکن سردی کی سختی کم ہوتے ہی آندھیوں نے بھی پریشان کیا۔ کھڑکیوں کے پلاسٹک پھٹ جاتے آندھی کی آواز اس قدر خوفناک ہوتی کہ کلیجے دہل جاتے ایسے لگتا کہ یہ کاغذ کی چھت ابھی ہم پہ آن پڑے گی اور زنانہ بلاک میں ایک دفعہ آنے والا زلزلہ تو بھولے گا نہیں جب برجی والے پہرے دار اپنے مورچے بھی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور ہم ان کاغذی چھتوں کو ہلتے ہوئے دیکھ کر باہر نکل آئے تھے۔ ازبک عملے کا ظلم وستم تو بجا لیکن شبرغان کا موسم بھی کچھ ازبکوں کے موافق تھا۔ برف باری، بارش، آندھی، طوفان تو ابتدائی چھ ماہ میں کچھ کم نہ ہوتے، رہی سہی کسر گرمی کا موسم نکال دیتا۔ دورے پہ آئے ہوئے افسران اور عملے سے صرف منتخب وہ افراد ہی اپنے مسائل بیان کرتے، ہر ایک کو اجازت نہ ہوتی قوانین کی خلاف ورزی پر کوئی سزا بھی ہوتی ہے تو شبرغان جیل میں سزا مقرر تھی۔ جیل میں بھی امارات اسلامی کے قوانین کو زندہ رکھنے کے لئے تعزیرات کا سہارا لینا پڑا، یہ تعزیرات قید با مشقت نہ تھی بلکہ ایسی نرالی سزا کا چناؤ کیا گیا تھا کہ وقت کے لحاظ سے قانون پہ عملدرآمد ہر ایک کی مجبوری بن جاتا۔ کسی بھی قانون کی خلاف ورزی ہونے پر ایک روٹی یا آدھی روٹی کاٹی جائے گی، آدھی روٹی بمشکل ملتی وہ بھی کاٹی جائے تو کیا بنتا۔

سب بلاکوں میں استخبارات نے اپنی جاسوسی تیز کر دی تھی اور کبھی یہ جاسوس زنانہ بلاک بھی آ کر ساتھیوں سے چپکے چپکے معلوم کرتے کہ ادھر تمہارا بڑا کماندان کون ہے، روٹی کا لالچ دیتے اور مخبریوں میں سے درجن بھر افراد کو بڑے کمانڈر کے شبے میں ہاتھ پاؤں باندھ کر زنانہ جیل ڈال دیا۔ دو آدمیوں کو پاؤں سے اکٹھا باندھ رکھا تھا۔ بعد میں یہ ہتھکڑیاں کھل گئیں، انہیں دنوں دو پاکستانی ایک کراچی اور دوسرا مانسہرہ سے تعلق رکھتا تھا، تین تین لاکھ پہ ان کی رہائی ہوئی، یوں پاکستانیوں میں روپوں پر رہا ہونے والے یہی پہلے دو افراد تھے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

زنانہ بلاک والوں کا پچھلے بلاک والوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ زنانہ بلاک میں چند ساتھیوں کی ملاقات آتی رہتی۔ یوم جشن پر قیدیوں کی رہائی متوقع ہونے کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ شمال والے اس روز مزار شریف میں جھنڈا بلند کرنے کی تقریب کرتے ہیں۔

شمال کے دور دراز صوبوں اور گاؤں سے لوگ جوق در جوق اس جشن میں حصہ لیتے ہیں۔ کیا مرد کیا عورتیں اور بچے سب کے سب مزار شریف حضرت علیؓ کی طرف منسوب روضے کا رُخ کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ علاقہ مزار شریف مشہور ہے۔ باضابطہ طور پر دوستم نے قیدیوں کی رہائی کا اعلان بھی کر دیا تھا، اب ایک ہفتہ پہلے ہی دوستم کے جیل آنے پر انتظامات ہونے لگے۔ جیل کے اندر مٹی کی سڑک کو پتھروں سے بھر کر مرمت کیا گیا، دوستم کے دورہ جیل پر رہائی کے چرچے سنتے وہ دن بھی آیا لیکن بڑی دیواروں کے حائل ہونے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آتا لہٰذا کانوں نے دوستم بادشاہ زندہ باد کے نعرے سنے، دوستم کے آنے کی خوشی میں قیدیوں کو روٹی بروقت نہ دینے کا غم دیا۔ تقریباً اس روز 500 کے قریب افغان قیدیوں کو بلاکوں سے نکال کر زنانہ بلاک میں بھیج دیا۔ کھلے آسمان تلے طالبان خوشی کے مارے سو بھی نہ سکے، یہ رات بھی گزر گئی اور صبح کے وقت ان کے ہاتھوں پر لگی رہائی کی مہر دیکھ کر ہم سے علیحدہ کر کے بڑے دروازے سے باہر کر دیا اور 8 بجے کے قریب ستر کے قریب بسیں روانہ ہوتے ہی "بدنام زمانہ شبرغان جیل" سے پہلی بڑی کھیپ رہا ہو کر گھر دل کو گئی۔

اب روزانہ چاول بھی ابلے ملتے اور ساتھ ہی ریڈ کراس کا نمائندہ فالکن زنانہ بلاک ایک بالٹی دوپہر کو لاتا، جس میں سوجی والی ٹکیہ ہوتی اور ایک نان بھی۔ اب لین دین عروج پر تھا، زنانہ بلاک کے بیت الخلاء اور غسل خانے کے نکاس والے پائپ خیموں والے میدان کی طرف تھے، غسل خانے کے پائپ صاف ہونے کے باعث بات چیت کا ذریعہ بن گئے، پائپ کے ذریعے بات چیت اور خط ایک دوسرے کو ملتے، درمیان میں کھڑی 15 فٹ کی دیوار کے آر پار اب سامان فضا میں پھینک کر تبادلہ ہوتا، سب ساتھی غسل خانے کو پی۔ سی۔ او کہنے لگے، کسی ساتھی کو کوئی بلاتا تو ساتھی اس کا نام لے کر پکارتے کہ فلاں کا پی۔ سی۔ او فون آیا ہے، خیمے والے امیر ہو گئے تھے اور اپنے دوستوں کو اکرام کے طور پر چیزیں بھیجتے رہے۔ اس کے علاوہ خیمے والوں کو نئے کمبل مل گئے، یوں زنانہ بلاک میں کمبلوں کا کاروبار شروع ہو گیا، ازبک عملہ ہر قسم کی ردی چیز بھی لینے کو تیار تھے، زنانہ بلاک کے کونے پر واقع برج سامان کی آمد و رفت کا ذریعہ تھا اور سب سے سستا سامان

ادھر سے ملتا ورنہ جو سامان گیٹ سے سپاہی اندر لے جاتے تو اس پر دروازے والوں کو خوش کرنا پڑتا جو کہ دوگنی قیمت پر ملتا، مزے کی بات یہ کہ جیل کی واحد برجی تھی جہاں سے ساتھی رابطے کر کے سامان منگواتے۔

انہی دنوں ایک مرتبہ پھر رہائی کا شوشہ چھوٹا اور 5 مئی کو اٹلی کی ایک تنظیم بھی جیل کے اندر قیدیوں کی امدادی کارروائی کرنے کا این۔ او۔ سی مل گیا۔ ایمرجنسی 1994ء میں اٹلی کے شہر میلان میں قائم ہوئی اور 1999ء سے طالبان دور میں افغانستان کے اندر اپنی امدادی کارروائیاں شروع کیں۔ اس کا ڈائریکٹر گینو سٹراڈا ہے اور افغانستان میں ان کی کوارڈینیٹر میڈم KATE تھی جو کالے لباس میں ملبوس رہتی۔

8 مئی کو بلاک اور دو دن بعد زنانہ بلاک والوں کی رجسٹریشن ہوئی، ہر ایک ساتھی کو ایمرجنسی کا ڈول مل گیا لیکن خیمے میں ریڈ کراس والوں نے ان کو داخل ہونے سے روک دیا، جس سے ان کا اندراج رہ گیا۔ انہی دنوں پاکستان کے انسانی حقوق کے نمائندے شبرغان جیل کے دورے پر آنے والے واحد پاکستانی تھے۔ انہوں نے تمام قیدیوں کی رہائی کا کہا تھا لیکن رہائی مرحلہ وار ہونی تھی اور پہلے مرحلے میں 11 مئی کو 200 قیدیوں کو تمام بلاکوں سے چھانٹی کر کے علیحدہ کیا اور کرہ خالی میں رات رکھنے کے بعد صبح کے وقت رہا کر دیا۔ اس دوران قیدیوں کو ایمرجنسی نے نئے کپڑے بھی رہائی کی خوشی میں دیئے تھے۔ پاکستانی نمائندے نے جب قیدیوں کی صورت حال سنی اور دیکھی تو وہ بھی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا اور تقریباً دس پندرہ دن کے اندر مزید قیدیوں کی رہائی کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ یہ رہائی اچانک ہوئی کیونکہ ریڈ کراس کو بھی اس کی کانوں کان خبر پہنچی، اس رہائی کا ان کے خیموں پر بھی اثر پڑا اور ان کا پروگرام خراب ہو گیا اور جب قیدی کمزوری اور بیماری کی حالت میں پاکستان پہنچے تو میڈیا پر اس دفعہ قیدیوں کی طرف سے ریڈ کراس کی بروقت کارروائی نہ کرنے کی خبریں شائع ہوئیں۔

پہلی مرتبہ پاکستانی قیدیوں کی رہائی پر جیل میں وسعت آ گئی۔ چند دنوں بعد خیموں میں موجود ساتھیوں کا وزن برابر ہونے سے زنانہ بلاک بھیج دیا، چند ہفتوں بعد زنانہ بلاک میں 80 کے قریب ساتھی پھر آ گئے اور اتنی تعداد میں ساتھی رہا ہوئے تھے۔ اس دوران کاروبار میں تیزی اس وقت آئی جب ساتھیوں کے بچے کھچے سامان اور کمبلوں کو برجی والوں نے لینے کی حامی بھری، ایک ساتھی اس دیوار کے پار سے کمبل پھینکنے لگا تو زنانہ والی دیوار کی برقی تار کی لکڑی ٹوٹ گئی،

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بلاک کے ذمہ دار حضرات نے نوٹس لیا اور متفقہ فیصلے کے ساتھ دو ماہ پہلے والے قانون کو نافذ کر دیا۔ پشتون ساتھیوں کی تعداد تقریباً برابر تھی اور نئے ساتھیوں کے لئے یہ علاقہ غیر محسوس ہوتا اور وہاں کے پشتون ویسے بھی پوری جیل میں قبائلی مشہور تھے۔ باقاعدہ ایک ساتھی کاتب کے فرائض انجام دیتا وہ اور اس کے معاون انٹیلی جینس والوں کی طرح دن رات نگاہ رکھتے، جو بے چارہ اس قانون کی زد میں آتا اسے بھی اس وقت پتہ چلتا جب روٹی کمرے میں تقسیم ہوتی کہ آج فلاں صاحب نے غسل خانوں کی طرف ہیلو کیا تھا، یہ کاٹی ہوئی روٹی سب کمروں میں تقسیم ہوتی۔ خیمے والے تو روزانہ دودھ پیتے لیکن باقی بلاکوں والوں کی بھی اللہ نے سن لی اور ایمرجنسی کے ذریعے ہمیں بھی خشک دودھ چینی اور پتی نمک وغیرہ..... مل گیا اب بخاری پر رش نے قطاریں لگوا دیں لیکن گیس تیز ہونے کے باعث اس کے اردگرد سلاخوں سے لٹکے چھوٹے ڈبے جلد تیار ہو جاتے، جب دودھ چینی اڑ گیا تو بے دودھ کی جائے اور قہوہ شروع تھا جس میں نمک بطور چینی ڈالا جاتا، پتی ختم ہو جاتی تو نمک ملا پانی شروع ہو جاتا، نمک جاتا تو پھر بھی بخاری کی جان نہ چھوٹتی، ساتھی ابلا پانی لیتے اور کئی اس کو ٹھنڈا کر کے پینے میں استعمال کرتے۔

جون کا مہینہ شروع ہوتے ہی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے سائے کی تلاش رہتی، اس بلاک کی تازہ آب وہوا کے علاوہ جیل سے باہر بچوں کے شور شرابے اور قریب موجود شبرغان کی بڑی سڑک پر ٹریفک کے سائرن اور آوازیں کبھی کبھی دل بہلاتی تھیں لیکن پتہ چلا کہ زنانہ بلاک کے تمام ساتھی بلاکوں میں منتقل ہوں گے۔ اس سے پہلے ریڈ کراس والے پھر خطوط لے کر آئے تھے چنانچہ ایک دن رخت سفر باندھنے کا حکم ہوا، تبدیلی کے وقت کمروں میں لگے بلب، ہولڈر اور بجلی کی تاریں سب غائب ہو گئیں، کارپٹ تک نہ نظر آئے۔ یہ بلاک اس طرح ویران ہو گیا جیسے پہلے تھا۔ بلاکوں کی تبدیلی کے وقت ایمرجنسی تنظیم والے خارش کی دوائی لے کر آئے تھے، ہر ساتھی کو بنزولوشن ملتا رہا اور عسکر لوہے کے برتن ہم سے چھینتے رہے۔ اب بلاکوں کی بھی نئی ترتیب بن گئی، ایک جنائی بلاک افغانیوں سے بھر دیا اور سیاسی بلاک میں پاکستانی آ گئے اور تیسرا خصوصی بلاک افغانی اور پاکستانی کمانڈروں سے بھر دیا۔ ان تینوں بلاکوں کے نام جیل اندراج رجسٹر اور روٹیوں کی لسٹ میں ترتیب سے درج تھے۔

نئے بلاک میں پہلے دن ساتھی پرانے بچھڑے دوستوں سے گلے ملتے رہے، آصف بھی مجھے ملا اور اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ ہم سب ساتھی انتہائی خوش تھے۔ پچھلے حالات کا تبادلہ

ہوتا رہا۔ اسی رات ایک پاکستانی کا قتل ہو گیا جس کے بارے میں یہ واضح ہوا تھا کہ یہ اندر کے تمام حالات کی مخبری کرتا تھا، طالبان کے ملاؤں کے فتوی کے مطابق وہ اپنے انجام کو پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد پاکستان بلاک میں ہلچل مچ گئی، جو پھیلتے پھیلتے پوری جیل حتیٰ کہ شبغان شہر میں دوستم کا سیکرٹریٹ (ریاست کا دفتر) اور ہسپتال پورے شبرغان شہر میں گویا شور مچ گیا کہ جیل میں پاکستانیوں نے قتل کر دیا۔ جیل کا عملہ اور استخبارات والے اور پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر بھی کئی دنوں تک اس کا سراغ لگاتے رہے۔ روایتی طور پر پوچھ کر اور تصویریں کھینچ کر چلے گئے اور اس کے بعد جنوبی کوریا کی ایک ٹیم آئی جس میں ایک عورت بھی تھی پہلی مرتبہ کسی ٹیم نے اندر آ کر قیدیوں سے مفصل معلومات حاصل کیں حتیٰ کہ یہ تین دن مسلسل صبح سے شام تک بلاکوں میں پھرتے اور ایک ایک کمرے بیت الخلاء اور غسل خانے کے علاوہ دیواروں پر لکھے گئے اشعار تک کی فلم بناتے رہے۔

جون کے مہینے میں گرمی کا زور ہوا تو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا علاقہ ہے کہ سردیوں میں برف باری اور گرمیوں میں سخت گرمی حالانکہ یہ سارا علاقہ میدانی تھا۔ جیل کی کھڑکی سے مزار شریف کے پہاڑ نظر آتے جو کہ اتنے دور تھے کہ صرف صبح کے وقت سورج نکلتے ہوئے یا سردی میں برف پڑنے کے بعد واضح ہوتے۔ پانی کی ضرورت بڑھ گئی کیونکہ غسل خانے ہر وقت کھچا کھچ بھرے رہتے اور نہانے والوں کی قطار لگی رہتی، کمروں میں دن رات شدید حبس بڑھ جاتا، اس لئے گرمی کا اندازہ آپ سے لگائیں کہ جیل میں ایک بیمار ساتھی ابوعلی شہید ہو گئے تو جیل انتظامیہ سے صدیقی صاحب نے بات کر کے اندر جنازہ پڑھنے کی اجازت لی، جنازے کے دوران دوپہر کے وقت ننگے پیر آدھا منٹ زمین پر کھڑا ہونا مشکل تھا، ساری رات گرمی کی وجہ سے نیند نہ آتی، باہر بیرک میں آوارہ ہو جاتا تو وہاں پر بھی سونے والوں کا رش تھا۔ صابن کے کارٹن سے دستی پنکھوں کا کام لیا جاتا۔

اگست 2002ء کا اختتام تھا اور گرمی کی شدت کم ہو رہی تھی، اسی طرح ہلکی گرم صبح جیل کے اندر اور بلاکوں کی صفائی کا حکم ہوا، ایک مامور سے پتہ چلا "امروز ہیئت می آمد" (آج نمائندے آ رہے ہیں) اتفاق سے صحافیوں کو دیکھنے کے لئے میں بھی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیل کا چھوٹا دروازہ کھلا اور تینوں بلاکوں کے دروازوں پر اس وقت دو دو تالے لگا دیئے جاتے۔ دو عورتیں اور مرد ایک مخلوط ٹیم آ گئی، روایتی صحافیوں والے انداز سے وہ داخل ہونے کے بعد

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اپنی ریلیں ختم کرنے لگے۔ میڈیا والے پہلے پاکستانی بلاک پر آتے۔ دروازے پر کھڑے افراد سے انٹرویو شروع ہو گئے۔ چند باتیں مجھے بھی کرنے کا موقع ملا، انٹرویو کے بعد میں نے اسے وزیٹنگ کارڈ مانگا، ان کے ترجمان نے ان سے کہا تو گورے نے فوٹو گرافر کی طرف اشارہ کیا اور دو عدد کارڈ مجھے دیئے۔ فطرتی طور پر مجھے ہر معاملے کی تحقیق اور تجسس کا شوق تھا، اس لئے اکثر صحافیوں سے بات کرنے سے پہلے ہی ان کا تعارف پوچھ لیتا۔ یہ اصل میں برطانیہ کے اخباری گارڈین کی ٹیم تھی۔ اس میں لیوک ہارڈنگ، ساؤتھ ایشیا کارسپونڈنٹ تھا اور فوٹو گرافر مین سمتھ تھا۔ یہ ٹیم ایسے سوالات کرتی جس سے معلوم پڑتا کہ یہ کسی مہم کے تحت بھیجے گئے ہوں، ان کی زبان پر کنٹینر اور دشت لیلیٰ کا ذکر بار بار آتا تھا، ان کو تفصیلی بیانات دیئے گئے، یہ ٹیم ڈیڑھ گھنٹے تک بلاکوں سے باہر سوال و جواب کرتی رہی۔ ٹیم کے جانے کے بعد چند روز بعد یورپین اور امریکن ٹی وی اور اخبارات کے نمائندوں کی گویا قطار لگ گئی۔ صحافیوں کی آمد کا سلسلہ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا۔ بی بی سی، سی این این، سی بی ایس وغیرہ کئی چینل انٹرویو کی فلمیں بناتے رہے۔

امریکہ کے خلاف بیانات اور ٹیلی ویژن پر کئی ساتھیوں کے براہ راست انٹرویو نے امریکی ایف بی آئی کے بھر کان کھڑے کر دیئے۔ اس لئے ایف۔ بی۔ آئی کی طرف سے ہر سال شبرغان جیل کے قیدیوں کو تحقیقی مراحل سے گزارنے کے لئے باقاعدہ اوپر سے منظوری ہو گئی، جس کا واضح ثبوت پاکستان اور افغانی حکام کے آئے روز اخبارات اور ٹی وی میں شبرغان جیل کے قیدیوں کی رہائی کے اعلانات تھے، خبر بھی چھپ گئی تھی کہ پشاور سینٹرل جیل میں کئی بلاک شبرغان جیل کے قیدیوں کی جلد رہائی پر خالی کروا لئے اور حتیٰ کہ وہاں پر سفیدی اور تمام انتظامات مکمل تھے۔ پشاور ایئرپورٹ پر باقاعدہ جہاز مزار شریف کی پرواز کو تیار کھڑے تھے، قارئین خود اندازہ لگائیں کہ دونوں حکومتوں کے متفقہ رہائی کے فیصلے کو بالآخر کس اشارے پر برطرف کیا گیا تو آپ کے دماغ میں یہی سوال ابھرے گا کہ یہ سب امریکہ بہادر کے اشارے پر ہوا۔

جنرل دوستم کے وفادار حکام جو کہ ازبک نژاد ہیں جیل کا عملہ تو امریکہ کی خدا سے بھی زیادہ اطاعت کرتا تھا اور پاکستانیوں سے حد درجہ نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ازبک مارتے پہلے تھے پھر بعد میں پوچھتے "چہ گپ دست" کیا بات ہے گناہ گار اور بے گناہ کا فیصلہ بعد میں کرتے تھے، انہیں میں ایک مامور عبدالمنان کانا پاکستانیوں کا سخت دشمن تھا۔ اسے اردو کا صرف ایک لفظ جاؤ آتا تھا، گنتی کے لئے نکالتے وقت بس آؤ، جاؤ کا ورد کرتا رہتا۔ امریکی صحافی جانے کے چند روز

بعد ایف۔ بی۔ آئی کی ٹیم وارد ہوئی اور مطبخ کے سامنے والے کمرے میں ڈیرہ ڈالا، اس دفعہ ان کے ساتھ انڈیا کا ایک ترجمان تھا جو کہ پاکستان کی علاقائی زبانیں بھی بول لیتا تھا۔ امریکی ٹیم کی آمد پر پوری جیل کو اپنے کمروں میں مقفل ہونا پڑتا اور ایک سناٹا سا چھا جاتا ہم نے کئی بار آزمایا، جب بھی جیل میں سناٹا چھا جاتا تو امریکی تھوڑی دیر بعد آ جاتے۔ استخبارات نے اپنی رپورٹ میں پاکستانی افراد کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ پاکستانیوں کے کماندان ہیں۔ کچھ افراد پر برمی اور بنگالی ہونے کا بھی الزام تھا حالانکہ ان کی سکونت پاکستانی تھی۔ یہ ناموں والی لسٹ اپنی آنکھوں سے مامور کے ہاتھ میں دیکھی اور تمام نام فارسی طرز پر لکھے تھے جیسا جیل کا عملہ لکھتا تھا۔ اس لسٹ کے ساتھ استخبارات کا ایک آفیسر آیا، جسے مدیر ہفت کہتے تھے۔ تمام لسٹ والوں کی تحقیقات ہو گئی لیکن بعد میں سوچا کہ امریکی خود نہیں آئے بلکہ بلوائے گئے تھے، وہ یوں کہ اگر ناموں کی لسٹ امریکی لاتے تو ضرور انگلش میں ہوتی مگر یہ لسٹ فارسی میں تھی۔ ان میں صدیقی صاحب بھی شامل تھے۔

صدیقی صاحب نے اپنی تحقیق کے دوران ایف بی آئی کو بتایا کہ میں افغانستان پاسپورٹ اور ویزے پر آیا ہوں اور باقاعدہ طور پر اپنا ٹکٹ نمبر اور فلائٹ نمبر بھی انہیں بتا کر کہا کہ ایئرپورٹ سے فلاں تاریخ کی انٹر لسٹ بھی چیک کر سکتے ہیں لیکن ان کو غیر قانونی طور پر بالآخر 2003ء میں گوانتاموبے میں منتقل کر دیا۔ صدیقی صاحب کے ساتھ کیوبا جانے والے بھائی فاروق سے بھی ایف بی آئی کے انڈین ترجمان نے کئی گھنٹوں تحقیق کی اس ترجمان نے اپنی ایک ذہانت دوران تفتیش لڑائی، یہ بات اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ان انٹیلی جنس والوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا معمولی سی بات پر بھی انسان کو پکڑ لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب کی جب تحقیق ہوئی تو باتیں کرتے کرتے اس ترجمان نے ان کے سامنے والی جیب میں لگا پین نکال لیا اور پین کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد دوبارہ لگا دیا اور کہا کہ فاروقی تم سے پہلے ایک شخص تحقیق کے لئے آیا تھا، اس کی جیب میں سستا قلم تھا اور تمہاری جیب میں یہ مہنگا قلم ہے اور اس شبرغان جیل میں جس کے پاس یہ قلم ہو تو وہ بندہ ضرور کوئی بڑا کمانڈر ہو سکتا ہے اور تم خود اب اقرار کر لو کہ تم بھی پاکستانیوں کے کمانڈر رہو۔ فاروقی بھائی نے یہ واقعہ بتا کر کہا کہ ترجمان کی اس ذہانت پر واقعی بڑے سے بڑا شخص گھبرا جاتا تھا وہ مسلسل ترجمان کی ہر بات کو رد کرتے رہے۔

نومبر 2002ء کے شروع اور رمضان المبارک سے چند دن پہلے ایف بی آئی کی ٹیم جیل

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں آنا شروع ہوگئی ان کے آنے سے جیل میں ویرانی سی پھیل جاتی، تحقیق سے قبل امریکی کمانڈوز جیل کی برجی اور دیگر اطراف کا بھی نظارہ کرتے رہے؛ اس دفعہ اب قیدیوں میں سے چند افراد کو کیوبا لے جانے کا شور اٹھا اور تحقیق سے ایک مہینے قبل آنے والی لسٹ والوں میں بھی سنسنی سی پھیل گئی۔ اچانک ایک صبح پھر اکھاڑہ لگ گیا اور جب کئی ساتھی آنکھیں ملتے ہوئے بستر سے نکلے تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔ بلاک میں ایک دفعہ پھر شور برپا ہوگیا، امریکیوں کی آمد کے تبصرے شروع تھے، اچانک وہاں کے افسر عسکروں سمیت ہتھکڑیاں لے آئے اور اب کمرہ وار تحقیق کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔

ایف بی آئی کی تحقیق پہلے سے منفرد انداز میں تھی اور اس مرتبہ ان کا تجربہ بھی بڑھ گیا تھا کہ قیدیوں کے دماغوں کو کس طرح ٹٹولا جائے، وہی پرانے ترجمان ان میں وہ انڈین بھی شامل تھا جو کہ ہر ساتھی کو نفسیاتی طور پر سوالات کا نشانہ بناتا۔ جہاں تک ترجمان کا معاملہ تھا تو ایف بی آئی کے پاس اپنا کوئی ایسا امریکی نہ تھا جو کہ اردو، فارسی اور پشتو و دیگر زبانیں جانتا ہو، اس لئے امریکہ کو افغانستان، انڈیا اور پاکستان کے افراد کی ضرورت پڑی اور انہیں بھرتی کیا۔

ہمارے کمرہ نمبر 3 کی باری آئی اور ہم سب قطار میں بیٹھ گئے اور تحقیق سے پہلے جیل کے عملے کو نام لکھوانا پڑتا۔ اپنا نام لکھوایا اور ہتھکڑی پہنانے کے بعد مکمل جامہ تلاشی کر کے امریکیوں کی طرف بھیجا۔ پوری جیل میں انتہائی سخت سیکورٹی تھی اور مسلح کمانڈوز ہر طرف پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ کمرے سے باہر صحت میں کچھ فاصلے پر سفیدی سے گول دائرے بنے تھے، ان میں قیدیوں کو بٹھایا جاتا اور باری پر سامنے موجود دو کمروں میں تحقیق کے لئے لے جایا جاتا۔

میرا نمبر آیا اور ریڈ کراس کے کمرے میں تحقیق نصیب ہوئی، کمرے میں ایف بی آئی کے آفیسر اور ترجمان بیٹھے تھے ٹیبل پر پڑے ٹیپ ریکارڈ کے اندر کیسٹ گھوم رہی تھی۔ ہتھکڑی کھولنے کے بعد قریب کھڑا فوجی فنگرز پرنٹ لینے لگا۔ پوچھنے پر پشتون بتایا اور صرف پشتو میں گپ شپ شروع ہوگئی۔ میرا نام پوچھا! تو جلدی سے آفیسر نے میز کے طاقچے میں پڑی فائل اٹھائی اور میرے والد کا نام لکھ دیا، میں چونکہ پہلے ہی سے محتاط ذہن بنا کر آیا تھا اور میری نگاہ باوجود افسران اور ترجمان کے گھورنے کے ان کاغذوں پر مسلسل پڑتی رہی جس میں وہ نام ڈھونڈ رہا تھا، یہ اصل میں ریڈ کراس کی لسٹ تھی، میرے والد کا نام آفیسر نے بتایا تو کوئی توجہ نہ دی لیکن جب اس نے ICRC کارڈ کا پوچھا اور میں نے کارڈ نکالا تو لپکتے ہاتھ کارڈ مجھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے تمبر

دیکھنے لگا۔ ترجمان نے افسر سے انگلش میں ادکے کہہ دیا۔ اسی اثناء میں ابھی میرے سامنے موجود تحقیقی افسر میز پر نام ولدیت اور پتہ لکھ رہا تھا اس کے بعد اسی کارڈ پر انگلیوں کے نشان لگواتے ہوئے اس میں ایک خانہ وزن کا دیکھا جس میں 55 کلو وزن لکھا ہوا تھا، اس کارڈ نما فنگر کے اوپر سرحرف فیڈرل بیورو انویسٹی گیشن لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے حواس کو قائم نہ رکھ سکا، اس تصدیق کے لئے میں نے زمین پر اپنے پیروں کے قریب گھورا تو کوئی ویٹ مشین بھی نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ میں بالکل پُرسکون ہوں، اس کارڈ پر ہر انگلی کا نام اور خانہ علیحدہ بنا تھا، حتیٰ کہ ہتھیلی کا بھی خانہ تھا۔ دونوں ہاتھ کالے کرنے کے بعد امریکی نے ٹیبل پر پڑے ایک ڈبے سے فریش سوپ پیپر میرے ہاتھ میں دیا اور مجھے کہا اس کو اپنے ہاتھوں پر ملتے رہو۔ اسی وقت اپنے ہاتھ صاف کئے اور یہ صابن نما کاغذ کوڑے دان میں پھینکا۔ مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی کیونکہ پشتو والوں کو یہ دیہاتی سمجھ کر جلدی فارغ کر دیتے؛ اب کمرے میں ایک ایجنٹ نے مجھے لیا اور دیوار سے کھڑا کر کے ہاتھ پکڑے، کیمرے سے تصویریں لینے لگا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں سامنے کو ایک آدمی کی دسیوں تصوریں اتارتے رہے۔ تحقیقی عملے والوں نے سوری کہہ کر مجھے جانے دیا، اب جاتے ہوئے اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھولنے میں مصروف ہیں کہ میرے والد کا نام بغیر بتائے لکھا اور کارڈ چیک کیا اور سب سے حیرت والی بات کہ وزن 55 کلو کہاں سے لکھا، اچانک ذہن ایک ماہ پہلے کئے ہوئے ریڈ کراس کے وزن پہنچ گیا کیونکہ میرا وزن 55 کلو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور میں ہر بار اپنا وزن ضرور دیکھتا یا معلوم نہ پڑنے پر ریڈ کراس والوں سے پوچھ لیتا تھا، یہ سارا کھیل دماغ میں فلم کی طرح گھوم رہا تھا۔ اصل کہانی خاموشی اور سنسنی کو توڑتی ہوئی واضح ہوئی کہ یہ ریڈ کراس کی لسٹیں ایف بی آئی لے کر آئی تھی، اس تحقیق کے بعد میں جیل میں ہونے والے ہر معاملے میں دلچسپی لینے لگا۔ اس پوائنٹ پر افغانستان کے ایک سینئر ریڈ کراس کے نمائندے کو بھی پکڑا اور اسی نقطے کو میں نے پشاور جیل میں ریڈ کراس کے نمائندوں کو پھنسایا۔ تو ہر دو معاملے میں ان کے چہرے فق ہو گئے تھے؛ وہ اس بات کو جھوٹ کہتے۔

اس تحقیق میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے پتہ چلا کہ یہ ایف بی آئی ہے ورنہ پہلے تو دوسرے ساتھیوں کی طرح میں بھی امریکی ہی کہتا تھا۔ بلاکوں کے قریب پہنچنے پر نام لکھنے والے مامور نورالحق نے روک دیا، کیونکہ میں نے اس کے لکھے ناموں کی تصحیح کی تھی جس کی وجہ سے اس نے مجھے کہا کہ کالی [illegible] سے نکلے گئے ساتھیوں کے نام لکھو یہ نام جیل کا اپنا ریکارڈ تھا، اسی وقت

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پیشاب کا بہانہ بنا کر پانچ نمبر کمرے کی طرف لپکا اور بھائی نعمان سے مشورہ کیا کہ یہ کوچی نام لکھنے کا کہہ رہے ہیں، انہوں نے ترغیب دینے کے بعد اجازت دی تو میں نے نام لکھنے شروع کر دیئے، نام لکھتے ہوئے ساتھیوں کو ترغیب دیتا رہتا کہ کس طرح ان کے سوالات کے جواب دینے ہیں، ساتھ ہی تحقیق سے واپس آنے والے ساتھیوں کے تاثرات جانتا رہا، انڈین ترجمان کے بارے میں ہر کوئی کہتا کہ یہ بڑے تلخ سوال کرتا اور کڑوے جواب پاتا رہا۔ کئی ساتھیوں کو امریکیوں نے کیو بالے جانے کی دھمکی بھی لگا/ ایمرجنسی والے دوران تحقیق مریضوں کو ہسپتال کی طرف ریفر کر رہے تھے، دوران تحقیق سخت برفباری بھی شروع ہوگئی۔ اس دفعہ ٹی بی کے بلاک والوں کی تحقیق نہ ہوئی کیونکہ امریکی ٹی بی والوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہم میں جراثیم منتقل نہ ہو جائیں۔ انہیں دنوں مطبخ سے چاول لانے والے افغانیوں کو قطار بنا کر اکٹھے نکلنے اور ہاتھ پیچھے باندھ کر آنے جانے کا حکم تھا۔ افغان بلاک والوں کی بھی تحقیق ہوگئی۔ ایف بی آئی تحقیق کر کے چلی گئی لیکن یہ سوال چھوڑ گئی کہ خدانخواستہ کب ساتھیوں کو کیو بالے جائیں گے؟

رمضان المبارک کے دوران شام کو ہی چاول، لوبیہ اور ڈھائی روٹی مل جاتی، اس کے علاوہ جیل کے اندر ایک شخص باہر سے اپنے بچوں سمیت بالونی (دال کی چپاتی) بیچتا جو کہ سموسے کے طور پر استعمال ہوتی، عشاء کی نماز اور تراویح میں انتہائی سکون محسوس ملتا، بالآخر جیل میں ہماری مجموعی طور پر تیسری عید آ گئی، رہائی کا شوشہ بھی عیدین کے قریب ہی چھوٹتا لیکن "یہ وقت بھی گزر جائے گا" کے فقرے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ عید سے چند دن پہلے "ایمرجنسی" نے عید پیکیج دیا جس میں کھجور، دودھ، چینی اور بسکٹ وغیرہ تھے اور نئے کپڑے بھی مل گئے، پچھلی عیدوں کی نسبت یہ کافی جوش و خروش والی تھی، صبح کے وقت ساتھی ایک دوسرے کے کمروں میں جا کر مبارکباد دیتے رہے، سارا دن دودھ والی چائے، سویاں اور حلوے چلتے رہے، قہوے کی چھٹی رہی، دوپہر کو جیل کا برنج چاول بھی نہ کھائے، عصر کے وقت خوشی مزید بڑھی جب ایک ساتھی نے اجتماعی روپوں سے قیدیوں کے لئے قاری صاحب کے توسط سے پیک مرغی کا گوشت دیگر مصالہ جات اور نان وغیرہ منگوائے، چار ساتھیوں پر ایک کلو گوشت پہنچا کیونکہ ایک سال گزرے گوشت دیکھا تک نہ تھا۔ قاری صاحب شبرغان جیل کے سابقہ جیلر تھے۔ ان کو اردو، پشتو، فارسی اور ازبکی مکمل آتی تھی، ان کی ایک ٹانگ بھی نہ تھی، طالبان کے بڑے کمانڈروں میں ان کا شمار تھا، پاکستانی بلاک آ کر سب کو عید کی مبارکباد دی اور صبر و استقامت سے جیل کے اوقات کاٹنے کی تلقین کی، عید کے تمام دن

ہنسی خوشی گزرے۔

برفباری کا نیا سلسلہ شروع ہوا، اس دفعہ برف باری اتنی شدید تھی کہ ٹینکی کا پانی پائپوں میں برف بن گیا، پائپوں کے جوڑ کئی جگہ سے سردی کی وجہ سے تڑک گئے تھے، اب پھر سال پرانا دور تازہ ہوا، بیت الخلاء میں ہر طرف ڈھیلے اور ٹشو نظر آتے دیواروں سے چونا اکھڑنا شروع ہو گیا کیونکہ اب تیمم سے نماز پڑھی جاتی، ازبک عملے نے تالاب بھر دیا لیکن وہ بھی برف بن گیا تھا۔ کافی دن سخت برف باری سے زمین پر گویا برف کی تہہ جمی ہوئی تھی، ایک روز غسل کرنے کی ضرورت پیش آئی پانی کے لئے جب بلاک کا دروازہ کھلا تو تالاب پر جا کر صرف دو لوٹے بہا کر غسل سے فارغ ہوئے، پانی کا ایک لوٹا ڈالتے ہی پورا جسم بے جان ہو گیا اور سانس تک اکھڑ گیا۔ تیزی سے دوسرے لوٹے کو بھی بہا دیا، پورے جسم کی سکت ختم ہو گئی گویا پورے بدن پر کپکپی سی طاری ہوئی، لڑکھڑاتے، گرتے اور چکراتے اطاق میں پہنچا اور کپڑے بدل کر کمبلوں میں گھس گیا، ایک گھنٹے تک دانت بجتے رہے، بدن تھراتا رہا، زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ انہی دنوں سال کے آخر میں افغان کرنسی تبدیل ہوگئی، بلاک کے سب ساتھیوں نے دولتی نوٹ اکٹھے کر کے جمع کروا دیئے اور امریکہ کی طرف سے جاری کردہ ایک، دو، پانچ، دس، بیس، پچاس، سو، پانچ سو اور ایک ہزار کے نئے نوٹ افغانستان میں شروع ہو گئے۔

جنوری 2003ء میں ریڈ کراس نے پہلی مرتبہ کتابیں لا کر دیں جن میں شیکسپیئر کے ناول کے اردو تراجم دیگر ناول اور کئی غیر اخلاقی کتابیں شامل تھیں، شبرغان جیل میں ٹی بی کے مریضوں کی رہائی کے سلسلے میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم معائنے کے لئے آئی، سب مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد ان کے ساتھ ایک لسٹ میں ok اور nill کا نشان لگاتے رہے، تقریباً 65 کے قریب مریض او کے کی کیٹیگری میں شامل ہوئے، یوں مریضوں کی رہائی کا شوشہ چھوٹا اور جیل کے دروازے سے باہر کرنے کی بجائے ان مریضوں کو اس وقت کے مامور یما خان اور عبداللہ نے اوپر کی طرف سے سیکورٹی نامکمل صورت کے تحت ہمارے ساتھ بلاک میں منتقل کرنے کا آئندہ چند دنوں میں پروگرام بنایا۔

انہیں دنوں کابل سے تحقیقات کے لئے بھی ایک ٹیم آئی جسے کچھ ساتھی استخبارات اور کئی کہتے یہ افغانستان کی خفیہ ایجنسی خدمت اطلاعات دولتی جس کا مخفف "خاد" ہے۔ یہ ٹیم والے بھی سوئر انداز سے تحقیق کرتے رہے، سب سے پہلے پاکستانی بلاک کو باہر نکالا اور ہر ایک کے نام پر

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ایک فارم پُر کرتے، شروع میں ان کے کارندوں نے سخت سوال و جواب کئے، جہاد کے تو گویا امریکیوں سے زیادہ دشمن تھے، ان فارموں میں تاریخ بھی افغانستان کے سرکاری قانون کے مطابق شمسی مہینوں کی لکھی جاتی اور قندوز سے تسلیم ہونے والوں کے خانے میں ''عقرب'' لکھ دیتے تمام بلاکوں کی کاغذی کارروائی چند دن ہوتی رہی اور آخری دن صرف تصویری کارروائی ہوئی تو پاکستانیوں کو باہر نکالا اور اپنے ڈیجیٹل کیمرے میں تصویریں محفوظ کرتے رہے۔

O

نیا باب

عیدالاضحیٰ کا رہ رہ کر انتظار تھا، یہ عید آئی تو سردی کے نام تھی، سخت سردی نے سب ساتھیوں کو کمروں میں رکھا پانی کا نظام ویسے بھی معطل رہا اور تالاب کا پانی ہی استعمال ہوتا، اب چوتھی عید جیل میں آ گئی اور چلی گئی معلوم ہی نہ پڑا ''ایمرجنسی'' کی نئی لیڈی ڈاکٹر سیریل نے اپنی ڈیوٹی سنبھالی۔ بڑی عید کے بعد یوم جنبش پر رہائی کی خبریں زور پکڑ جاتی، بس ان خبروں نے ہی شبر غان جیل میں ڈیڑھ سال نکلوا دیا تھا، بلاک میں عبدالمنان کا نا آیا اور اس نے ہر کمرے کے ذمہ دار کو بلا کر مختصر فارسی میں تقریب کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران اس نے آزادی کا لفظ استعمال کیا تو پھر کیا دیکھنا سب کے سب جمع شدہ افراد نے رہائی کی خوشی کا سن کر دوڑ لگا دی، ابھی وہ اپنی بات ہی مکمل نہ کر پایا تھا کہ شور مچ گیا اور سب اپنے جوتے اور کپڑے پہننے لگے، رہائی گویا نشہ بن گیا تھا، جس نے کئی افراد کو مدہوش کر دیا، جیل میں موجود سفید ریش بوڑھے بھی رہائی کا سن کر خوش تھے اور بلاک کا دروازہ کھلا اور کھلے میدان میں سب رہائی کا انتظار اور معافی تلافی کرتے رہے، ایک گھنٹے کھلے میدان میں افسران اور رہائی کی لسٹ کا انتظار اس وقت ختم ہوا جب عسکر نے آواز لگائی ''داخل برو'' یہ تو ہر کوئی سمجھ جاتا تھا کہ اندر جاؤ، ساری رہائی کھٹائی میں پڑ گئی۔ عبدالمنان اصل میں یوم جنبش کے حوالے سے آزادی کا جشن منانے کا کہہ رہا تھا جس کی تقریب مزار شریف میں جھنا بالا (پرچم کشائی) کی شکل میں ہوتی ہے۔ افراتفری میں فارسی جاننے والے ساتھی بھی بات سمجھ نہ پائے، یوں شمالیوں کا جشن ہم نے ایک گھنٹہ اپنی رہائی کے جشن میں منایا۔ کئی ساتھی بلاک میں داخل ہوتے وقت عبدالمنان کو کوستے رہے کہ کئی افسروں نے تو رہائی کا جھوٹ بولا لیکن آج کانے نے بھی جھوٹ بول دیا۔

اس واقعے کے بعد رہائی نہ ہونے پر مایوسی ہوئی اور انہی دنوں مارچ 2003ء میں امریکہ کے عراق پر حملہ کرنے کی خبریں شروع ہوئیں اور جب عراق پر حملہ ہوا تو ساتھیوں نے خوب رورو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کے مجاہدین کے لئے اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعائیں مانگیں، باقاعدہ قنوت نازلہ ہر کمرے میں فجر کے وقت نماز میں پڑھی جاتی، اس زمانے میں جتنی قنوت نازلہ شبرغان جیل والوں نے پڑھی شاید ہی کسی نے پڑھی ہو۔

موسم گرما شروع تھا، تقریباً مہینے بعد رہا ہو کر جانے والے ساتھیوں کے خطوط بھی پشاور جیل سے آگے ریڈ کراس والے جب بھی خط لاتے تو بیرک میں ہلچل مچ جاتی، اس جگہ واحد خطوں کا ہی آسرا تھا، کئی ساتھیوں کا تو ڈیڑھ سال تک خط ہی نہ آیا اور کسی کے خطوں کا ایسا تانتا بندھتا کہ ہفتہ بھر خط پڑھنے اور جواب دینے میں گزر جاتا اس دوران کئی نظم والے ساتھی اپنے مخلص دوستوں سے بچھڑ چکے تھے اور ہر ایک نظم والے کے ذمہ دار حضرات ملے ہو گئے تھے۔

گرمی کے دن تھے فارغ بیٹھنے والے کوئی نہ کوئی پروگرام سوچتے رہتے، کمروں اور بلاک میں سفیدی کرنے کا کام شروع تھا اور جیل میں کئی پینٹر بھی تھے اور کچھ کو جیل نے پینٹر بنا دیا اور کمروں میں پھول بوٹے اور نقش و نگار اور پہاڑی منظر بننے شروع ہو گئے، اب یہ سوال رنگ کہاں سے آئے۔ تو جیل میں منہ کے چھالوں کی نیلی دوائی جنتیشن لال رنگ کے لئے مائزن پی کی گولی کو پانی میں ڈال کر رنگ بناتے اور باقی رنگوں کے لئے رنگین پنسلوں کے ختم ہونے پر ان کی روئی کو پانی میں ڈال کر بڑی عرق ریزی سے ان کا بچا کھچا عرق رنگ کی شکل میں نکالتے۔ فنکاروں نے تو چھوٹی بڑی صاف کاپیوں کو خوبصورت مناظر، جہاز، بیلی کاپٹر، ٹینکوں اور جنگی ہتھیاروں سے بھر دیا، افغانی تو باقاعدہ رقم دے کر اور رنگ کے مارکر خرید کر دیتے اور کاپیاں بنوا کر اپنے ملاقاتیوں کو جیل کی یادگار کے طور پر دے دیتے۔ کاپیوں سے کام بڑھتا ہوا شبرغان جیل کی دیواروں کو چھونے لگا، یوں جیل میں رنگین انقلاب آ گیا۔ جیل کے قیدی اور عملے والے پاکستانی بلاک میں گھس کر کمروں کا جائزہ لیتے جیسے کسی میوزیم یا تصویری نمائش میں گھس آئے ہوں۔

15 ستمبر 2003ء کو ریڈ کراس کی مخلوط ٹیم سردی کے آغاز پر ایک بار پھر گرم چادے، سویٹر، کپڑے وغیرہ لے کر آئے، اس کے علاوہ سب سے اہم اپنی نوکری پر آئے ہوئے نئے فیلڈ ڈوپلیکیٹ ''انتون'' نے سب قیدیوں کے لئے نیا کارڈ جاری کرنا تھا اور کچھ وہ تحقیقی طور پر بھی آئے تھے اور کابل سے یورپ کے ساحلوں پر پلی ہوئی ایک جل پری بھی لائے جس کا تذکرہ ہی سنا تھا دیکھا تو نہیں، عریاں لباس اور پھر سردیوں کے آغاز کی چمکیلی دھوپ اس کے ''رے بن'' کے پہنے ہوئے چشمے اور گوری چمڑی اور سنہری زلفوں سے ٹکرا کر یہ تاثر دیتی کہ میں اسیران شبرغان کو

اپنی زلفوں میں اسیر کرنے کے لئے لائی گئی ہوں۔ بڑے فراخدلانہ رویے کے ساتھ بلاکوں کے صحن میں خوشی سے ہائے ہائے کرتی رہی۔ پرانی روایت کے مطابق سب کو باری باری کمروں سے نکالا جا رہا تھا، پہلے مرحلے میں قیدیوں کا وزن کیا جاتا پھر اس کے بعد ایک کمرے میں انتون اور یہ عورت ترجمانوں کے ساتھ دو لیپ ٹاپ اپنی میز پر رکھے نظر آتے، یہ عورت اصل میں آئی۔ سی۔ آر۔ سی ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے افغانستان کی جیلوں میں موجود تمام قیدیوں کے ریکارڈ کو منظم کرنے اور ان قیدیوں کے ڈیٹا کو جانچ پڑتال کی ذمہ دار تھی۔ یہ دونوں اپنی کارروائی کے دوران ساتھیوں کے پرانے ریکارڈ کھول کر بیٹھے تھے اور کئی ساتھیوں کو ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کے نام تک لیپ ٹاپ میں فیڈ کر رکھے تھے اور موقع پر ان کو بتا دیتے کہ تم نے خط بھیجا ہے اور تمہیں کتنے خط آئی ہیں جس نے بالکل کوئی خط نہ بھیجا ہے اور تمہیں کتنے خط آئے ہیں، جس نے بالکل کوئی خط نہ بھیجا ہوتا اس کو یہ بتاتے کہ تم خط لکھو، ہم تمہارے گھر پہنچائیں گے۔ ریڈ کراس ہی کے ترجمان کامران نے بتایا تھا کہ ہم تمہارے خط فیڈ کر کے رکھتے ہیں اور امریکیوں کو بھی تمہارے خط پہنچائے جاتے ہیں۔ اس لئے آپ احتیاط ملحوظ خاطر رکھیں، ریڈ کراس نے ایک ایک قیدی کے بارے اتنی معلومات اکٹھی کی تھیں جو کہ ایف بی آئی کے پاس بھی نہ تھیں۔ ان کی وسیع معلومات کا فائدہ کسی نہ کسی طور پر امریکہ کو ہوتا رہا۔ آخری مرحلے میں قیدی کا پرانا کارڈ کینسل کر دیتے اور مزار شریف کی مہر لگے ہوئے کارڈ جاری کر دیتے، اس کے بعد قیدیوں کو لائے ہوئے سامان مل جاتے، باہر جانے والے دوبارہ اندر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ دروازہ ایک ہونے کی وجہ سے ان کے کارندے کسی کو بلاک میں نہ آنے دیتے۔ بارہ بجے کے قریب صرف چار کمرے والے ساتھی رہ گئے تھے، پورے بلاک کو سانپ سونگھا ہوا تھا، ہم کچھ ساتھی نیند کے مزے لوٹتے ہوئے اس وقت بیدار ہو گئے کہ اچانک بلاک میں شور شرابا اور نعرہ بازی شروع تھی۔ مالاکنڈ کے ساتھ عبدالحکیم سمیت کئی نعرے لگا رہے تھے، نعرہ تکبیر شاید محاذ جنگ پر بھی اتنے زور سے نہ لگا ہو گا جتنا آج کے دن لگ رہا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اپنے کمرے کے باہر سے آنے والے ایک ساتھی سے معاملے کے بارے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

پہلی مرتبہ قیدیوں نے جیل میں احتجاج کیا اور برج پر مسلح سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب قیدیوں نے ریڈ کراس کا دیا ہوا سامان ان کے منہ پر دے مارا جل پری کابل سے زلفوں کے اسیر بنانے کے چکر میں آئی لیکن اپنی زلفوں میں خود ہی پیچ کھا کر پھنس گئی اس کا زرد رنگ اور چیخیں تو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

گویا اس کو جیتے جی مارنے کی حد تک پہنچا چکی تھی، اسی پر بس نہ ہوئی۔

اس واقعے کی وجہ کی کچھ یوں تھی کہ ایک عسکر شریف اللہ نے ایک بیمار ساتھی کو بڑی بیدردی سے کیبل کے ساتھ پیٹا اور سپاہی کئی دفعہ پہلے بھی پتھر مار کر مجاہدین کے سر کھول چکا تھا اور اس کی شکایت اکثر ہوتی رہتی اس دفعہ پھر پاکستانیوں پر تشدد کر کے بھڑاس نکال ڈالی۔ اس حرکت کے بعد شریف اللہ بھاگ گیا، قیدی غصے سے بے قابو ہو رہے تھے، نعروں سے ریڈ کراس والے گھبرا گئے اور بھائی شاہ اکبر جو کہ باہر ہی رہ گئے تھے، تا کہ ان کو پُرسکون رکھے، اس نے بتایا کہ ریڈ کراس نے سیٹلائٹ فون پر کابل میں امریکیوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر قیدی اپنی بغاوت ختم نہیں کرتے تو ایک گھنٹے بعد شبرغان کی فضا میں طیارے موجود ہوں گے بات دوستم تک بھی پہنچی اور شبرغان انتظامیہ کے افسران نے جیل کا دورہ کیا اور قیدیوں کو پُرسکون پا کر ان کی شکایات پر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ سامانوں کے ڈھیر شام تک اٹھا کر ساتھ لے گئے دوسرے دن پُرسکون ہونے کے بعد ریڈ کراس والے پھر آئے اور کہا کہ "آپ تمام قیدیوں نے جو حرکت کی ہے اگر آئندہ ایسا ہوا تو ہم قیدیوں کی امدادی کارروائی سے دستبردار ہو جائیں گے۔"

26 اکتوبر کو تیسرا رمضان المبارک بھی جیل میں آ پہنچا۔ روزوں سے پہلے علم الصرف کی کتاب کا امتحان بھی ہوا، یوں رمضان میں چھٹی ہو گئی، صرف صبح کے وقت ناظرہ اور حفظ کرنے والے اپنی ترتیب پر پڑھتے، اس رمضان میں رزق کی فراوانی دیکھی۔ ریڈ کراس اور ایمرجنسی والے ایک دوسرے سے بعد ہو کر قیدیوں کو اچھے سے اچھا سامان دیتے۔ پاکستان سے ملاقات بھی آئی اور مجموعی طور پر کچھ کتابیں اور آ گئیں جو کہ مدراس کے نصاب پر مشتمل تھیں۔ ریڈ کراس والوں نے پہلے کچھ کتابیں دیں اور مزید اب لائبریری بنانے کے لئے کتابیں لے آئے۔ یہ غیر اخلاقی ناولوں اور کتابوں سے ہمارے ذہن کو منتشر کرنا چاہتے تھے۔ ہر نظم والوں میں کتابیں تقسیم ہو گئیں اور ہر کسی نے اپنی لائبریری بنائی تا کہ کتابوں کی حفاظت ہو سکے، یہ جیل میں کتابوں والا دور تھا شروع میں تو ہر کمرے اور بیرک میں کتابی کیڑے نظر آتے۔ جیل کے پیچھے بستی میں مسجد سے تراویح کی آواز رات بارہ بجے تک آتی اور اسی طرز پر دھیمے انداز میں قاری ابوسیف بھی تراویح پڑھاتے، ان کی خوش الحانی سے پڑھنے پر کئی ساتھی اپنی تراویح سے فارغ ہو کر ان کے دروازے میں کھڑے ہو کر تلاوت سنتے اور ان کے پیچھے بھی تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا اور تراویح کے بعد ان کا خلاصہ سنتے تو ایمان حد درجہ بڑھتا۔

روزوں کی وجہ سے ٹی بی کے مریضوں کو مغرب کے بعد دوائی ملتی اور جیل میں ڈپریشن کا مرض بھی بڑھ گیا تھا اور کئی ساتھیوں کو ذہنی سکون کے لئے خواب آور گولیاں دی جاتی۔ ان دنوں لیڈی ڈاکٹر کلوڈیا کی جگہ اٹلی کا ڈاکٹر "پیرو" آ گیا اس کے ساتھ لاجسٹک آفیسر "لاڈیو" بھی اٹلی کا تھا۔ ہر تبدیلی میں لاجسٹک آفیسر بھی ہوتا جس کا کام مریضوں اور جیل کے قیدیوں کے لئے اشیائے خورد و نوش اور باقی امدادی سامان کو خرید کر قیدیوں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا، جیل کے ساتھی انہیں انجینئر کہتے حالانکہ ان کے سینے پر لگے تصویری کارڈ عہدے کے خانہ میں "لاجسٹک آفیسر" لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کلوڈیا تمام مجاہدین سے بہت متاثر ہوئیں کیونکہ وہ جب بلاک میں آتی تو سب ساتھی نظروں کی حفاظت کے ساتھ اپنی پڑھائی میں مشغول رہتے تھے جن کو دیکھ کر حیران ہوتی کہ جیل میں رہتے ہوئے پُرسکون طریقے سے اپنی مذہبی کتاب کو ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں۔ جب اس کی ٹرانسفر کا حکم ہوا تو کلوڈیا نے کیٹ سے کہا اسے مزید شبرغان میں تعینات رہنے دے تا کہ ان لوگوں کی خدمت کر سکوں، اپنی ڈیوٹی کے آخری دن تمام بلاکوں سے معافی تلافی کرنے لگی جو کہ تمام تنظیموں کے اہلکار ایسا کرتے تھے۔ شاہ اکبر نے بتایا کہ جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اصل میں یہ سب اللہ کے کلام کی برکت تھی جس نے ان کو متاثر کیا تھا۔

رمضان المبارک کے اعتکاف کی تیاری زوروں پر تھی، ہر کمرے میں پردے لٹک گئے، یوں زندگی میں پہلی مرتبہ جیل میں اعتکاف بیٹھنے کا موقع ملا۔ سردی نے ایک دفعہ پھر اپنا زور دکھایا کہ شبرغان والوں! پھر ہمارا ملاپ کہاں ہوگا، برف باری کے پیغام کے بعد دروازوں پر کمبل لٹک گئے ایک دفعہ پھر کھڑکی دروازے بند ہو گئے، اس سے بڑی زحمت پانی کی تھی وہ بھی مشین خراب ہونے کے باعث تالاب سے لانا پڑتا۔

21 نومبر بروز جمعہ عید سے تین دن پہلے جیل کے عملے میں حرکت پیدا ہوئی، جمعے کے دن ڈاکٹروں کی چھٹی ہوتی، دوپہر کے وقت ڈسپنسر پٹی کروانے والوں کو ساتھ لے گیا اور اسی دوران پاکستانی بلاک والے تالاب سے پانی بھر رہے تھے، مزار ٹی وی کی ٹیم آئی جی شبرغان کے ساتھ آئی، یہ ٹیم اچانک وارد ہوئی اس لئے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، کرہ خانے کے چندٹی بی والے مریض، روٹیاں پکانے والے پٹائی کروانے اور چند پانی بھرنے والے جو باہر رہ گئے تھے ان سب کو قطار میں بٹھا کر فلم بنائی اور نام لکھتے رہے۔ جیل کا لیبر گروپ قسمت آزمائی کے لئے بیٹھا لیکن جیلر نے ان کو اٹھا دیا، کل 21 پاکستانی اور کچھ افغانی عید کی خوشی میں رہا کر دیئے، یہ سارا ڈرامہ اپنے کمرے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ آزادی نہ سہی لیکن عیدالفطر کے دن ایک دوسرے سے مل کر ساتھی خوشی مناتے رہے۔ یہ آخری عیدالفطر سابقہ عیدوں کی نسبت کھڑاک سے گزری، ''ایمرجنسی'' کی طرف سے قیدیوں کے لئے گائے لائی گئی جو کہ جیل میں ذبح ہونے کے بعد عملے کی موج بن گئی۔ اس عید پر جیلر نے کچھ طالبان اور پاکستانی قیدیوں کی دعوت بھی کی جو کہ پھیکے قہوے اور سن بسکٹ پر مشتمل تھی۔ طاہر چرخی کو تو طالبان کے کمانڈر بلاک والوں نے دے دلا کر عید کے روز تینوں بلاکوں کے دروازے وقفے وقفے سے کھلوا دیئے، کمانڈر بلاک میں ایک لمبا دستر خوان لگا ہوا تھا جس پر بیک وقت سو سے زائد افراد بیٹھ کر طالبان کی ضیافت قبول کرتے رہے، دوپہر تک دعوت اور ملنے ملانے کا سلسلہ جاری تھا۔ عید کے روز دس کے قریب افغانیوں کی رہائی والی لسٹ بھی آئی جس پر دو تم کے دستخط کی صورت رہائی کے احکامات تھے۔ یہ افغانی بھاری رقوم دے کر رہا ہوئے تھے۔

شبرغان جیل میں آخری چند ماہ بڑی سہولت سے گزر رہے تھے، سردی قدرے کم ہوئی، جنوری کے اختتام پر عید متوقع تھی، ان دنوں قیدیوں کی اکثر توجہ فٹ بال اور کرکٹ پر تھی، باہر میدان میں فٹ بال کے پول لگے گئے، ایمرجنسی نے تینوں بلاک والوں کو ایک ایک فٹ بال بھی دیا۔ اس کے علاوہ گیند بلے والے لکڑی کے خود ساختہ بلے سے اپنا شوق پورا کرتے ان کی بھی سنی گئی اور بلا مل گیا۔ گویا یہ آخری دور شوق کے حساب سے کھیل کا دور تھا۔ عملہ ہفتے میں اب دو دفعہ باہر نکالتا۔ کبھی کبھار سب قیدی افغانی و پاکستانی اکٹھے بھی نکال دیئے جاتے۔ انہی دنوں کمرہ نمبر چار میں کھڈے کی نئی طرز پر تعمیر کا منصوبہ عمران ہاشی نے بنایا۔ اس کھڈے میں شاہ اکبر، عمران اور میں اکثر ریڈیو چھپ کر سنتے تھے۔ اس کی تعمیر کے دوران عمران اپنی موٹی چادر سر اور کانوں پر لے کر درویش بن کر مراقبے میں بیٹھ جاتا۔ عمران ہاشی کو محمد جان نے ریڈیو رکھنے والے کمروں کی لسٹ بھی دکھائی تھی۔ اس میں چار نمبر کمرہ بھی تھا۔ صبح و شام کئی ساتھی اپنے طور پر احتیاط کے لئے پہرہ دیتے کہ کہیں عملہ اچانک چھاپہ مار کر کارروائی نہ کروا دے۔ ان پہرے داروں کی گویا آنکھوں سے پتہ چل جاتا کہ ان کے کمرے میں ریڈیو پر خبریں سنی جا رہی ہیں۔

بڑی عید پر رہائی کا شور اس وقت برپا ہوا کہ افغانستان کے سالانہ لویہ جرگہ (اسمبلی کے اجلاس) میں پہلی مرتبہ نیا آئین منظور ہوا۔ اس اجلاس میں شبرغان کے قیدیوں کی بات اٹھائی گئی جس پر کرزئی نے اعلان کر دیا کہ شبرغان کے قیدیوں کی بات اٹھائی گئی جس پر کرزئی نے اعلان کر دیا کہ شبرغان کے قیدیوں کو جلد رہا کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد جیل کے عملے اور اسیر دل

میں پہلے سے بنے تعلقات میں پھر جوڑ توڑ شروع ہوا، محمد جان اور طاہر چرخی سمیت کئی افسروں نے ایڈوانس رقم بھی ہڑپ کر لی جو کہ افغانیوں نے دی تھی استخبارات والوں کا کمرہ رات گئے تک جوڑ توڑ کا مرکز بنا رہا۔ اس کے ساتھ ہی کابل سے مرکزی حکومت کی طرف سے ایک وفد کی آمد کی خبر آئی ان کی کرسیاں اور میز پہلے پہنچ چکے تھے، یوں ایک سرد صبح جبکہ میں اوپی ڈی پر بیٹھا تھا۔ آئی جی شبرغان، جیلر اور دیگر افسران سمیت ایک ٹیم پرانے انجن کی طرح نتھنوں سے دھواں نکالتے وارد ہوئی، ان کی آمد کو دیکھ کر افغان بلاک میں شور مچ گیا۔ پاکستانی صرف افغانیوں کی رہائی کے اعلان سننے کے بعد سکون سے تھے۔ اس ٹیم نے جب کارروائی کا آغاز کیا تو دو افسران کا آپس میں اختلاف ہو گیا، کرزئی کی طرف سے بھیجے گئے اس وفد نے تمام قیدیوں کا ریکارڈ مرتب کرنا تھا اور رہائی بعد کا مسئلہ تھا۔ میں یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ باہر نکلا تو ماموروں نے مجھے بلاک میں بند کر دیا۔ طالبان دروازے کی سلاخوں سے چپٹے تھے بعد میں ماموروں نے سمجھایا کہ تمہاری رہائی ابھی چند دن بعد ہو گی، ہم نے ریکارڈ تیار کر کے کابل بھیجنا ہے وہاں پر ہر ایک کے کاغذات پر غور کرنے کے بعد رہائی کا عمل ہو گا۔ یوں سب کا جوش ٹھنڈا پڑا۔ تمام افغانیوں کا ریکارڈ چیک ہو اور رات کو محمد جان نے بارہ بجے تک پاکستانیوں کا اندراج کیا۔ عمران ہاشمی نے دروازے پر ایک مت گروپ کو کھڑا کر دیا اور پہلی بار رات گئے دروازہ کھلا رہا۔ صبح کے وقت ٹیم دوبارہ آئی اور میدان بلاک کے رجسٹریشن کی، وفد بلاک کے اندر گیا تو ان کی خاطر تواضع بھی کی لیکن جیل کے عملے اور مدیر ہفت کی بھی خوب تواضع ہوئی، کمانڈانوں نے اپنی کئی صفحوں کی شکایات درج کروائیں، ہر ایک عملے کے ارکان کی روپے بٹورنے کی رام کہانی بھی سنائی، جس پر وفد نے کہا کہ آپ کی شکایات اوپر پہنچائیں گے۔ پاکستانیوں کو بھی اس روز اپنی نگرانی میں ان کے ناموں والے رجسٹروں پر پڑتال کی، بیمار اور بوڑھوں کے ''ملاحظات'' کے خانے میں تفصیل لکھ دی جاتی۔ پوری جیل میں آزادی کی امید نے خوشی کی لہر دوڑا دی، ریڈیو کی خبریں جو کہ کانوں کی سرگوشی کی صورت منتقل ہوتی، اب آزادانہ گردش کرنے لگیں۔ اس وفد کے رخصت ہونے کے بعد اب رہائی کا انتظار شدت اختیار کر گیا لیکن یہ کاغذات مرکز کے ریکارڈ میں ہی شاید فائل بند کر دیئے، خیر رہائی کے متوالوں نے اس دفعہ بھی ناامیدی ظاہر کی کیونکہ وہ اس طرح کے دسیوں کیپسول نگل چکے تھے۔ عیدالاضحیٰ سے پہلے ہی ''ایمرجنسی'' نے بھی کتابیں منگوا دیں۔ اس کے ساتھ ہی عید پیکج دیا، مگر اس اور ''ایمرجنسی'' کے آپس میں ویسے ہی اختلاف تھے اور کچھ ان اختلافات پر ہم بھی نمک

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

چھڑکنے کے ساتھ نشتر لگاتے رہتے تھے، ایک دفعہ ریڈ کراس کا نمائندہ انتون افغانستان کے نئے آمدہ سربراہ سمیت آیا اور نو آمد ہونے کی وجہ سے شبرغان میں قیدیوں کے بارے ایک ٹاسک لے کر آیا تھا۔ ماں کے ساتھ چار گھنٹے تک مسلسل میٹنگ ہوتی رہی۔ اس ملاقات میں چند ایک باتیں ضروری سمجھی جن میں ٹی بی کے مرض اور دیگر امراض پر کنٹرول، خطوں کی آمد ورفت کی ناقص کارکردگی وغیرہ کئی موضوع پر طویل بحث ہوئی لیکن ان میں دلچسپ بحث یہ ہوئی، میں نے ان سے قیدیوں کے بارے جنیوا کنونشن کا سوال کر ڈالا کہ جنگی قیدیوں کے بارے جنیوا کنونشن کیا کہتا ہے؟ آپ ہمارے طویل عرصے سے قید پر عالمی عدالت انصاف رجوع نہیں کر سکتے؟ اس کا عجیب وار تھا کہ ہالینڈ کی عدالت نے ہمیں الحاق کی دعوت دی تھی لیکن ہمارے بڑوں نے ان سے الحاق کے لئے انکار کر دیا۔ اس لئے ہم آپ کا کیس نہیں لڑ سکتے۔ اس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں خاموشی اختیار کرنی پڑتی۔ عمران ہاشمی نے بھی اس سے بڑی بحث کی، پھر ہم سب نے مشترکہ طور پر کہا کہ اگر ہم آپ کے ہیڈ کوارٹر جنیوا خط لکھیں تو پہنچائیں گے تو اس نے حامی بھری، عمران نے طنزاً کہا کہ آپ کے ڈائریکٹر کا کیا نام ہے، اس نے نہ بتایا اور پھر اس پر مزید ایسی بات کہی تو سب ہنس پڑے لیکن اس گورے کی چمڑی سرخ ہوگئی لیکن جوابی کارروائی کی سکت نہ ہونے پر ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کڑوے گھونٹ کو پی گیا۔ اکثر گوروں کی ایک عجیب نفسیات دیکھی کہ بڑی سے بڑی غلطی پر سوری کہنا جیسا کہ وہ عادتاً اپنی گفتگو میں سوری بہت استعمال کرتے ہیں اور اگر مدمقابل بھی سوری کہہ دیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا، کچھ اسی طرح ہم نے بھی ان کی منطق کو ان پر استعمال کیا اور صرف سوری سن کر وہ اپنی پرانی حالت پر لوٹ آیا، اس کے علاوہ بھی مختلف ممالک کے گوروں سے دوران ملاقات یہ تجزیہ نکالا کہ سوری کہنا ان کی بہت بڑی کمزوری ہے اگر ان کو پہاڑ کی چوٹی کے برابر غصے والی بات آپ کہہ دیں تو صرف ایک سوری پر آپ ان کو زمین پر لا سکتے ہیں۔

عیدالاضحیٰ کے عین قریب معلوم ہوا کہ عید پر سب قیدیوں کو گوشت ملے گا۔ عید سے پہلے ایک ''گاؤمیش'' بھینس لائی گئی اور یوں شبرغان جیل میں پہلی بار بھینس ذبح ہوئی۔ بھینس کو ذبح کرتے وقت طاہر جرخی نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا کہ میری موجودگی میں کوئی گوشت کو ہاتھ نہیں لگا سکتا لیکن اتفاق دیکھئے سب سے پہلے اس نے گوشت پر ہاتھ ڈالا، باقی بھی اپنا حصہ وصول کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن اس کے باوجود پہلی مرتبہ جیل کی تاریخ میں قیدیوں کو مناسب مقدار میں

ملا۔ 2 رفروری کو آخری عیدالاضحیٰ بھی آئی اس دفعہ طاہر جرخی کی جیب بھی بھری، تینوں کے دروازے کھول دیئے اور میدان تک ہر کوئی آزادانہ گھوم سکتا تھا۔ پہلی بار ہوا کہ تمام یک وقت نکال دیئے ہوں، کماندان بلاک کا وسیع دسترخوان غالباً جنرل سٹور کی شکل اختیار کر طالبان کے روایتی انداز میں عید ملتے وقت ہم بھی ان کی طرز پر ملتے اور دعائیہ کلمات کہے، حاجیوں، نمازیوں اور شہیدوں اور غازیوں میں شمار کرے۔

ایک معتدل دن دوپہر کے وقت محمد اجان ایک لسٹ لے کر آیا اور رہائی کا جھانسہ دے کر ان کو تحقیق کمرے میں ایک ایک کر کے بلایا۔ ان ناموں والوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ رہائی ہی یہی افراد لاتے تھے۔ محمد اجان نے سب ناموں کی پڑتال کر لی۔ ساتھی اس کی چال نہ سمجھ سکے یہ امریکیوں کی طرف سے آمد لسٹ تھی کیونکہ ان میں کچھ ساتھی کئی ماہ پہلے رہا ہو کر چلے تھے، کچھ نام جیل کے عملے نے شامل کر لئے۔ ایک دفعہ برطانوی کمانڈوز مرد اور عورتیں مسلح طور میں آئے، ہمیں بتایا گیا کہ یہ افغانستان کی تعمیر نو کے ادارے سے وابستہ ہیں ان کی وردی پر کا جھنڈا بنا تھا اور ان کے ساتھ تین نیپالی بھی خاکی وردی میں ملبوس تھے اور ان کی وردی پر برطانوی جھنڈا بنا تھا۔ یہ افراد تھوڑی بہت ہندی اور اردو جانتے تھے۔ ان کو آواز دی کہ اپنا حال ہی بتا دو تقریباً آدھے منٹ کی گفتگو میں ہی پیچھے کھڑے ایک گورے نے انہیں قریب بلا لیا۔ ہاتھوں میں ہنر سے لئے ہوئے اپنے فن میں مگن تھے اور اہم بات ان نیپالی ن نے اپنے کانوں پہ ہیڈ فون لگائے ہوئے تھے۔ یعنی تین لنک کانوں اور منہ والا مائیکروفون اور اس کی تار اس کی پینٹ کی جیب میں پڑے ٹیپ ریکارڈر سے جڑی تھی۔ ان کو دیکھ کر صرف اتنا ہوگیا کہ یہ برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی کے اہلکار ہیں۔ ان کے جانے کے بعد رات کے جیلر نے پانچ چھ افراد کے نام ایک کاغذ پر لکھ کر عمران کو دیئے کہ ان افراد کی ملاقات ہے۔ ان کے بارے معلوم کر کے بتاؤ۔ عرصہ دراز سے شبرغان جیل کی روٹیاں توڑنے والے بھی سمجھدار ہو تھے، ناموں والے رہا ہو چکے تھے لہٰذا برطانوی فوجی ان کی تصدیق کرنے آئے تھے۔ اس شک یقین میں بدلا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ رات کو سوچتے ہوئے دماغ پر زور دیا تو ان کا ایک فلسفہ کھلا کہ ان ناموں میں سے ایک ساتھی ساہیوال کے رہا ہوئے تھے اور ان سے دفعہ ایف بی آئی نے اور جیل کے عملے نے فرداً فرداً تحقیق کی کہ تم برطانوی شہری ہو۔ لیکن وہ پنجابی اردو کے لہجے سے ہی پہچانا جاتا تو وہ کیا خواب میں برطانیہ گیا تھا۔ جس سے یقین

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوگیا کہ یہ ضرور برطانوی خفیہ ایجنسی کے اہلکار تھے۔ یہ ٹیم چند دن بعد دوبارہ آئی۔ اس روز ان کے ترجمان سے خود گپ شپ لگا کر حال پوچھا! لڑھکتی زبان میں! اس نے انٹریو لینا شروع کیا اور ایف بی آئی والے سوالات کرنے لگے، ان کے معقول جواب دیئے لیکن تھوڑی دیر میں وہ واپس چلے گئے۔

ایک صبح عمران باشی اور میں جیل کی چھت پر لگے روشن دانوں کے پلاسٹک اتار رہے تھے۔ باہر کی تازہ ہوا داخل نہ ہونے کی وجہ سے پورے بلاک میں حبس ہو چکا تھا۔ اسی دوران بھاگتا ہوا سپاہی عبدالشکور آیا اور بتایا کہ جلدی کرو سیڑھیوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ جاؤ کیونکہ امریکی فوجی آ گئے ہیں، ہم ایک طرف ان پر نگاہ جمائے بیٹھے رہے۔ ایف بی آئی کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ جب بھی تحقیق کے لئے آنا چاہتے تو پہلے جیل کے مختلف مقامات پر سیکورٹی کے حوالے سے معائنہ کرتے رہتے، جیلر اور باقی عملہ دُم ہلاتے ہوئے ایسے ان کے آگے پیچھے چکر لگاتے جیسا کہ موقع پاتے ہی یہ ان کے پاؤں بھی چاٹیں گے۔ جیل کی برجیوں اور دروازے سے ملحق چھت پر بھی چڑھے تو اب یقین ہوگیا کہ یہ پھر تحقیق کریں گے اور 65 افراد کی لسٹ والے آزادی کی بجائے تحقیق کے مراحل سے گزرنے کی تیاری کرنے لگی۔ باقاعدہ طور پر تمام کمروں میں ایک مہم چلی کہ ایف بی آئی والوں کو کیا جواب دینا ہے۔ جذباتی باتیں کرنے سے منع کیا گیا۔

26 فروری کو ایف بی آئی والے اپنے مکمل ساز و سامان سمیت آ گئے۔ چمکدار دھوپ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لبریز صبح تھی، کمرے کی کھڑکی سے سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک امریکی کمانڈو جینز کی پینٹ اور نیلی شرٹ پہنے ہوئے بڑے دروازے کی چھت پر بنے مورچوں پر موجود فوجیوں کو اشاروں سے سمجھا رہا تھا۔ اس کا اوپر نیچے بار بار سیکورٹی کے جائزے لینے سے معلوم پڑتا کہ یہ اس ٹیم کا انچارج ہے۔ اپنے مخصوص لباس کی بدولت اوپر نیچے آتے جاتے یہ شخص نمایاں تھا۔ اس دفعہ ایف بی آئی اپنا ٹھکانہ بھی بدلتی رہتی۔ اس کمرے کے باہر چند میز اور کرسیاں رکھ دیں۔ اس کے ساتھ ہی جیل کا دوسرا بڑا دروازہ تھا جو آج کے دن کھلا پڑا تھا۔ اس کے قریب کئی مسلح فوجی کھڑے اور قریب ہی دو افراد ایک بڑی البم لئے کھڑے نظر آتے، اس البم والے کا کام یہ ہوتا کہ سب سے پہلے چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا کر متعلقہ قیدی سے نام پوچھتا! اور چونکہ وہ مخصوص نام پہلے سے لائے تو ان سب تصویروں کی البم بھی ساتھ لائے جو کہ ان کے پرانے ریکارڈ میں پڑی تھی، قیدی کی شکل و صورت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد قیدی قریب کھڑے ڈاکٹر کو تھما دیا

جاتا، ڈاکٹر ہر قیدی کا لنگز ساؤنڈ اسٹیتھو سکوپ سے چیک کرتا اور دیگر امراض کے بارے میں پوچھتا، اس مرحلے میں قیدی کی میڈیکل رپورٹ اسی وقت ایک فائل کی صورت میں اندر کمرے میں روانہ کر دی جاتی۔ اس کے بعد فنگرز پرنٹ اور پھر آخری تحقیقی مرحلے میں قیدی داخل ہو جاتا اور اس جگہ تفتیشی اہلکار تین جگہ فاصلے پر علیحدہ اپنے ترجمان سمیت بیٹھے ہوتے، اس دفعہ ترجمان بھی نئے چہرے تھے، ہر میز پر لیپ ٹاپ پڑے تھے ہر میز کے بالمقابل درمیان میں فاصلہ چھوڑ کر ایک کرسی پر مختصر لباس میں ملبوس معصوم سی شکل و صورت کی چابی والی گڑیا بٹھائی ہوتی، اپنی تراشیدہ بھنوؤں پلکوں اور سنجیدہ موڈ کے ساتھ زندہ مگر بظاہر مجسمے کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھی ہر قیدی کا چہرہ تکتی تھیں۔ یہ ماہر نفسیات عورتیں تھیں جو کہ ہر قیدی کو سر سے لے کر پاؤں تک نوٹ کرتیں۔ اس دفعہ ایف بی آئی کا طریقہ تحقیق بدل گیا تھا۔ قیدی کو تحقیق کے وقت اپنی پشت ٹیم کی طرف اور چہرہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی طرف کرنا پڑتا۔ ہر سوال کا جواب گویا اس گڑیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دینا پڑتا، مجاہدین کے لئے غیر محرم عورتوں پر نظر ڈال کر مشکل ترین مرحلہ تحقیق تھا۔ ہر تفتیشی ٹیم کے پاس ساٹھ سوالات پر مشتمل سوالنامہ پہلے سے تیار پڑا تھا۔ ہر سوال پر اہلکار پوچھ کر مختلف رنگ کے مارکر سے ٹک مارک لگا دیتے، ہر فرد کی فائل کے ساتھ یہ سوالنامہ لگا جاتا۔ یہ 60 سوال انتہائی نفسیاتی داؤ پیچ کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے کیونکہ آگے سوال بڑھتے بڑھتے پچھلے دیئے گئے جوابات سے ٹکراتے نظر آتے تھے اور ہر قیدی پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی اور جلد جواب دینے کی صورت میں ذہن کو بہت زیادہ حاضر رکھنے کی ضرورت ہوتی اور ویسے بھی یہ مرحلہ سب کی نظر میں آخری تھا اس کے بعد قیدیوں کو کیوبا لے جانے کی افواہ بھی عام تھی، تینوں بلاکوں میں معمول کے مطابق سارا دن شور شرابا ہوتا لیکن آج کے روز سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ برسوں سے شبرغان جیل خالی پڑی ہو۔ ہر ساتھی کا چہرہ پریشانی سے لٹکا نظر آتا، پورے پانچ دن مسکراہٹ نام کی کوئی چیز بھی ہونٹوں سے نہ ٹکرائی۔ سوائے چند ایک ساتھی تسلی کے لئے جھوٹی مسکراہٹ اور ہنسی کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ رات کو تہجد میں خوب رو رو کر دعائیں مانگی جاتیں۔

تحقیق کے دوران ایک ایک لمحہ سنسنی خیز ہوتا تھا اور خاص کر یہ موقع تو میرے لئے اور سب ایک لسٹ والوں کے لئے انتہائی سنسنی خیز اور خاموشی توڑنے والا تھا کہ آمدہ لسٹ میں کس کا نام پکارا جائے گا، کچھ ایسی صورتحال آج کے دن ڈاکٹروں کی تھی وہ بھی لمحہ بہ لمحہ مجھ سے پوچھتے۔ ایک افغانی ڈاکٹر دوائی لکھ رہا تھا کہ اچانک باہر گیلری میں ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ٹکرانے کی آواز کانوں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں پڑی کیونکہ ہتھکڑی اور بیڑی لگا کر قیدی کو تقریباً 200 گز کے فاصلے پر کھڑے امریکیوں کے پاس جانا پڑتا۔ تحقیق پر جانے والے پہلے قیدی کی بیڑی کی چھن چھن اس کے کانوں میں پڑی تو دونوں چونک کر بولے یہ کوئی خطرناک آدمی ہے۔ امریکیوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ ہم چند خطرناک افراد کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق کا سلسلہ دوپہر تک چلا اور اب کھانے کے وقفے کے دوران امریکی اپنے ساتھ لائے ہوئے فیلڈ فوڈ کھاتے رہے اور جیل کا عملہ بھی چھپ کر ان سے کھا لیتا، طاہر چرخی تو کوکا کولا اور منرل واٹر کے کارٹن اٹھا لایا اور اپنے کمرے میں رکھ دیئے اور تحقیق کے ختم ہونے کے بعد جیل کے اندر ان کے خالی پیکٹ جا بجا پڑے نظر آتے۔ ڈیڑھ گھنٹہ وقفے کے بعد پھر تحقیق ہوئی اور شام کو امریکی اپنا بوریا بستر لے کر چلے گئے، جس ساتھی کی تحقیق ہو جاتی اسے زنانہ بلاک میں ڈال دیا جاتا، سخت پہرے لگا دیئے اسی روز جب عمران ہاشمی کو تحقیق کے لئے بیڑ لگا کر لے جا رہے تھے۔

28 فروری بروز ہفتہ کو پھر ایف آئی بی والے آئے اس روز دوائی کی باری پاکستانی بلاک کی تھی۔ قیدیوں کو صبح و شام امریکیوں کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد پانی کے لئے نکالا جاتا تھا اور روٹی پکانے والے ساری رات پکاتے اور صبح فجر کے بعد قیدی اپنی روٹی لاتے، کرہ خانے کے دو بلاک تھے اور ایک بلاک میں مریض رہے اور جتنا بلاک خالی کروا کے وہاں پر زنانہ بلاک کی نو آمدہ عورتوں کو رکھا گیا تھا۔ ان عورتوں میں چند ایک کے بچے بھی تھے جن کو سپاہی گود میں اٹھا کر دوائی کے لئے لاتے اور چھوٹی عمر کے قیدیوں کو اوپی ڈی کے سامنے والے کمرے میں رکھا گیا۔ دوران تحقیق ایک واقعہ ہوا جو کہ ازبک عملے کی مکاری اور عیاری کا بین ثبوت تھا۔ ہفتے کے روز لسٹ میں کامران بھائی کا نام آیا۔ سب مامور چیختے رہے کہ کامران کون ہے، ریاست پریشان تھا اسی اثنا میں مریضوں کے لئے آیا تو طاہر چرخی اور محمد اجان نے یہ نام مجھے دیا، میں نے بھی انکار کیا کہ یہ شخص ادھر نہیں ہے تو طاہر چرخی نے میرا ہاتھ پکڑ کر صحن میں موجود کنوئیں پر بٹھا کر اپنی جیکٹ سے خط نکالا اور پڑھوایا۔ اس پر تاریخ بھی چند ماہ پہلے کی تھی۔ طاہر چرخی نے کہا تم کہتے ہو یہ نفر ادھر نہیں تو یہ خط پھر کس نے ریڈ کراس کے ذریعے بھیجا تھا۔ اصل میں یہ خط بھائی کامران نے چند ماہ پہلے لکھا تھا اور ضیا مخبر نے جو کہ خط پڑھتا تھا یہ خط فضل ہادی کو دے دیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد طاہر چرخی نے کہا بلاک میں جاؤ اور اسے ڈھونڈ لاؤ ورنہ ہم ہر ایک کو باہر نکال کر ماریں گے، اس بحث میں آدھا گھنٹہ گزر گیا اور امریکی بھی انتظار کر رہے تھے۔ شبے میں عمران کو بھی بیڑی

ڈال کر لے گئے، اس کے علاوہ اور بھی دو تین افراد کو لے گئے۔

میں بلاک میں داخل ہوا تو بھائی کامران اپنے دروازے پر کھڑا تھا، ان کو خط کے بارے بتایا اور کہا کہ کوچیوں نے تو ثبوت بھی رکھا ہوا ہے وہ پہلے سے باہر جانے کے لئے تیار تھے اور اتنی بات سن کر چل پڑے، کھڑکی سے ماموروں نے دیکھا تو دروازہ کھول دیا۔ طاہر چرخی ان کو لے کر ایک طرف گیا اور پوچھا کہ یہ خط آپ کا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں میرا ہے، اپنے کمرے میں لے گئے، طاہر چرخی نے مجھے اس خط کا ترجمہ کر کے پڑھنے کو کہا، محمد اجان جو پشتون تھا وہ تھوڑی سی اردو بھی جانتا تھا جب میں نے خط پڑھا تو اس خط میں کتاب کا ذکر آیا تو روک کر کہا کامران سے پوچھو یہ کتاب کہاں ہے؟ اصل میں یہ کتاب کاپی پر لکھی تھی یہودیوں کی تنظیم "آئی ایف ایم انٹرنیشنل فری میسن" کے بارے میں معلومات تھی اور اس خط میں لکھا کہ اس کا پہلا حصہ پاکستان بھیج دیا ہے اور دوسرا حصہ بھی عنقریب آپ کو مل جائے گا اور دوسری بات اس میں دوستم کے متعلق بھی ایک بات لکھی تھی جب میں نے دوست والی سطر کو گول کیا تو طاہر چرخی غصے سے مزید لال پیلا ہو گیا اور پھر جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سفید پرچہ نکالا جس پر فارسی میں اس خط کا ترجمہ امریکیوں کے ترجمان نے کر کے دیا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو اور پورا فارسی کا ترجمہ خود پڑھ۔ کامران بھائی مادر میں آپس میں پنجابی بولتے رہے۔ خط تو وہ قبول کر چکے تھے اور کتاب کے بارے انہوں نے انکار کر دیا کہ کوئی کتاب نہیں جیل میں، جیل کا عملہ اس بات پر بھی برہم تھا کہ سخت تلاشی کے باوجود کتاب کیسے باہر چلی گئی، اس شور شرابے میں بھائی کامران نے سرائیکی میں بتایا کہ بلاک میں کہہ دو کہ یہ کاپی جلا دیں۔ آخر اختتام پر مجھے جانے کو کہا اور ساتھ ہی چرخی نے دھمکی لگا دی کہ اس خط اور کتاب کے بارے اس کمرے میں جو بھی بات ہوئی ہے، وہ بلاک میں کسی کو معلوم نہ پڑے، بھائی کامران کو بیڑی اور ہتھکڑی لگا کر بٹھا دیا۔ میں جلدی سے تینوں بلاکوں کے دروازے پر گیا اور اس کاپی کو جلانے کا کہا چھت پر چڑھا، ایک سنتری میری حرکت کو نوٹ کر رہا تھا۔ تین چار منٹ کے بعد اس نے آواز لگائی کہ طاہر بلا رہا ہے میں گیا تو وہاں ایک کمرے میں نوعمر لڑکوں کے ساتھ آدھے گھنٹے کے لئے بند کر دیا۔ یہ شرابی آدمی تھا اس کی کھوپڑی گھوم گئی تھی، اسی دن سے میرا سخت دشمن بن گیا، تھوڑی دیر بعد مجھے پھر بلاک میں بھیج دیا اور زور سے کمر پر تھپکی مار کر کہا کہ تم نے دوران تحقیق صبح و شام اس دروازے سے باہر نہیں جانا۔ بلاک میں پہنچ کر پتہ چلا کہ تلی شاہ بابا نے ہر کمرے والوں کو بتایا تھا کہ کاپیاں جلا ڈالو،

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

خط پکڑا گیا ہے اس کو جلدی میں پتہ نہ چلا اور سننے والوں نے بھی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ نظموں والی کاپیاں اور خط سب کچھ جلا دیا، اب بیت الخلاء کی طرف بڑھا تو وہاں ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا، اس کو دیکھ کر میرے طوطے اڑ گئے اور جلدی سے پانی لا کر آگ بجھائی اور ساتھیوں کو روکتا رہا کہ اگر عملے والے کو پتہ چل گیا تو میری خیر نہیں کیونکہ انہوں نے ساری بات راز میں رکھنے کا کہا تھا۔ ہر ایک کمرے والے کو بتایا کہ احتیاط سے کام کرو اور صرف فری میسن والی کاپی سے جس نے نقل اتاری ہے وہ جلاؤ، ایک طرف حیرت تھی کہ کاپی کی بہت زیادہ نقلیں ہوگئی تھیں اور ڈھیر کے ڈھیر کاغذ پڑے نظر آئے، اسی روز جیل کا عملہ چھت پر بیٹھا کھانا بھی کھاتا رہا اور عین دوپہر کو زنانہ بلاک کے ساتھیوں نے بھی دور سے دھواں دیکھا تھا لیکن اللہ کی نصرت شامل حال ہونے کے ساتھ ان کی توجہ دھویں کی طرف نہ گئی۔

ایک طرف تو امریکی تحقیق ہو رہی تھے، دوسری طرف جیل کا ازبک عملہ ہم پر برس رہا تھا اور وہ جو دھمکی لگاتے وہ پوری بھی کرتے تھے۔ ان حالات میں اللہ کی نصرت شامل حال تھی اور مسلسل ذکر و اذکار سے بھی ذرہ بھر ہم ان کے دباؤ میں نہ آئے۔ یوں تقریباً تیسرے دن جا کر زنانہ بلاک والے ساتھیوں سے رابطہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ کامران بھائی کو جیل کا عملہ ہی ظاہر کروا رہا تھا اور ان کے دوستم کو بڑا کہنے والے خط کی وجہ سے ان کو پھنسوانا چاہا لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ امریکیوں نے بھی اس بات کا زیادہ نوٹس نہ لیا۔

الیف بی آئی کا ایک ترجمان شفاخانے نماز پڑھنے جاتا تھا اور وہاں پر موجود پاکستانیوں سے اس کی گپ شپ ہوگئی، یہ پاکستانی بھی پشتون تھا اس نے بتایا کہ ''آپ اپنے تمام ساتھیوں کو بتا دیں کہ امریکیوں کے سامنے جذباتی بیانات نہ دیں، اس سے آپ سب کو نقصان ہوگا''۔ سمجھانے کے باوجود چند ایک نے ان کو سخت بیان بھی دیئے، چند دن بعد بی بی سی اور دوسرے ریڈیو چینلز پر بھی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ''ہم نے پاکستانیوں کی تحقیق کی، لیکن وہ لمبے عرصے قید کے باوجود امریکہ کے خلاف جہاد کرنے پر مصر ہیں، ہم کیسے ان کو رہا کریں''۔ یہ بات ایک امریکی سفیر نے ریڈیو میں کہی۔ اس تحقیق کے دوران ایک مریض بھائی محبوب جب امریکی ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے اپنے دسیوں مرض ڈاکٹر کو گنوا دیئے اور کئی مرض پر ہونے والے آپریشن کے نشان بھی دکھائے وہ ڈاکٹر بذات خود اس کا معائنہ کرنے کے بعد بولا کہ دنیا کا کونسا مرض ہے جو تمہیں نہیں لگا اور تم کیسے زندہ ہو۔ یکم مارچ کو چند افغانیوں کی بھی تحقیق ہوئی، اسی شام تحقیق ختم ہوئی اور امریکیوں

نے اپنا پورا زور لگانے کے باوجود صرف گنتی کے تین چار افراد کے جذباتی بیان پر اپنی حکومت کو یہ حکم نامہ جاری کیا کہ ابھی بھی یہ قیدی امریکہ کے خلاف ہیں، ان کے جانے کے بعد تمام ساتھیوں کو واپس بھیج دیا۔ آج سب بلاک والے خوش خوش تھے، آنے والے ساتھیوں کو شاباش دینے اور استقبال کے لئے دروازے پر ہر آنے والوں کو کمر پر تھاپیاں پڑتی دیکھ کر قریب کھڑی کیٹ بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی اور تمام قیدیوں کے پُرتپاک استقبال اور محبت دیکھ کر کیٹ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہر طرف مبارکباد اور تمام تحقیقی ڈرامے کی فلم اور سوالوں کے جوابات پوچھنے والے ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ اس تحقیق میں گلاب نور نے علیحدہ گل کھلایا کہ جب امریکیوں نے اس سے سوال کیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر مسلمانوں کی وراثت تھا وہ تباہ ہوا تو نقصان مسلمانوں کو ہوا تمہارا کہاں''۔ ایک بار پھر تحقیق کے بعد آزادی کی امنگ پیدا ہونے لگی۔

بہار کے دنوں میں شبرغان شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اس طرح کے روزانہ چار ساتھیوں کو ایکسرے کے لئے شبرغان کے بڑے ہسپتال لے جایا جاتا اور ان دنوں مریضوں کے اعتراض آڑے آئے کہ سیکورٹی کے پیش نظر دو افراد روزانہ جایا کریں گے، پندرہ دن سے میں بھی اپنی باری کے انتظار میں تھا، ایک دن میرا اور ایک افغانی ساتھی کا نام آ گیا، جیل کے اندر عرصہ دراز سے رہنے والے سے پوچھو تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کی ہوا کیسے لگتی ہے، ہلکی ہلکی چھبن کرتی ہوئی دوپہر کو ہم دونوں ایک بیڑی سے باندھ کر باہر کھڑی ''ایمرجنسی'' کی لینڈ کروزر میں بٹھا دیئے گئے، ڈسپنسر عبدالوالد اور ایک عسکر امان اللہ ساتھ تھا جیل کو باہر سے خوب رنگ روغن سے سجایا ہوا تھا اور بڑی سڑک تک دو رویہ درختوں کی چھاؤں تھی۔ یوں گاڑی سڑک پر چڑھے تو گزرنے والی ہر گاڑی پر دوستم کی تصویر لگی نظر آتی، پانچ سات سفر کے بعد گاڑی مضافات کو چھوڑ کر شہر میں داخل ہوئی، نوجوان فٹ بال اسٹیڈیم میں ٹیکریں پہن کر کھیل رہے تھے، کبھی ان میں پگڑی اور شلوار قمیض والے کھیلتے نظر آئے، یہ منظر ابھی آنکھوں کے پردے سے ہٹا نہیں تھا کہ اب راستے میں دو رویہ فٹ پاتھوں پر سکول و کالج کی لڑکیوں کی قطار چھٹی کے بعد گھر کو جا رہی تھی۔ شبرغان ریاست (سیکرٹریٹ) کا دفتر اور دوستم بادشاہ کا محل تو راستے میں پڑتا تھا۔ غرض مختصر پندرہ منٹ کے سفر کے بعد شفاخانے پہنچنے پر ایک بیڑی سے ہم دونوں کے پاؤں باندھے ہوئے تھے۔ ایکسرے سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی میں بیٹھے، اب ساری توجہ موسم کی طرف تھی، پارکوں میں رنگ برنگے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پھول اور درختوں کی قطاریں روح افزا معلوم ہوتی تھی، ایک گھنٹے بہار کی رنگینیوں کو دیکھنے کے بعد بالآخر جیل کے آہنی دروازے سے داخل ہو گئے، ایک گھنٹے نے سوا دو سال کا حبس سینے سے نکال باہر کیا۔

O

نیا باب

موسم بہار کا عروج ابھی قائم تھا طاہر چرخی اپنی تعریف کا دلدادہ شخص تھا جب چڑھا لیتا تو بلاکوں کے دروازے کھول دیتا۔ اکثر ساتھی مسجد میں بڑی جماعت کرانے لگے شام کو روزانہ فٹ بال کھیلنے والے باہر نکل جاتے اور سب سے عجیب بات کہ موسم بہار کا ہندوانہ تہوار شبرغان میں بھی پہنچ چکا تھا۔ ہر روز خاص کر جمعے کی چھٹی کو شہر کی طرف سے پتنگ بازی ہوتی اور جیل میں بھی مقامی قیدی پتنگیں اڑاتے۔ اکثر باہر سے آ کر جیل میں پتنگیں بھی گرتی۔ ڈاکٹر ارشاد نے ابراہیم، شاہ اکبر اور دوسرے ساتھیوں سے بات کر کے فٹ بال ٹیم بنائی اور مریضوں اور بلاک والے قیدیوں کا مقابلہ منعقد ہونا تھا۔ جمعہ کے روز میچ کا پروگرام بنا لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ جمعے کو ڈنڈے کا میچ پڑے گا۔

جمعرات 29 اپریل کو عصر کے وقت طالبان بلاک کے باشی اکبر کو کمرے میں بند کر کے مار پیٹ اور تشدد کا نشانہ بنایا جس پر افغانوں نے سالن اور روٹی لینے سے انکار کر دیا۔ پاکستانی بلاک والے اس سے پہلے روٹی لے آئے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر طاہر چرخی اپنے چیلوں سمیت غرور کے ساتھ افغان بلاک کے دروازے پر آیا، گالیاں اور دھمکی دینے کے بعد کیبل سے مار پیٹ شروع کی، جس پر طالبان نے شاہین کی طرح اس کو جھپٹا اور کافی زدوکوب کیا، بڑی مشکل سے جیل کا عملہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ صحن سے ملحقہ چھت پر سے کچھ سپاہیوں نے پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ نیچے سے طالبان نے بھی پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ جلدی سے صحن کے ساتھ والا دروازہ بند کر دیا۔ طالبان بلاک میں تین کمرے مجرم مقامی قیدیوں کے تھے۔ انہوں نے اونچ نیچ کی تو ہائے ہائے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ تک ان کی بھی خوب مرہم پٹی ہوئی۔ جیلر آیا تو اس نے سنت سماجت کر کے ان سب قیدیوں کو وہاں سے نکلوا دیا۔ تینوں بلاکوں پر رات کے وقت ڈنڈہ بردار پہرے دار مقرر ہوئے۔ ساری رات 950 افغانی و پاکستانی سوئے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نہیں سب سے بڑا نقطہ جو کہ سب مجاہدین کے لئے توجہ کا مرکز بنا تھا کہ اب ازبک قوم آئندہ کیا قدم اٹھائے گی۔ کیونکہ سب کو دشتِ لیلیٰ کی کہانی..... ہوا بند کنٹینروں میں دوستم کی سفاکی اور ظلم کے ساتھ مجاہدین کی شہادتیں یاد تھیں..... پرکنگ کے دشت میں چھروں کے ساتھ زندہ مجاہدین کو ذبح کرنا آنکھوں میں گھوم رہا تھا..... مزار شریف اور قلعہ جنگی میں لاشوں کے انبار دماغ میں چسپاں تھے..... لیکن اللہ کی قدرت ان مجاہدین کا ایسا رعب بیٹھا کہ وہ کوئی حرکت نہ کر سکے۔ ساری رات میٹنگوں اور تبصروں میں گزری۔ باہر دوستم انتظامیہ حرکت میں تھی تو اندر بھی اللہ کے دین کے سپاہی قید ہونے کے باوجود ہر قسم کی صورت حال سے ٹکر لینے کو تیار تھے۔

ہڑتال کے دوران کابل میں کرزئی حکومت کا وفد مذاکرات کے لئے آ گیا اس وفد کا سربراہ جنرل ابراہیم وزیر جیل خانہ جات کا معاون تھا اور اس کے ساتھ ایک اعلیٰ عہدیدار شاہنواز خان بھی تھا۔ اس وفد سے مذاکرات کے لئے تینوں بلاک کے ساتھی مدیریت (جیلر کے دفتر) گئے۔ کئی گھنٹے کی بات چیت میں ''ایمرجنسی'' کے علاوہ ریڈ کراس کے نئے آمدہ فیلڈ ڈیلیگیٹ گیلھم روبر بھی شامل تھا۔ ریڈ کراس والوں نے بھی سماجت کی اور کہا کہ آپ صرف ایک مرتبہ ہاں کر دیں۔ آپ کے لئے چیک خوراک کا کنٹینر شبرغان شہر میں کھڑا ہے۔ دفتر کے باہر میڈیا والے پل پل کی خبروں کو سمیٹنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ بلاک میں چوبیس گھنٹے میں ہر گھنٹے بعد پشتو اور فارسی میں شبرغان کے اعتصاب (ہڑتال) کی خبریں سننے میں ملتی لیکن ہماری استقامت برقرار رہی اور ہم نے رہائی کے علاوہ کوئی بھی اور بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ایک دن پھر مذاکرات کا دور انیہ چلا، جس میں کابل سے آمدہ وفد نے بتایا کہ آپ کے مریض ساتھی کابل جیل پہنچ چکے ہیں اور کرزئی سے ہماری بات ہوئی اور آپ کے مطالبات بتا دیئے۔ کرزئی نے رہائی کی یقین دہانی کرانے کے ساتھ سب قیدیوں کو پل چرخی جیل منتقل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی بتایا کہ مزید ایک قافلہ روانہ کرنے کا پروگرام ہے۔ ہمیں گاڑیاں نہیں مل رہیں اس کے علاوہ ایمرجنسی کی ایک اور ٹیم بھی کابل سے آئی جس میں ایمرجنسی کے ڈائریکٹر ''گینو'' کے خاص افراد بھی تھے۔ اس روز میڈم کیٹ اور امریکی صحافی کی توں تکار بھی ہوئی کیونکہ وہ کیٹ کی ٹیم کو بلاکوں کی طرف جانے پر اعتراض کرنے لگا جس کا جواب مذاکرات کرنے والے طالبان نے دیا کہ ایمرجنسی کے علاوہ کسی کو بھی بلاک میں نیچے اترنے کی اجازت نہیں۔ جیل حکام قیدیوں کا وقتی طور پر ہر مطالبہ مان لیتے۔ ایمرجنسی کی ٹیم لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے نیچے اتر آئی

کیٹ کے پاس ایک بیگ اور سفید لفافے تھے۔ دو نمبر کمرے میں چند ساتھی اکٹھے ہو گئے۔ کیٹ نے مجھے بلا کر ہر لفافے پر انگلش میں نام اور ولدیت لکھنے کو کہا اور جس ساتھی کی جتنی رقم ہوتی کیٹ وہ رقم لفافے پر لکھ دیتی۔ کیٹ کو رقم اس لئے جمع کروائی کہ لالچی عملہ تلاشی کے دوران روپے نہ نکال لے۔ یہ رقم ایمرجنسی کو امانت کے طور پر جمع کروائی کہ کابل جا کر ہم واپس لے لیں گے۔ تینوں کے پاس رقم زیادہ تھی اور تینوں بلاکوں کی رقم اکٹھی کر کے پھر انہیں علیحدہ لفافوں میں بند کرنا کئی گھنٹے اس میں صرف ہوئے۔ عصر سے پہلے فضل ہادی آیا اور تینوں بلاک سے مناسب تعداد میں نفر نکالنے کا کہا۔ فضل ہادی نے آج جعلی مسکراہٹ سے کہا کہ پہلے رہائی کے لئے فضل ہادی کا قلم چلتا تھا۔ آج تم اپنی مرضی سے قلم چلاؤ، تقریباً تین سو کے قریب ساتھی شبرغان جیل سے نکل گئے۔ یہ مرحلہ بھی بڑا کٹھن تھا۔ کئی ساتھیوں نے قربانی دی کہ ہم آخر میں جائیں گے۔

ظہر کی نماز شبرغان جیل میں آخری نماز ثابت ہوئی۔ ناموں کی فہرست بھی تیار ہوئی اور کمبل اور جوڑے سمیت کچھ ضروری سامان لئے قطار لگائے نکل پڑے، ریڈ کراس اور ایمرجنسی والے کارڈ دیکھتے رہے۔ دولت کے کارندے آخری مرتبہ ہمارے نام ثبت کر رہے تھے۔ نئے آہنی دروازے کے پار ازبک درندے تلاشی لے رہے تھے اور کئی سامان چھین لئے۔ آخری بار کرہ خانہ کے بلاک کا کرنا تھا، وہاں سے نام پکارنے پر مین گیٹ کی طرف رواں ہو گئے۔ نئے دروازے کے قریب انٹرویو لیتے ہوئے میرا بھی نمبر آ گیا، میں نے پوچھا تم چار دن سے پھرنے والے کون ہو۔ جیب سے اپنا کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا اس پر لکھا AP پڑھ کے میں سمجھ گیا کہ یہ امریکی بلائیں اوّل سے آخری دن تک کسی نہ کسی صورت میں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ حالات بھی ہوئے اس دوران قیدیوں کو ہاتھوں اور پاؤں میں دو قیدیوں کو اکٹھے زنجیروں سے بندھ کر تالا لگایا جا رہا تھا اور بس کے اندر تک وہ مجھ سے بیان لیتا رہا۔ جیل کے باہر مورچے بنے ہوئے تھے اور مسلح دوستم ملیشیا سڑکوں پر گشت کر رہی تھی۔ شبرغان جیل نے تاریخ رقم کر دی کہ جب ہم جیل میں کنٹینروں میں لاد کر لائے گئے تو ایک ہفتے سے بھوک و پیاس کا عالم تھا اور اب الوداعی دن بھی وہی پہلے والی حالت تھی۔ یہ اتفاق اور دوستم کے مظالم ازبک درندوں کی پہلی اور آخری مہمان نوازی کبھی نہیں بھولے گی۔

ایک گھنٹہ تقریباً باہر بسوں میں بیٹھے رہے۔ ایمرجنسی والے ہر ساتھی کو ایک پیکٹ دیتے جس میں جوس بسکٹ وغیرہ تھے لیکن یہ سات دنوں پر مشتمل ہڑتال کی، کسی کو پورا نہ کر سکے۔ یوں تین

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بجے کے قریب سات بسوں کا یہ قافلہ مزار شریف کی طرف چل پڑا۔ ڈھائی سال بعد شبرغان سے رہائی کا دن عجیب سا لگتا، باہر ہلکی ہلکی پھوار اور دل میں بھی خوشی کی بہار کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہوئی میں تو صرف جیل ہی کو بس میں بیٹھے دیکھتا رہا کیونکہ شبرغان جیل سے ہم نے بہت کچھ سیکھا اور احساس تشکر سے آنکھیں بھیگ گئیں۔

آگے پیچھے سیکورٹی کابل سے آمدہ پولیس کی گاڑیاں ساتھ تھی۔ جنرل ابراہیم اور سرکاری افسران بھی ایک لینڈ کروزر گاڑی میں سب سے آگے چل رہے تھے اور فاصلے پر ''ایمرجنسی'' کی چار لینڈ کروزر گاڑیاں بھی ہمراہ تھیں اور ریڈ کراس کی گاڑیاں مزار شریف تک ساتھ چلتی رہی۔ کڑے پہرے میں یہ قافلہ رواں تھا۔ شبرغان شہر کو چھوڑتے ہوئے قافلہ دشت و بیابان میں گم ہو گیا اور شمال کی گیس فیلڈ کی بڑی پائپ لائن برلب سڑک مزار تک آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکی، شبرغان کے ضلع آقچہ کا نظارہ بھی ہوا جو سرسبز و شاداب تھا۔ یہ سرسبزی اصل میں دوستم کے کمانڈروں کی بوئی ہوئی تریاق کی فصلوں کی تھی۔ دوستم ملیشیا کی ایک چیک پوسٹ سے گزرتے ہوئے راہداری کے لئے رکنا پڑا۔ عصر کی نماز بندھے ہاتھوں سے بس میں بیٹھے اشاروں سے پڑھی۔ بھائی گلزار اور میرا پاؤں ایک زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گرمی کی وجہ سے پسینے چھوٹے تو کنڈیکٹر سے کہہ کر چھت کی کھڑکی کھلوالی۔ مغرب کے بعد ہم مزار شریف پہنچے وہاں پر کمانڈر عطا محمد کی ملیشیا ہر طرف گاڑیوں میں گشت کر رہی تھی۔ ہر گاڑی میں ''ایمرجنسی'' کا ڈاکٹر یا ڈسپنسر موجود تھا۔ ڈاکٹر حبیب اللہ پنج شیری نے دوائی کا صندوق میرے سپرد کیا جس میں انجکشن اور دوائیاں موجود تھیں۔ میڈم کیٹ بھی ہر گاڑی میں دورہ کرتی رہی، کئی ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں سخت بندھے ہونے کی وجہ سے خون جم گیا۔ کیٹ نے چابیاں منگوا کر ہتھکڑی ڈھیلی کروائی۔

رات کے اندھیرے میں صوبہ سمنگان پہنچے جہاں ایک گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے تین گھنٹے اسی جگہ کھڑے رہے تھوڑی دیر اونگھنے کا موقع ملا لیکن گاڑی کی حرکت کے بعد نیند اڑ گئی۔ سمنگان کو الوداع کہتے ہوئے ہم صبح کے وقت صوبہ بغلان پہنچ گئے۔ پل خمری کے لوگ ہاتھ کے اشاروں سے بدتمیزی کا اظہار کر رہے تھے۔ کئی مقامات پر لوگوں کے ہاتھ ہلانے سے یوں لگتا کہ وہ طالبان کو ڈھائی سال بعد دیکھنے پر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ جس طرف سے ہمارا قافلہ گزرتا، لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو جاتے۔ پل خمری سے ہوتے ہوئے ضلع دوشی کے قریب دریا کا پل عبور کرتے ہی وہ ہوٹل نظر آیا جس میں ہم نے امارات اسلامی داخل ہونے کے

بعد ناشتہ کیا تھا۔ ہوٹل فحش گانوں اور تصویروں سے مزین تھا۔ دوشی کو چھوڑتے ہوئے ایک دفعہ پھر سنگلاخ پہاڑوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ بغلان کے آخری ضلع تجان پہنچنے پر ہر طرف شہتوت کے درخت نظر آئے۔ یہ سخت جان تاجک اکثریت کا ضلع ہے۔ تھوڑی دیر سفر کرنے کے بعد سالنگ ہائی وے شروع ہو گئی۔ اب ہم صوبہ پروان میں داخل ہو گئے تھے۔ سالنگ ہائی وے 1960 کی دہائی میں روس نے بنائی تھی تاکہ روس کا کابل سے سارا سال رابطہ قائم رہے۔ یہ سڑک ہندوکش کے پہاڑی سلسلے کو کاٹتی ہوئی جنوبی اور شمالی افغانستان کو ملاتی ہے۔ اپنے قبضے کے دوران روس افغانستان میں 75 فیصد فوجی ضروریات اسی سڑک سے پوری کرتا تھا۔ افغانستان کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ کوہ ہندوکش کے سخت برفیلے پہاڑ دور سے نظر آتے تھے۔ گاڑی اگلے سیدھے مڑنے کے ساتھ ساتھ اونچائی کی طرف حرکت کرنے لگی۔ اس علاقے میں پہنچتے ہی سورج آنکھ مچولی کرنے لگا لیکن دو گھنٹے مسلسل سفر کرنے کے بعد اب بادلوں کے سائے بھی نظر آتے برف پوش پہاڑوں کو بادلوں نے لپیٹا ہوا تھا۔ کسی جگہ بادل کے ٹکڑے فضا میں معلق نظر آتے، گاڑی کا سفر گویا کہ ہوائی سفر معلوم ہونے لگا جگہ جگہ پر سڑک کی تعمیر کا کام بھی جاری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بارش بھی زوروں پر تھی لیکن مزید ایک گھنٹہ اونچائی کی طرف سفر کے بعد یہ بارش برف باری میں تبدیل ہو گئی۔ ہر طرف برف پوش چوٹیاں اور سڑکیں تو گویا برف سے بھری پڑی تھیں۔ ''سالنگ ٹنل'' آ گئی۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد گاڑی اترائی کی طرف بڑھتی رہی ایک جگہ پر چند موٹر مکینکوں کی دوکانیں دیکھ کر حوصلہ ہو گیا کہ شکر ہے اس ویرانے میں کوئی مستری بھی موجود ہے۔

بالآخر جس بات کا خدشہ تھا ان دوکانوں سے آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک گاڑی خراب ہو گئی۔ برف باری کی جگہ تیز بارش نے لے لی۔ ''ایمرجنسی'' کا عملہ اور سیکورٹی افسران بارش میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے نظر آئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی ٹھیک ہوئی۔ اس جگہ پر کئی ساتھیوں نے پیشاب کا مطالبہ کیا تو ساتھیوں کو یکجا باندھنے کے باوجود پولیس اہلکار نے کئی اترے ہوئے ساتھیوں کو مارا اور مزید کسی کو بھی اترنے کی اجازت نہ ملی۔ یہ تکلیف الگ سے پریشان کئے جاتی۔ اب یہ قافلہ ''جبل السراج'' کے قریب پہنچ گیا جہاں پر کچھ ہوٹل بھی نظر آئے۔ ان میں ایمرجنسی کا بھی ایک ریسٹ ہاؤس تھا۔ سالنگ کی سڑک ختم ہو چکی تھی اور برف باری کا ادھر نام و نشان بھی نہ تھا۔ البتہ راستے سے ہی برسنے والی بارش ادھر والوں کی شکل اختیار کر گئی اور گاڑی کے چاروں طرف سنگ باری کا سماں تھا اور کسی وقت بڑا اولا گرتا تو ڈر محسوس ہوتا کہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کہیں یہ شیشے کو توڑتا ہوا اندر داخل نہ ہو جائے۔ بالآخر چھ گھنٹے کے مسلسل خطرناک دشوار گزار سفر کے بعد ہم ضلع جبل السراج کے سرسبز علاقے میں داخل ہو گئے۔ جبل السراج شہر کے چوک میں احمد شاہ مسعود کے بڑے بڑے پورٹریٹ نصب تھے۔ اچانک ان لمبی ڈاڑھیوں والوں کو دیکھ کر لوگ حیران تھے کہ طالبان پھر اتنی زیادہ تعداد میں کہاں سے آ گئے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی ہاتھوں سے بدتمیزی اور ذبح کرنے کے اشارے کیے۔ صوبہ پروانہ جبل السراج اور چاریکا تا جگ نژاد مسعود کے حامیوں کا گڑھ ہے۔ دوکانوں اور گاڑیوں پر بھی مسعود کی تصویر نظر آتی، چند گھنٹے بعد اب پروان کے مرکزی شہر چاریکا داخل ہوئے جو کہ سرسبز و شاداب میدانی شہر ہے۔ بڑی بڑی مارکیٹوں اور دوکانوں سے سجا ہوا یہ شہر بھی بارہا طالبان کی یلغاروں کا مرکز بنا تھا۔ طالبان دور میں یہاں کئی ماہ طالبان محصور بھی رہے تھے۔ اس سے چاروں طرف پہاڑ دوری پر واقع ہیں۔ چاروں طرف انگوروں کی بیل والی فصلیں، خوبانی اور سیب کے درخت نظر آتے، انگور تو گویا پورے افغانستان میں سب سے زیادہ اسی صوبے میں پیدا ہوتا ہے۔ افغانستان کے لوگ اکثر انگور اور شہتوت کو خشک کر کے بیچتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں ضلع بگرام پہنچے بگرام اب پہلے سے بدلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پر امریکیوں نے نئی تعمیرات کر کے اس علاقے کا نقشہ بدل ڈالا تھا اور بگرام ایئر بیس بھی دور سے نظر آئی جس میں امریکیوں کی بدنام زمانہ پُرتشدد جیل بھی ہے۔ کابل بگرام سڑک پر امریکی بکتر بند گاڑیاں ہمارے آگے پیچھے گشت کرنے لگیں۔ ہمارے قافلے کو دیکھ کر ان کی گاڑیاں رکتی اور مسلح فوجی چوکس ہو جاتے۔ نیٹو فوج اور آئیساف کی گاڑیاں بھی اس سڑک پر نظر آتی۔ کابل شہر کے مضافات والا علاقہ صنعتی بنا دیا گیا۔ امریکی تعاون سے چلنے والی صنعتیں جابجا نظر آئیں اور کابل میں اسی سڑک پر نیٹو کی یورپین طرز پر بنی بلڈنگ نظر آئی۔ نیٹو کے ہیڈ کوارٹر پر ان کے اتحادیوں کے ہر ملک کا جھنڈا برلب سڑک بنی دیوار پر قطار در قطار آویزاں تھا اور اس کے اندر بڑی بڑی بوسٹر اور بڑے ٹیلی کمیونیکیشن کے کھمبے جابجا لگے تھے۔ کابل شہر اب پہلے سے بدلا ہوا نظر آیا۔ یہ قافلہ کابل، جلال آباد، سڑک کو ایک طرف سے کاٹتے ٹیلوں اور صحرائی زمین کی طرف چلا۔ آدھ گھنٹے بعد پُل چرخی جیل کی برجی پر نصب بھاری گن نظر آئی۔ تقریباً چوبیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ اس سفر پر اگر نگاہ دوڑائیں تو ان چند گھنٹوں پر محیط سفر بڑا عجیب و غریب لگتا ہے۔ اس سفر میں جہاں سخت گرمی اور پسینے سے دوچار ہوئے، تو سخت سردی سے کانپتے بدن کو چادر سے بھی ڈھانپا، برف باری، بارش اور اولوں کا برسنا، سب سے بڑھ کر بہار کا موسم، گویا

ایک سفر اور کتنے ہی قسم کے مناظر اللہ تعالیٰ نے دکھا دیے۔ قافلہ بڑے آہنی دروازے پر رُکا۔

○

بڑے آہنی دروازے پر لوہے سے نقش "**مرکزی مجلس اور جزاء السیئة السیئة**" پڑھتے داخل ہوئے، سرمئی وردیوں میں ملبوس پولیس اوپر نیچے، دائیں بائیں، پریشان پھر اُدھر بھاگتی نظر آئی۔ جیل کے اندر بنے ایک اور آہنی دروازے سے ایک ٹیم پہلے سے موجود نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ ریڈ کراس ہماری آمد کی خبر سن کر جیل میں ہم سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ ایک ٹینکر پانی سے اسی وقت آیا اور ایک طرف دیوار سے اپنی پشت کی جانب لگ گیا۔ بس میں بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ٹینکر پانی لے کر آیا تھا۔ پائپ کے ذریعے مربع شکل میں زمین پر پڑی ایک پہلے کی پیراشوٹ والی ٹینکی میں پانی بھرا جانے لگا۔ یہ ٹینکی تھوڑی دیر بعد ہمارے دیکھتے ہی غبارے کی طرح پھول گئی۔ تقریباً گھنٹہ بھر بس میں بیٹھے پُل چرخی کی عمارت اور روشن دان کی طرح پھر کھڑکیوں کو دیکھ کر کوستے رہے کہ یہ تو کسی چڑیا گھر میں لے آئے ہیں۔ بس سے اتر کر آہنی دروازے کو ہم دو یکجا بندھے ہوئے ساتھی پار کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو حوصلے سے چلنے کی تلقین کرتے رہے گویا پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا محاورہ ہم پر صادق آ رہا تھا۔ اس لیے کہ ایک ساتھی بھی اپنی مرضی سے تیز قدم اٹھاتا تو دوسرے کو تکلیف اور گر پڑنے کا خطرہ ہوتا۔ خیر اس منزل یہ منزل چڑیا گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے بھی آہنی دروازے کو پار کر کے اس کے ساتھ والی وقت کے اہلکار کاغذ لیے بیٹھے نام درج کرتے، شبرغان جیل میں تو شاید شہر کا سارا کاغذ ہمارے ناموں کے اندراج پر خرچ ہو گیا تھا۔ اب کابل والوں نے بھی سٹور میں پڑی روی کی بوریوں کے منہ کھول دیے، ایک طرف منہ ٹیڑھے کیے ہوئے بڑے غصیلے انداز میں چابیاں ڈھونڈ کر قیدیوں کے ہاتھوں اور پاؤں کے تالے کھولنے والے عسکر نظر آئے۔ میرا نمبر آیا تو ہاتھ والی زنجیر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ حیرت سے دیکھنے لگا، پشتو میں پوچھا۔ لیکن مسکرا کر ٹال دیا۔ دل میں ہنسی بھی آئی کہ ہاتھ والی زنجیریں تو ساتھی شبرغان سے نکلنے کے بعد ہی کھول چکے تھے، اکثر ساتھی ہاتھ کی زنجیریں عسکروں کو پکڑا کر کہتے۔ "برادر جان ہاتھ کی زنجیر پکڑا او اور پاؤں کی کھول دو"۔

اسی طرح دوسری منزل پر چڑھے سیڑھیوں کے ساتھ آہنی دروازے کے پار دو طرفہ کمروں کی قطار والے بلاک تھے جس میں پیش آمدہ ساتھیوں سے جنگلے پر کھڑے علیک سلیک ہوتی رہی۔ منزل بھی اسی ایک شکل کے کمرے تھے فی کمرہ میں تین افراد کی رہائش تھی۔ ان کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

دروازے لاکپ کی طرح باہر سے بکسے سے بند ہوتے۔ دوسری منزل چاروں طرف سے لوہے کے جنگلے پر مشتمل تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد واقعی محسوس ہوتا کہ چڑیا گھر میں بند کر دیا ہے۔ کھڑکیوں سے دوسرے بلاک والوں سے گپ شپ ہو رہی تھی اور پتہ چلا، اینٹ جتنے وزن اور ساخت کی یہاں ملنے والی روٹی کابل شہر میں لگے پلانٹ سے پک کر آتی، جو کہ روزانہ ایک ملتی ہے اور دوپہر کو چاول، رات کو سالن۔

افغانستان میں کئی جگہوں کے نام پلوں کی مناسبت سے رکھے جاتے ہیں مثلاً پل خمری، پل خشتی، اسی طرح پل چرخی کے علاقے کی نسبت سے پل چرخی جیل کہا جاتا ہے۔ پل چرخی جیل کابل سے تقریباً بارہ کلومیٹر ایک لق ودق ویرانے میں واقع ہے۔ وسیع وعریض قلعہ نما پل چرخی جیل کی تعمیر داؤد خان کے دور میں شروع ہوئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پل چرخی اقوام متحدہ کے ثقافتی ادارے ''یونیسکو'' کی امداد سے پایہ تکمیل کو پہنچی، اصل قصہ کچھ یوں تھا کہ یونسکو نے اس کمسن مجرموں کے لئے ایک ''اصلاحی گھر،، کی حیثیت سے تعمیر کروایا۔ اتفاق دیکھئے کہ پل چرخی اونا پونا مکمل ہوا تھا کہ داؤد کا تختہ الٹ گیا، انقلاب کے بعد کامریڈوں نے اسے اپنے ملک کی مرکزی سیاسی جیل میں بدل دیا۔ اس کے علاوہ افغانستان کی سب سے پرانی جیل ''دیہہ مزنگ'' ہے لیکن پل چرخی میں بہت زیادہ تعداد میں قیدیوں کو رکھنے کی جگہ موجود ہے۔ اس جیل کی تاریخ میں کمیونسٹ حکومت برسر اقتدار آنے اور اقتدار کی کشاکش میں جانبین کے اہم کمانڈر اور کارکن اس جیل میں اسیر رہے اور اکتالیس ہزار تک قیدی ایک وقت میں رہ چکے ہیں اور جب چند ماہ بعد کمیونسٹ حکومت نے ان قیدیوں کی رہائی کا اعلان کیا تو پل چرخی جیل سے نکلنے والی سڑک پانچ کلو میٹر تک بسوں اور قیدیوں کے خاندان والے افراد سے بھر گئی تھی اور اس دور میں افغانستان کے جس گھر کا کوئی فرد لاپتہ ہوتا تو وہ اکثر پل چرخی جیل سے مل جاتا۔

پل چرخی جیل بدنام زمانہ قیدیوں کے ٹھونس کر بھرنے کے علاوہ ٹرچر سیل میں اذیب ناک سزاؤں اور سینکڑوں کو ایک ہی دفعہ ہلاک کرنے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ''روس کے قبضے کے دوران بدنام زمانہ جیل پل چرخی کے بلڈوزر دن اور رات اجتماعی قبریں کھودنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ بے گناہوں کو بغیر دفنانے ان اجتماعی قبروں میں دھکیل دیا جاتا''۔

اطلاعات کے مطابق کم از کم تیس گڑھے ایسے بھی کھودے گئے تھے جن میں ہر ایک میں ایک سو پابند سلاسل قیدیوں کو دھکیل کر بلڈوزروں کے ذریعے انہیں زندہ زمین میں دفن کیا گیا۔

پل چرخی کے پہلے ''انقلابی کمانڈر'' سید عبداللہ کا ذکر کئے بغیر اس جیل میں سزائے موت اور ظلم وستم کا قصہ مکمل نہیں ہوگا۔ سید عبداللہ نے انقلاب کے فوراً بعد اس جیل کا چارج سنبھالتے ہی قیدیوں کو ان کے کمرے کے اندر قتل کرنے کی نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ کامریڈوں نے سویت فوج کی آمد سے قبل تک کیس، کچہری جیسا کوئی جھنجھٹ تو پال نہیں رکھا تھا۔ لہٰذا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے لے کر پل چرخی کے سپرنٹنڈنٹ سید عبداللہ مرنے والوں کو اپنے پاؤں پر چل کر سر مقتل تک پہنچنے کی زحمت دینے کی بجائے قیدی کو اپنے اطاقچے ہی میں گولی کا نشانہ بنانے کا عادی تھا۔ پل چرخی کے اطاقچوں کی اندرونی دیواریں ابھی تک اس چاند ماری کے باعث چیچک زدہ نظر آتی تھیں۔

O

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نیا باب

یہ بھی معلوم ہوا کہ سید عبداللہ نے ایک دفعہ تین سو قیدیوں کو اوّل بلاک کے دالان میں جمع کر کے ان پر چہار جانب سے مشین گنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس مار ماری کے دوران میں پچیس تیس قیدیوں کا ایک گروپ جان بچانے کی خاطر بھاگتا ہوا جیل کمانڈر کے کمرے میں جا چھپا مگر سید عبداللہ کے حکم پر کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا دی گئی چنانچہ سپاہیوں نے روشن دان کے ذریعے کمرے کے اندر دستی بم پھینک کر ان قیدیوں کو جان بحق کر دیا، اس کمرے کے زخمی در و دیوار پر مرمت کی مرہم پٹی کے باوجود اس کارروائی کے انمٹ نقوش دیکھے جا سکتے ہیں یا یہ کمرہ بلاک میں داخل ہوتے بائیں ہاتھ پر واقع ہے۔

1981ء کے وسط میں سزائے موت کے ایک ایسے قافلے میں پولیس اور قیدیوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس باہمی جنگ کے دوران سزائے موت کے تمام قیدی فرار ہو گئے۔ کامریڈوں نے اس تلخ تجربے کے بعد پل چرخی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی قطار لگانا شروع کر دی۔ عبداللہ کی درندگی سے تنگ آ کر اس وقت کے بلاک 2 کے قیدیوں نے اس سے دائمی نجات پانے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے پہرے داروں کو کچھ دے دلا کر ایک عدد چاقو جیل کے اندر سمگل کروا لیا۔ حسب معمول جیلر عبداللہ اس بلاک کے دورے پر نکلا تو ان قیدیوں نے جھپٹ کر اس کو قابو کر لیا اور چاقو کے پے در پے وار سے جیلر کی انتڑیاں باہر کر دیں لیکن عبداللہ کی موت چاقو سے نہ لکھی تھی۔ لہٰذا وہ کئی دنوں تک ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔ بالآخر حکومت نے اس کی قیمتی جان بچانے کی خاطر بغرض علاج ماسکو روانہ کر دیا۔ ماسکو کے کامریڈوں نے کچھ اس محنت سے ان کا علاج کیا کہ انہوں نے مردے میں دوبارہ جان ڈال دی۔ سید عبداللہ صحت یاب ہو کر واپس کابل آ گیا۔ ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ حفیظ اللہ امین کی درخواست پر سرخ فوج کابل میں آن اتری۔ افغانستان میں چہروں کی تبدیلی کے اس کھیل کا اگلا منظر کچھ یوں تھا کہ ماسکو کے کامریڈوں نے سید عبداللہ کو پل چرخی کے آہنی کمروں میں لا کر بند کر دیا۔ پل چرخی کی خون آلود تاریخ کا نیا باب لکھا گیا جب

عبداللہ کو یہاں گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔

پل چرخی میں پہلی رات اپنی اپنی جگہ پر شبرغان سے ساتھ لائے ہوئے ایک کمبل کو بچھا کر لیٹ رہے۔ کچھ تو شبرغان سے آزادی کی خوشی میں اپنا کل اثاثہ جیل میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ کچھ بیچارے لالچی عملے کے آخری تیر کا شکار بن کر سارا سامان اور کمبل گنوا آئے۔ اب خالی ہاتھ کابل میں انہیں کچھ دن زمین ہی کو بچھونا بنانا پڑا۔ "دولت" کو انتہائی تشویش ہوئی، ہزار کے قریب قیدیوں کے اضافے نے انہیں بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا۔ اس کا جیلر کمانڈان کنڈک عبدالسلام اور بلاکوں کا ذمہ دار کمانڈان شیر زمان تھا۔ یہ دونوں پشتون اور زیادہ تر عملہ تاجک فارسی بان تھا۔ اس عملے کی اکثر سرمئی وردی اور ٹوپی پہننے سے جرنیلوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ اگر کوئی ساتھی پہریدار یا مامور شکایت کرتا تو سپاہی غصے سے کہتا، یہ کابل جیل ہے ہمیں کمانڈان کہہ کر پکارا کرو۔ جب ساتھی پیشاب کے لئے دروازے پر آتے تو پہریدار کو کمانڈان کی آواز پڑتی تو وہ آداب کمانڈانی بجا لانے کے لئے خوش ہو کر تالا کھول دیتا۔ شبرغان جیل میں تو بڑی آرزو ہوتی کہ کابل جیل تبادلہ ہونا چاہئے اور اس کے لئے باقاعدہ صحافی اور جیل کے دروازے پر آئے وزراء کو بھی تبادلے کا کہا جاتا۔ مسلسل اصرار پر وہ بھی شک کرتے کہ لگتا ہے آپ کابل منتقل ہو کر وہاں پر جیل توڑنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں لیکن یہاں پر صرف پیشاب کرنے کی تکلیف اس قدر بڑھ گئی۔

بڑے فخر کے ساتھ جیلر عبدالسلام آتا اور لمبے بھاشن دیتا چلا جاتا، اپنی تقریر میں اکثر کہتا کہ "آپ تو بندی ہیں اور ہم بندایوان" جس کا خلاصہ یہ کرتا آپ کو کوئی تکلیف ہو تو ہم کو بتائیں، ہم صرف آپ کی خدمت کے لئے دن رات ادھر پڑے رہتے ہیں۔ آپ سے زیادہ بوجھ تو ہم پر ہے آپ مزے سے کھا پی کر سو جاتے ہیں اور ہمیں سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ آپ کو ابھی تک جتنی سہولتیں دی ہیں۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے ورنہ جیل میں کون پوچھتا ہے۔

پل چرخی میں صبح اذانوں سے پہلے آہنی دروازے کھلتے، پہرے دار کمانڈان اپنے کمروں میں پڑے سوئے رہتے۔ دروازے پر کھڑی ایک قطار اپنے ہاتھوں میں لوٹے اور کپڑے پکڑے ہوتے۔ اندر غسل خانے بھی موجود نہیں کہ بچے کھچے پانی سے ہی غسل کر لیں، اذان ہوئی جماعت ہو گئی اور کئی ساتھیوں کی فجر کی نماز فوت ہو جاتی۔ مجاہدین کے ماحول کی وجہ سے سب باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ جیل ایسی جگہ ہے کہ یہاں ایمان و یقین کی محنت ہو تو انسان بن جاتا ہے اگر تھوڑا سا بھی ڈگمگائے تو پھر پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ ایمرجنسی نے قیدیوں کی جمع کی گئی رقوم کو واپس دینے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کا پروگرام بنایا تو ''دولت'' آڑے آ گئی کہ دو ہزار سے زیادہ ایک روپیہ بھی نہ دیا جائے۔ میڈم کیٹ بھی اپنا ماتھا پکڑے یہ بتانے آ گئی۔ اس کے علاوہ بتایا کہ اگر کوئی افغانی چاہتا ہے کہ میرے حصے کی ساری رقم مل جائے تو وہ ہسپتال میں قائم ہمارے دفتر میں اپنے رشتہ دار کو بھیج دے، ہم ان کو رقوم واپس کر دیں گے۔ یہ معاملہ اچھے انداز میں طے ہوتا رہا۔ ابتدائی ایام میں کابل سے ایک وفد جو کہ کرزئی کی طرف سے خاص قیدیوں کے لئے بنایا گیا، تشریف لایا۔ مریضوں، بوڑھوں اور بیس سال سے کم عمر والوں کے نام لکھتے رہے ان کی فہرست میں بہت زیادہ تعداد آ گئی تو پریشان ہو کر چلے گئے۔ وہ بھی یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ آپ کی رہائی جلد ہو جائے گی۔ وہی پرانی شبرغان والی فریب کی کہانی ادھر بھی سننے کو آئی۔ تقریباً اوّل مرحلے میں سب قیدی چار بلاکوں میں تقسیم تھے لیکن بعد میں تیسری منزل پر مریضوں کا علیحدہ بلاک بنا دیا گیا۔ ہر بلاک کو صبح و شام پانی لانے اور قضائے حاجت کے لئے اجازت ملتی اور کپڑے دھونے کے لئے بھی صبح کے وقت باہر نکلنے کے لئے پہریدار کمانداں کی منت کرنی پڑتی۔ نیچے میدان میں تینوں کمروں والے بلاک کی کھڑکیاں منزل اور منزل بھر جاتی اور ہر کوئی اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتا رہتا۔ یہ حالت بھی دولت پر ناگوار گزرتی تو سپاہی مارنے کو دوڑتے۔

شبرغان جیل کی طرح آئے روز ادھر بھی نام لکھنے کا رواج بن گیا۔ افغانیوں کے انداز میں ہم بھی ان سے پوچھتے۔ کیا آواز (خبر) ہے تو معلوم ہوا کہ دولت قیدیوں سے پوچھ گچھ کرے گی۔ 6 رجون کو دولت کی سرمئی وردی میں ملبوس رنگ برنگ کے کارندے آئے۔ مرکزی دولت میں دولت کی ریل پیل کی بدولت جیل کے عملے کو نئی کرسیوں اور میزوں کے ڈھیر ملے پڑے تھے۔ دولت کے سٹور کا منہ کھلا اور چوتھی منزل پر انصرام ہوا۔ یہاں سے تو جیل کے باہر نظارے کا لطف مزید دوبالا ہو جاتا۔ خیر ہماری باری آ گئی۔ طالبان اور پاکستانی ترجمان بھی ایک کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ ایک ہی قسم کے فارم پر ہر ساتھی کی علیحدہ فائل تیار ہوتی۔

اب ہم رہائی کے انتظار میں تھے۔ کابل جیل کا عملہ بھی انتہائی بدتمیزی اور تنگ نظر پر اتر آیا، خاص کر پاکستانیوں کو آئے روز کیبلوں سے مارتے۔ جیل کی سیاسی بلاک میں موجود چھوٹی سی لائبریری جہاں پر تاجک قوم کی متعصب کتابیں موجود تھیں۔ ان میں ایک کتابچہ ایک پاکستانی کے ہاتھ لگا اور وہ لا کر مجھے بھی دکھایا۔ اس کتاب میں پاکستان اور اس کے رہنے والوں پر واہیات الفاظ میں ایک ترانہ بنایا گیا اور تاجک قوم کو اس میں یہ کہہ کر ابھارا گیا کہ ''جان لو! پاکستانی ہی تمہاری

قتل کشی کے اصل محرک ہیں اور ان کی قتل و غارت کو مت بھولنا! اور اگر تمہارا بس چلے تو ان کے گشت و خون سے گریز نہ کرنا'' گویا اس کے علاوہ گالیاں تک پاکستان کو اس کتاب میں دی تھیں۔ کتاب فارسی زبان میں تھی۔ آپ بھی یہ تاجک ''طالبان'' کی صفوں میں گھسے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

حالات کو برداشت کرتے ہوئے بڑے حضرات کی آپس میں خفیہ منصوبہ بندی ہوئی اور طالبان حضرات نے سوچا کہ ایک مضبوط ہڑتال کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں جیل کا نقشہ بھی بنا اور جس کے مطابق سب سے پہلا کام بلاکوں سے ملحقہ باہر والا بڑا دروازہ قابو کرنا تھا تاکہ سب بلاک والوں کا آپس میں رابطہ رہے۔ یہ تمام منصوبہ بندی صیغہ راز میں تھی، آہستہ آہستہ اس کے لئے فضا بھی بن رہی تھی لیکن اس منصوبے کی بھنک جیل حکام کو مل گئی۔ جیل حکام بھی ہر قسم کی حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک رات دو نمبر بلاک میں دو پاکستانی آپس میں تو تکار کر بیٹھے۔ جیل کا عملہ پوری تیاری کے ساتھ ان کو لینے آیا اور باہر نکلنے کو کہا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ ہم نے تو معاملہ ختم کر کے صلح کروا دی ہے آپ کو مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ عملہ کی مزاحمت اور مار پیٹ کی دھمکی پر لوہے کے دروازے سے پار پاکستانی و افغانی مشتعل ہو گئے۔ راتوں رات پولیس والے آئے اور بلاکوں کو گھیر لیا۔

دوسرے روز ہر بلاک سے ایک نفر پاکستانی اور زیادہ تعداد افغانیوں کی بلوائی گئی کیونکہ یہاں سے جھگڑا طالبان کے آپس میں بھی گنتی کے چند افراد کی وجہ سے تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس جھگڑے کو جیل میں ہڑتال کرنے کی کوشش سے تعبیر کرتے ہوئے جیل کے عملے اور چند مخالفین نے ہوا دی اور مُلا عبدالرشید اور مُلا مجاہد اخند پر اس کی ذمہ داری ڈال دی کہ سب ان حضرات کا کیا دھرا ہے۔ جیل کے اندر موجود کانفرنس ہال میں دو رویہ کرسیاں اور درمیان میں میز پڑے تھے۔ اس جگہ ہم پچاس سے اوپر قیدی اکٹھے ہو گئے۔ افغانیوں کی تعداد زیادہ تھی تو عملے نے مذاکرات اپنے سیاسی طریقہ کار سے شروع کئے۔ جیل کے عملے اور افسران بالا نے دھمکی آمیز تقریریں کیں جسے ہم سب سنتے رہے۔ اب افغانیوں کی باری آئی تو طالبان کی طرف سے مُلا مجاہد اخند نے عملے سے دو ہاتھ بڑھ کے اپنے موقف کو واضح کیا۔ نفسیاتی طور پر مُلا مجاہد نے ان پر برتری حاصل کر لی۔ اس کے بعد مزید طالبان نے بھی اپنے مسائل سنائے۔ پاکستانیوں کی طرف سے ہم چند ساتھی بیٹھے آپس میں مشورہ کرتے رہے کہ ہماری طرف سے کون بات کرے گا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

چنانچہ باقی ساتھیوں نے مجھے بات کرنے کو کہا۔ اللہ کی نصرت کے ساتھ ہمت کر کے اٹھا اور پورے ہال والوں کو خاموش ہونے کا اشارہ دے کر پشتو میں اپنے مسائل بیان کرتا رہا اور عملے کی شکایت بھی کرتا رہا۔ لیکن چند منٹوں بعد جیلر عبدالسلام نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور اپنی ڈائری میں میرا نام لکھ کر کہا کہ ہم پاکستانیوں کے مسائل بعد میں علیحدہ بلا کر سنیں گے۔ جس مقصد کو افسران کے سامنے بیان کرنا تھا اس کو دوٹوک ہی بتا چکا تھا۔ ان مذاکرات کے دوران باقاعدہ طور پر چار افراد صرف سادہ کاغذ پر قلم چلا رہے تھے اور ہر شخص کا نام اور ولدیت کے بعد اس کی باتیں فارسی اور پشتو میں لکھی جا رہی تھی۔ جنرل ابراہیم تاجک تھا اس لئے دوسرے تاجک افسران سمیت سب کو ایک ترجمان حالات بتا رہا تھا۔ ایک شخص جو کہ بغیر وردی کے نمایاں تھا، وہ ہر نفر کے چہرے کو دیکھتا رہتا جو ساتھی بھی ڈٹ کر بات کرتا وہ اس کا نام پوچھ کر علیحدہ لکھ رہا تھا یہ شخص خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ تھا۔ تقریباً پانچ گھنٹے کے مذاکرات ختم ہونے پر دو نمبر بلاک کی عارضی ہڑتال ختم ہو گئی۔ باہر نکلتے ہوئے چند جرگی سپاہیوں نے گھیر لیا اور مجھے ایک طرف بلا کر دھمکایا کہ آئندہ ہماری شکایت کی تو اچھا نہ ہوگا۔ چلتے چلتے ہی ان کو بھی مطمئن کر دیا لیکن تاجک لوگ اپنی آنکھ کے تنکے کو کبھی نہیں بھول پاتے جس کی وجہ سے وہ مجھے نیچے جانے سے بھی روکتے رہے۔

پل چرخی میں نظارت خانہ صدارت جیل اور پنجشیر کی جیل میں قید ساتھیوں کا بھی تبادلہ ہوا اور کابل میں پکڑے جانے والے ساتھی بھی ادھر منتقل کیے گئے۔ چند دن بعد کماندان بلاک شیر زمان مریضوں کے ناموں والی لسٹ لے کر آیا۔ جن میں 66 پاکستانی اور باقی افغانی تھے۔ اس کے دوسرے دن مرکزی حکومت نے قیدیوں کے لئے بنائے گئے وفد کو بھیجا اور ہر فہرست والا ساتھی کانفرنس ہال میں جاتا اور افسران اس کے نام ولدیت وغیرہ کی پڑتال کرتے۔ جیلر نے ترجمانی کے لئے مجھے کھڑا کر دیا۔ اس جگہ سے فارغ ہونے کے بعد اب جیل کے افسران کہنے لگے کہ ہر قیدی کو پانچ سو روپیہ جرمانہ شبرغان جیل میں توڑ پھوڑ کرنے کا ادا کرنا پڑے گا جو کہ ہماری جیبوں میں نہیں بلکہ دولت کے خزانے میں جائے گا۔ اس جرمانے سے بڑی مشکل سے جان چھوٹی اور دولت کی طرف سے جوتی کپڑا بھی ملا۔ ایک عجیب چیز افغانستان میں دیکھی کہ کابل اور شبرغان میں اعلیٰ افسران ہاتھ میں تسبیح لئے پھرتے یہ لوگ تسبیح پر کچھ پڑھ کے پڑھاتے نہیں بلکہ ایرانیوں، کردوں، ترکوں، اور عربوں کی طرح صرف اعصاب کی بے چینی دور کرنے کے لئے دانے گراتے رہتے ہیں۔ یہیں سے یہ عادت کئی ساتھیوں کو بھی لگ گئی۔ مریضوں کی رہائی کا سن

کر ساتھیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور کچھ بوڑھے سفید ریش بھی ہمارے ساتھ لسٹ میں آئے جن میں دو بوڑھے جو کہ باز پکڑنے مزار شریف آئے ان میں ایک حاجی کابل خان تین سال میں رہا ہونے پر جوان ہو گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ ہماری ورزش ہوتی رہی کہ آج رہا ہوں گے، کل رہا ہوں گے۔ بالآخر جولائی کی ایک صبح ہمیں بلا کر علیحدہ کر کے چوتھی منزل والے بلاک میں منتقل کر دیا۔ جیل سے باہر میدان میں شامیانے سجے اور کرسیاں پڑی نظر آئیں۔ پل چرخی کی سڑک پر حد نگاہ تک جا بجا پولیس والوں کی عارضی چوکیاں بنی نظر آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا کہ کابل کی ساری سیکورٹی آج ادھر آئی ہوئی ہے۔ ریڈ کراس اور ایمرجنسی کی گاڑیوں کی آمد کے بعد قیدیوں کو قطار بنا کر نیچے لے جانا شروع کر دیا۔ بلاکوں میں کھڑے ساتھی خوشی سے الوداعی ہاتھ ہلا کر دعاؤں سے رخصت کر رہے تھے۔ پونے تین سال بعد اپنے وطن جانے کی خوشی کو بیان کرنا انتہائی مشکل ہے۔

جیل سے باہر نکلے تو کرسیوں پر سامنے اسٹیج پر افغانی وزراء کے علاوہ پاکستانی اور دیگر سفارت کار بھی بیٹھے تھے۔ بین الاقوامی اور لوکل میڈیا ہر طرف دکھائی دے رہا تھا۔ میڈیا پر دل کھول کر اور پچھلوں کا خیال رکھ کر بیانات دیئے گئے۔ اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم سامنے بتاتے رہے۔ آدھ گھنٹے کی یہ تقریب سرکاری خطبات اور آئندہ جہاد نہ کرنے والی نصیحتوں سے بھری پڑی تھی۔ پاکستانی سفیر اندراج کرتے اور پانچ سو روپیہ ہاتھ میں پکڑاتے جاتے۔ ایمرجنسی نے بھی جیل سے رخصتی کی خوشی میں ہمیں جوس بسکٹ دیئے اور یوں تین کوسٹر بسوں کا یہ قافلہ ایک سفیر اور ہر گاڑی میں ایک پولیس اہلکار سوار گیارہ بجے کے قریب اس ویرانے سے تقریباً پانچ میل تک مسلح سپاہی کھڑے نظر آئے۔ بس کابل اور جلال آباد سڑک پر رواں دواں تھی۔ امریکی فوجی گشت کرتے ہوئے نظر آتے۔ دریائے کابل کے ساتھ ساتھ چلتی گاڑی ایک مسجد کے قریب رکی۔ دریائے کابل کے صاف و شفاف پانی کو سورج کی شعاعوں نے معتدل کیا ہوا تھا۔ تشنگی بجھانے کے لئے اسی پانی سے چند گھونٹ بھرے اور وضو کر کے نماز قصر پڑھی، کچھ ساتھی قریبی ہوٹل میں کھانا کھاتے رہے۔ ہم بالکل آزاد تھے۔ گاڑی میں بیٹھے پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کا خیال آتا تو افسردگی کی لہر دوڑتی اور دعا نکلتی یا اللہ ان کو بھی جلد رہائی نصیب کر۔ کابل کے خشک پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے ہوئے راستے اور سرنگوں کے علاوہ گہری کھائیاں نہایت اونچائی پر دریائے کابل کو بھی بہتی نظر آتیں۔ گاڑی کابل کو الوداع کہتے ہوئے صوبہ ننگرہار داخل

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوئی، میدانی علاقہ شروع ہوا اور دور پہاڑوں کے قریب امریکی اپاچی ہیلی کاپٹر بھی اڑتے دکھائے دے رہے تھے۔ عصر کی نماز پڑھنے کے بعد جلال آباد شہر سے گزرتے ہوئے گاڑی طورخم بارڈر کی طرف رواں تھی۔ مغرب کی نماز افغانستان میں آخری نماز ثابت ہوئی۔ اس کے آدھ گھنٹے بعد رات کے وقت آنکھوں کے سامنے طورخم بارڈر پر "خوش آمدید پاکستان" پڑھا تو تسلی ہوئی کہ ہم اب اپنے وطن پہنچ چکے ہیں لیکن یہ استقبالی فقرہ ہم پر صادر اس لئے نہ آیا کہ ہمیں خود معلوم تھا کہ ہماری اگلی منزل گھر کی بجائے پشاور سنٹرل جیل ہوگی۔ رات 12 بجے پشاور جیل پہنچ گئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ پاکستانی قوانین کے مطابق افغانستان سے آنے والے تین قسم کی فہرست کے زمرے میں قیدیوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اس درجہ بندی میں بلیک، گرین اور وائٹ کیٹیگری شامل ہے۔ بلیک گروپ والوں کو تو سخت ضمانتیں حاصل کرنے کے بعد رہا کیا جاتا ہے۔ گرین کو مکمل رہا کر دیا جائے گا اور وائٹ والے رہائی کے بعد انڈر آبزرویشن رہیں گے۔

○

نیا باب

پشاور جیل میں دو ہفتے گزارے۔ اس دوران پاکستانی تفتیشی ایجنسیوں نے ہمیں خون کے آنسو رلا دیا۔ گالی گلوچ، دھمکیاں ان کا معمول تھا۔ ان کے نزدیک ہم دہشت گرد تھے۔ کیونکہ اب پاکستان میں امریکی لغت متعارف ہو رہی تھی جہاں الفاظ کے معنی بدل گئے تھے۔ کل تک وہ مجاہدین جنہیں امریکن اپنے قریبی رشتہ داروں سے زیادہ اہمیت دیتے تھے آج دہشت گرد بنا دیئے گئے تھے۔

میرے گھر والوں کو طلب کیا گیا۔ علاقے کے معززین کی ضمانتیں لی گئیں اور مجھے اس شرط کے ساتھ رہا کیا گیا کہ خبردار متعلقہ تھانے کو مطلع کئے بغیر کہیں نہیں جانا۔ گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ تھانے میں تو ریکارڈ میری پشاور آمد سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔

گاؤں پہنچا تو میرا ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں پیش پیش کمانڈر خان بھائی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے مذہبی پس منظر اور خاندان کے بزرگوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مجھے شبر غان کی سختیاں اور وہ تمام ظلم و ستم جن کا میں شکار رہا تھا بھولنے لگے تھے اور ایک ہی غم لاحق تھا کہ طالبان کی اسلامی حکومت افغانستان میں نہیں رہی اور امریکہ نے ایک مرتبہ پھر ہمارا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب منتشر کر دیا ہے۔ میں نے مزار کے دشت میں اور بند کنٹینروں میں جو حال مجاہدین کا دیکھا تھا اس کے بعد سے میرے دل میں ایک آگ سی لگی تھی۔ جس بے رحمی اور درندگی سے شمالی اتحاد والوں نے طالبان کا قتل عام کیا تھا وہ میں زندگی میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ میرا دل چاہتا تھا، بم بن کر ان ظالموں پر پھٹوں اور ان کے پرخچے اڑ کر رکھ دوں۔

میرے چھوٹے بھائی نے جواب مقامی مسجد کے امام اور والد صاحب کے جانشین بھی تھے مجھے تسلی دی اور بتایا کہ اللہ کی راہ میں چلنے والوں پر آزمائش آیا ہی کرتی ہے کیونکہ آزمائش اللہ کی سنت ہے۔ انہوں نے فی الوقت مجھے اپنی جسمانی حالت سدھارنے کا مشورہ دیا اور مقامی حکیم

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

صاحب کو بھی بلا لیا جو والد صاحب کے ذاتی دوست اور ہمارے فیملی فرینڈ بھی تھے۔ انہوں نے میری نبض دیکھ کر کچھ دوائیں بھی تجویز کر دیں۔

یہ غالباً میری رہائی کا تیسرا دن تھا جب ظہر کی نماز میں کمانڈر خان بھائی سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے تمام تفصیلات پوچھیں اور اپنے دوستوں کا احوال دریافت کیا ان کی زبانی یہ جان کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ ہمارے دوست اچھے اور دیندار ساتھی بگرام اڈے پر امریکیوں کی قید میں ہیں جہاں سے امریکی اپنے قیدیوں کو عموماً گوانتاموبے بھیج دیا کرتے ہیں۔ یہ جان کر مجھے پریشانی لگ گئی لیکن کمانڈر خان بھائی نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے تو اپنی زندگیاں اللہ کے دین کے لئے وقف کر دی ہیں۔ اب ہماری جان پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا اور جتنی زیادہ مشکلات آئیں گی، اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ ان کی باتیں سن کر دل کو بڑا سکون اور حوصلہ ملتا اور اپنے ماضی پر فخر محسوس ہونے لگتا۔

جب میں اور کمانڈر خان مسجد میں ایک کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک اجنبی مولوی صاحب جو نماز کے بعد شاید کسی وظیفے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ دراصل نماز کے لئے کم اور میرے لئے زیادہ یہاں تشریف لائے ہیں۔ خان بھائی کی روانگی کے کچھ ہی منٹ بعد وہ بھی چلے گئے، میں مسجد میں ہی سو گیا یہاں مجھے قدرے سکون محسوس ہوتا تھا۔

اسی روز مغرب سے کچھ دیر پہلے ہمارے گھر کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانے کی آواز نے سب گھر والوں کو چونکا دیا۔ ہمارے گھر کا دروازہ اوّل تو کوئی کھٹکھٹاتا ہی نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو بھی مولوی صاحب کا گھر ہونے کی وجہ سے شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا جبکہ یہاں معاملہ کچھ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ میں قدرے حیرانگی اور غصے سے باہر نکلا تو عجب منظر دیکھا۔ مقامی تھانے کے دو سپاہی اور ایک حوالدار بھائی صاحب سے اونچی اونچی آواز میں بحث کر رہے تھے۔ بھائی صاحب شاید کسی کام سے گھر واپس آ رہے تھے۔ جب انہوں نے پولیس والوں کو اس طرح دروازہ بجانے پر پوچھا ہو گا۔ وہ پولیس والے تھے ان کے نزدیک مولوی صاحب یا میاں صاحب کیا حیثیت رکھتے ہیں جب تک کہ ان سے پولیس کی زبان میں بات نہ کی جائے۔

''کیا بات ہے''؟..... میں نے باہر نکل کر قدرے تلخی سے دریافت کیا۔ ''افضل خان تمہارا نام ہے''؟..... حوالدار نے بڑے اکھڑ لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں''.....

میں نے بھی غصے سے کہا۔

''تمہیں چوہدری صاحب نے بلایا ہے''..... جواب ملا۔

''کون سے چوہدری نے''؟..... میں نے پوچھا۔

''لو جی اینوں چوہدری صاحب داوی نئیں پتہ''؟ ایک سپاہی نے اپنی اوقات دکھائی۔

''اوئے چوہدری حیات بخش ایس ایچ او صاحب نے طلب فرمایا ہے''.....

دوسرے سپاہی نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''تمیز سے بات کرو۔ تم کسی بدمعاش چور اچکے کے گھر کے باہر نہیں کھڑے۔ امام مسجد کا گھر ہے..... اور ہاں اپنے چوہدری صاحب سے کہہ دینا میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں کہ اس کے حکم پر چلا آؤں گا۔ میرے ساتھ صرف قانون کی زبان میں بات ہو گی۔ اب چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ آئندہ اس گھر کے نزدیک بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کرنا''۔

خدا جانے میرے لہجے میں کہاں سے ایسی کرختگی آ گئی تھی۔ ایک مرتبہ تو پولیس والوں کے پاؤں تلے زمین ہی سرک گئی۔ وہ تو اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اس شہر میں کوئی پولیس سے ایسی زبان میں بات بھی کر سکتا ہے پھر بھی انہوں نے حوصلہ کیا اور اپنی ساکھ بچانے کے انداز میں حوالدار نے کہا۔

''پولیس والوں کو دھمکی دیتے ہو''؟

''تم لوگ جب یہاں آ رہے تھے تو میرا تعارف کروا کر چوہدری صاحب نے بھیجا ہو گا..... ہم دھمکیاں نہیں دیتے۔ جو کہتے ہیں وہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور یہ جو تم نے اپنے کندھوں پر بندوقیں لٹکا رکھی ہیں ناں..... یاد رکھنا میں انہیں تم سے زیادہ اچھی طرح چلانے کا تجربہ رکھتا ہوں..... چپ چاپ چلے جاؤ''.....

آخری فقرہ میں نے قریباً ڈانٹنے کے انداز میں کہا تھا۔

پولیس والے سمجھدار بھی تھے اور بزدل بھی..... ''ٹھیک ہے جی..... آپ کا پیغام چوہدری صاحب کو پہنچا دیتے ہیں''..... کہتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔

پولس والے تو چلے گئے لیکن بھائی صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے..... ''یہ تم نے کیا کیا؟..... تمہارا دماغ تو صحیح ہے ناں''..... وہ غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''بھائی صاحب آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ میں کوئی لچا لفنگا نہیں۔ مجاہد ہوں..... آپ نے اور والد صاحب نے ہمیں حق کے لئے جینا اور مرنا سکھایا ہے۔ اگر ان لوگوں کو نرمی دکھائی تو روز یہاں آ جایا کریں گے''..... میں نے تلخی سے کہا۔

''یار! تم سمجھتے کیوں نہیں..... یہ پولیس والے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کسی کو بھی.....''

''بھائی صاحب! میں جانتا ہوں ان کے لئے کچھ بھی کرنا ممکن ہے لیکن آپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ میں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں۔ آپ کی اجازت اور حکم سے جہاد پر گیا تھا۔ میں ان کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی مسئلہ پیش آیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ پریشان نہ ہوں''۔

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور غصے میں واپس لوٹ گیا۔ بھائی جان سکتے کی حالت میں مجھے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی جب میں ان کے مدرسے میں پہنچا۔ خان بھائی نے بانہیں پھیلا کر میرا استقبال کیا۔ ہم نے نماز ادا کی اور میں نے انہیں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا۔ خان بھائی مسکرائے اور کہنے لگے ''افضل بھائی یہ تو ہونا ہی تھا''.....

''کیا مطلب ہے آپ کا''..... میں نے پوچھا۔

''تم نہیں جانتے ہماری حکومت نے امریکیوں کی غلامی اختیار کر لی ہے۔ یہ مسلمانوں کی نہیں کافروں کی حکومت ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہمیں پہلے ان سے جنگ لڑنی پڑے گی''۔

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''خان بھائی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں''؟

میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''افضل تمہیں میری باتوں کی سمجھ ضرور آئے گی لیکن کچھ اور وقت گزرنے کے بعد۔ بہرحال! تم مطمئن رہو..... استقامت برقرار رکھنا۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف جہاد ہے..... جہاد بالسیف جہاد بالقلم.....'' انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا..... ''ہم تمہارے ساتھ ہیں کم از کم پولیس تمہارا اس علاقے میں کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس والے جانتے ہیں ہم سے ٹکر لینے کا انجام کیا ہو سکتا ہے''۔

یہ اور اس نوعیت کی اور باتیں کر کے خان بھائی نے مجھے مطمئن کر کے گھر روانہ کر دیا۔ میں گھر آیا اور معمول کے مطابق سو گیا۔

○

شاید رات کے تین بجے تھے کہ جب ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔ میں گھر کے صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر گھر کے دوسرے افراد سوئے ہوئے تھے۔ سفید پوش پولیس کمانڈوز ہمارے گھر کا دروازہ توڑ کر اور دیواریں پھلانگ کر گھر میں گھس آئے۔ خوف کے مارے میری بہن، والدہ، بھابھی اور بچے چیخ رہے تھے اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔

تین مسلح کمانڈوز میری طرف لپکے۔ خدا جانے مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی۔ میں نے ان پر چھلانگ لگائی اگلے ہی لمحے ایک کی گن میرے قبضے میں تھی۔ باقی کمانڈوز نے غصے میں میری طرف پستول اور رائفلیں تان لیں۔

''بزدلو! کسی کے گھر میں گھس کر بچوں اور عورتوں کو خوف زدہ کرنا ہی آتا ہے تمہیں..... اگر ہمت ہے تو اکیلے مجھ سے مقابلہ کرو.....'' میں نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوں۔ اچانک میری بیمار ماں آگے بڑھی اور اپنی چادر میرے قدموں میں پھینک کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا! کچھ نہ کرنا''۔ ماں کی اس اچانک اور حیران کن حرکت نے مجھے بوکھلا دیا..... میں نے گن پھینک کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ کمانڈوز نے فوراً ہی مجھے قابو کر لیا۔ میری آنکھوں پر کپڑا باندھا اور ہتھکڑیاں لگا کر مجھے ایک جیپ میں بٹھا کر لے گئے۔ مجھے گرفتار کرنے والوں کا تعلق شاید پولیس سے نہیں کسی خفیہ ایجنسی سے تھا کیونکہ انہوں نے راستے میں نہ تو میرے ساتھ کوئی زیادتی کی نہ ہی مجھے گالیاں دیں۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول کر ایک سیل میں بند کر دیا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی لیکن اس بات کا دکھ ضرور تھا کہ میں نے اگر کچھ بگاڑا تھا امریکہ کا..... یہ میرے پاکستانی بھائی کیوں میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے تھے؟

میرا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ میں نے جہاد میں حصہ لیا لیکن جس تنظیم کے ذریعے میں افغانستان گیا وہ پاکستانی تنظیم تھی جس کی تمام ایجنسی والوں سے بڑی اچھی دوستی تھی۔ یہی لوگ ہمارے پروردہ تھے اور ہمیں جہاد کے لئے ہر ممکن سہولت دیتے تھے۔ لیکن اب اچانک پانسہ کیوں

Uploaded By Muhammad Nadeem

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

Uploaded By Muhammad Nadeem

پلٹ گیا؟ خدانخواستہ میں نے پاکستان میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اگر افغانستان کی سرزمین پر کسی جرم کا ارتکاب کیا تو اس کی سزا بھی بھگت لی تھی..... پھر یہ سب کیا تھا؟

یہی کچھ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے کو آ رہا تھا۔ میں سیل کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جب مجھے اونگھ آ گئی۔ حالانکہ اس سیل میں پہلے سے ایک چٹائی اور کمبل موجود تھا لیکن میں نے لیٹنا مناسب نہ جانا۔

میری ''آنکھ اذان کی آواز سے کھلی..... اندھیرا اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیل کے سامنے برآمدے میں دو تین سفید پوش دکھائی دیئے۔ میرے بار بار متوجہ کرنے پر بالآخر ایک سفید پوش میرے سیل کے نزدیک آ گیا۔

''کیا بات ہے..... کیوں شور مچا رکھا ہے''؟ اس نے مجھ پر غصہ دکھایا۔

''میں نے وضو کرنا ہے۔ اگر تمہارا قانون اجازت دے تو نماز پڑھ لوں''؟ میرا جواب خاصا تلخ تھا۔

غصے سے گھورتے ہوئے وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہتھکڑی بردار کے ساتھ واپس آیا۔ مجھے ہتھکڑی لگا کر انہوں نے سیل سے نکالا..... وضو کروایا اور سیل میں بند کر دیا جہاں میں نے بڑے اطمینان سے چٹائی پر ہی نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ بہرحال میں اپنے ملک میں تھا۔ شبرغان یا پل چرخی میں نہیں۔

نماز سے فارغ ہو کر میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے تھے کہ جب ایک سفید پوش میرے لئے چائے اور بند لے آیا۔ خاصے مہذب لوگ لگتے تھے۔ میں نے بغیر کچھ کہے سنے سیل میں چائے کا مگ اور بند وصول کیا اور شکریہ کہہ کر چائے کا گھونٹ حلق میں انڈھیلا اور اطمینان سے ناشتہ کرنے لگا۔ سفید پوش کھڑا حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔

''مطمئن رہو بھائی صاحب، میں کوئی دہشت گرد نہیں، نہ ہی میری چائے یا بند سے کوئی ناراضگی ہے''..... میں نے طنزاً کہا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا''۔ اس نے کہا اور چلا گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اگر یہ ایسے ہی با اخلاق لوگ ہیں تو مجھے کس جرم میں یہاں لے آئے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں تلاوت میں مصروف تھا جب وہی سفید پوش دو اور ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ انہوں نے سیل کا لاک کھولا۔ مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور حیرت انگیز طور پر ہتھکڑی کے بغیر اپنے ساتھ

لے کر ایک کمرے کی طرف چل دیئے۔ کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک فوجی افسر اور میرے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے والا وہ ''ٹاؤٹ'' بیٹھا تھا جس کی شکل مجھے ابھی تک یاد تھی۔

''بیٹھو''..... میجر صاحب نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ان کی پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''افضل خان تمہارا نام ہے''..... انہوں نے اپنے سامنے دھری فائل پر نظر ڈال کر کہا۔

''جی ہاں..... اور میں تین روز پہلے ہی طویل عرصہ افغانستان میں قید کاٹنے کے بعد واپس آیا ہوں..... اگر آپ نے اس شخص کی کسی رپورٹ پر یہ کارروائی کی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس نے صرف کارروائی ڈالی ہے۔ میں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی.....'' میں نے دوسرے کونے میں موجود ٹاؤٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

ٹاؤٹ نے کچھ کہنے کے لئے بمشکل منہ کھولا تھا جب میجر صاحب نے اسے خاموش رہنے اور چند لمحے سوچنے کے بعد کمرے سے جانے کا اشارہ کیا تو مجھے گھورتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا۔

''افضل خان! مجھے تمہارے ماضی سے کچھ لینا دینا نہیں..... مجھے صرف اس بات کی گارنٹی چاہئے کہ تم اب ماضی کی کسی غلطی کو نہیں دھراؤ گے''..... انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''سر! آپ کو کس طرح کی گارنٹی چاہئے''؟ میں نے سوال کیا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو.....'' انہوں نے کہنا شروع کیا''..... دیکھو افضل تم ابھی نوجوان ہو اور کسی اچھے گھرانے کے دکھائی دیتے ہو..... میں تمہارے سامنے کوئی وعظ نہیں کروں گا لیکن تمہیں نصیحت ضرور کروں گا کہ اپنے پرانے ساتھیوں سے رابطے ختم کر دو..... یہی تمہارے لئے بہتر ہے..... ابھی تمہیں بہت لمبی زندگی بسر کرنی ہے۔''

میں نے بحث کرنا مناسب نہ جانا اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے انہیں یقین دلا دیا کہ ابھی میرا دماغ بالکل درست ہے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ بقیہ زندگی تفتیشی مراکز یا جیلوں حوالاتوں میں گزار دوں۔ میجر صاحب نے ایک کاغذ پر مجھ سے کچھ لکھوایا۔ مجھے دوبارہ اچھا ناشتہ کروایا اور ایک جیپ میں تھانے کی طرف روانہ کر دیا۔ تھانے میں میری بھائی صاحب اور گاؤں کے دس بارہ بندے رات سے پہنچے ہوئے تھے۔ بیچارے بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ والد صاحب اور پھر بھائی صاحب کی وجہ سے ہمارے نائب ناظم اور کونسلر بھی آ گئے۔ پولیس والوں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نے معمول کی کارروائی ڈالی اور تھانیدار نے بھی "مجھے دماغ ٹھنڈا رکھنے" کی تلقین کرتے ہوئے ایک سفید کاغذ پر بیان حلفی اور انگوٹھے لگوانے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ یہ ضرور یاد دلایا کہ میں شہر سے باہر جانے پر تھانے والوں کو ضرور مطلع کروں گا۔

بھائی صاحب نے گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہم دونوں گھر آ گئے۔ والدہ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ ان سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ اپنی کسی حرکت سے ان کے لئے پریشانی پیدا نہیں کروں گا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اب بھی میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پولیس والوں نے اپنے ٹاؤٹ کی غلط مخبری پر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور میری طرف سے غصہ دکھانے پر بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایجنسی والوں کو غلط رپورٹ دے کر یہ سارا کھڑاگ کیا تھا۔

میں نے دوبارہ اپنا پی سی او سنبھال لیا اور اپنے کام میں مصروف ہو رہا۔ والدہ کی خواہش تھی کہ میں شادی کر لوں...... خالہ کی بیٹی سے رشتہ وہ بچپن میں طے کر چکی تھیں لیکن میں نے فی الوقت ان کی خواہش کا احترام کرنے سے معذرت کی اور درخواست کی کہ پہلے میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ جس پر انہوں نے ناراضگی کے بعد بہرحال صاد کر دیا۔

کل کے مجاہد آج کے دہشت گرد کیسے بن گئے؟ کیا یہ صرف ستم ظریفی حالات کی وجہ سے ہوا تھا؟ بظاہر تو اس سوال کا جواب ہاں میں ہے لیکن میں آج ایمانداری سے آپ کو بتا رہا ہوں کہ اس میں ہمارے بعض سرکاری اداروں کا کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تین ماہ تک مجھے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ میرا معمول تھا کہ اپنے کام سے مسجد اور گھر۔ کبھی کبھی سر راہ خان بھائی سے ملاقات ہو جاتی لیکن میں جان بوجھ کر اس کو طوالت نہ دیتا کیونکہ ہمارے علاقے میں مخبروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ مجھے تو کوئی خوف نہیں تھا لیکن جب والدہ اور بھائی بہن کا خیال آتا تو خود کو کمزور محسوس کرنے لگتا۔

تین ماہ میں میجر صاحب میرے پاس دو مرتبہ خود ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ہم نے بڑے دوستانہ ماحول میں باتیں کیں اور ایک روز وہ الوداعی ملاقات کے لئے آئے۔ وہ اس بات پر بڑے خوش تھے کہ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے روانگی پر بطور تحفہ مجھے اپنی یونٹ کا سویٹر بھی دیا جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔

○

اس ملاقات کے بمشکل پانچ روز بعد ہی ایک اور ایجنسی کے اہلکار میری دکان پر آئے اور ڈنڈا ڈولی کر کے لے گئے۔ دس روز تک انہوں نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا اور ہر وہ ذہنی عذاب دیا جو ان کے اختیار میں تھا۔ میرا گناہ ظاہر ہے میرا ماضی تھا اور اتفاق سے ہمارے ضلع کی ایک امام بارگاہ میں دھماکہ ہوا جس میں کچھ لوگ جاں بحق ہوئے، کچھ زخمی ہوئے۔ پولیس نے مجھے "سابقہ دہشت گرد" ہونے کے ناطے گرفتار کر کے میری بھی گرفتار دہشت گردوں کی طرح تفتیش شروع کر دیا۔

اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔ جیسے ہی کوئی تخریب کاری ہوتی۔ مجھے گرفتار کر کے لے جاتے۔ آخری حادثہ جس نے واقعی مجھے باغی کر دیا وہ تھا جب میری اور ہمارے نزدیکی دیہات کے دو اور ساتھیوں کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ایک پولیس آفیسر نے بڑی سی میز پر تھانے میں موجود پرانا اسلحہ جمع کر کے پریس کانفرنس کی اور پریس والوں کو بتایا کہ یہ اسلحہ ملزموں سے برآمد ہوا ہے۔ میں نے چیخ کر کچھ کہنا چاہا تو ہٹے کٹے پولیس والے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے حوالات میں لے آئے جہاں انہوں نے وحشیانہ انداز میں مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

چھ ماہ تک میں ریمانڈوں کا عذاب بھگتتا رہا۔ میرے گھر اور گاؤں والے جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ میں بے گناہ ہوں۔ سرکار دربار میں جا کر فریاد کرتے رہے۔ بالآخر ہمارے ایم پی اے کی ذاتی ضمانت پر مجھے جیل سے ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی۔ اس حادثے نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ دو تین روز میں بستر پر رہا۔ پولیس کی مار پیٹ نے شبرغان جیل کی یاد تازہ کر دی لیکن مجھے ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ملا تھا کہ آخر مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟

اس روز میں گھر میں بستر پر لیٹا تھا...... ہمارا گھر گاؤں کے دوسرے گھروں سے تھوڑے فاصلے پر ایک حویلی کی طرح بنا ہوا تھا جو میرے دادا کو شاید گاؤں والوں نے مسجد کے امام کی حیثیت سے دے رکھا تھا۔ اس میں کچھ اضافہ والد صاحب نے ساتھ دو کنال زمین خرید کر کر لیا تھا۔ ان دنوں دیہاتوں میں زمین چند ہزار کنال مل جایا کرتی تھی۔ ہم نے گھر کے ایک کونے میں بیٹھک بنا رکھی تھی جس کے باہر صحن میں ایک درخت کے نیچے میں چارپائی بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی حالات کچھ سدھریں گے میں کراچی منتقل ہو جاؤں گا اس طرح مقامی پولیس اور ایجنسی والوں سے میری جان چھوٹ جائے گی جو ملک کے کسی بھی کونے میں ہونے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

والے دھماکے کا ذمہ دار مجھے سمجھنے لگے تھے اور اپنی صفائی میں کہی گئی کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شبرغان جیل سے واپسی سے اب تک میں نے ناں تو کسی ماضی کے ساتھی سے ملاقات کی تھی نہ ہی کوئی مجھے ملنے آیا تھا۔ کبھی کبھی البتہ موبائل فون پر دعا سلام ہو جاتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر ہم نے اکٹھے جہاد کیا تھا اور دشمن کی قید ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹ کر کاٹی تھی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کے کام آنا چاہتے تھے لیکن خوف زدہ تھے۔ ہمارے اس خوف کی وجہ پولیس یا ایجنسیاں نہیں بلکہ اپنے پیارے تھے۔ ہم جانتے تھے انہوں نے ہمارے انتظار کی گھڑیاں کس کرب کے عالم میں گزاری ہیں اور اب ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی پریشانی ہو..... حالانکہ ایسا ہمارے نہ چاہنے کے باوجود ہو رہا تھا.....!!

مجھے اس بات کا البتہ علم تھا کہ میرے باقی ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو رہا ہے جب کہ وہ سب ہی میری طرح بالکل بے گناہ تھے۔ اگر کوئی بھی مقامی سرگرمیوں میں ملوث ہوتا تو شاید ہمیں اس بات کا افسوس بھی نہ ہوتا۔

ان خیالات میں گم تھا جب بیٹھک کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ''آ جائیں''..... میں نے اونچی آواز سے کہا۔

دروازہ کھلا تھا لیکن آنے والوں نے اخلاقاً پہلے مطلع کرنا ضروری جانا تھا۔ میں چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحبان اندر تشریف لائے اور ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا۔ ان میں سے ایک میرے تربیت کے زمانے کے استاد صاحب اور دوسرے جہادی ساتھی تھے لیکن دونوں جس روپ میں یہاں آئے تھے اس پر کسی کے شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔

میں احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے باری باری مجھے گلے لگایا۔ میری خیریت دریافت کی اور اپنے ساتھ لائے کچھ پھل میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ انہیں گھر میں پہنچا دوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے لئے کھانا وغیرہ تیار کرنے کے لئے گھر والوں کو کہہ دیا۔

''ہمیں تمہارے حالات کی خبر ملتی رہتی ہے''..... استاد جی نے کہا

''چلنے والوں کا تعلق زندگی سے شہادت تک بھی ختم نہیں ہوتا..... ہم نے تمہیں بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کچھ عرصہ تم اپنے گاؤں میں رہ کر حالات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرو''۔

انہوں نے کہنا شروع کیا اور راہ جہاد میں پیش آنے والے مصاحب اور مشکلات کو اللہ کی آزمائش قرار دے کر اس پر استقامت اختیار کرنے کی تلقین کی۔

''استاد جی مجھے کبھی اس بات کا دکھ نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ افغانستان میں کیا سلوک ہوا۔ ہم امریکیوں کے خلاف جو اسلامی حکومت کو ختم کرنے آئے تھے، لڑنے گئے تھے جب تک اللہ کی نصرت شامل حال رہی ہم ان سے جہاد کرتے رہے۔ ہم نے شمالی اتحاد سے کبھی کوئی جنگ نہیں ہاری..... جب آزمائش آئی..... گرفتار ہوئے تو سب کچھ اس لئے برداشت کیا کہ یہ اللہ کی سنت ہے لیکن یہاں اپنے ملک میں اپنے ملک کے لوگ جو سلوک کر رہے ہیں..... یہ کیا ہے؟ اس کا کیا جواز ہے۔ اس پر ضرور دکھ اور پریشانی ہے''۔

میں نے بالآخر ان سے دل کی بات کہہ ہی دی۔

اس پر استاد جی نے کہا ''یہ سب جہاد سے دوری کا نتیجہ ہے۔ جب ہم جہاد سے پیٹھ پھیر لیں تو اللہ کے غضب کو للکارتے ہیں..... افضل خان! ایک طرف دنیا کی ذلت ہے، جو دونوں صورتوں میں اٹھانی ہی پڑے گی۔ اگر جہاد کرو گے تو دشمن تم پر عرصہ حیات تنگ کر دے گا۔ اگر نہیں کرو گے تو اپنے تمہیں جینے نہیں دیں گے..... اب فرار کا راستہ کوئی باقی نہیں بچا''.....

استاد جی نے بالآخر وہ بات کہہ دی جس کو مجھ تک پہنچانے کے لئے انہوں نے یہ سفر کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ قابض امریکی فوجوں کے خلاف جہاد جاری ہے۔ مجاہدین از سر نو صف بندی کر رہے ہیں۔ اپنی منتشر قوت کو جمع کر رہے ہیں اور گزشتہ کچھ دنوں میں اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ہمیں بے حد مثبت نتائج بھی حاصل ہوئے ہیں۔ مجاہدین نے دولت قندھار پر عملاً کنٹرول حاصل کر لیا۔ غزنی اور پسغمان پر دشمن ذلت اٹھا رہا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی باتوں نے میرے تن من میں آگ لگا دی۔ میں نے سوچا کہ یہاں چارپائی پر لیٹ کر ذلت کی زندگی جینے سے میدان جہاد میں جا کر کسی امریکی یا شمالی اتحاد کے فوجی کے ہاتھوں مر جانا زیادہ بہتر ہے۔ معلوم نہیں کب کس شہر میں دھماکہ ہو گا، کس امام بارگاہ یا مسجد پر حملہ ہو گا اور پولیس مجھے پکڑنے آ جائے گی۔

میں نے اپنے دلی جذبات ان تک پہنچا دیئے اور کہا کہ ذلت کی ایسی زندگی جو میں جی رہا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوں اس سے باعزت موت بہر حال بہتر ہے۔'' اللہ تمہارے ارادے میں برکت اور استقامت عطا فرمائے'' دونوں نے بیک زبان کہا۔

میں نے ان کی خدمت میں اپنی دانست میں بہر حال کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ رات انہوں نے ہمارے ہاں ہی میرے بضد ہونے پر قیام کیا۔ بھائی صاحب کو ان سے مل کر ظاہر ہے خوشی ہوئی تھی کیونکہ دونوں بہت دیندار اور نیک انسان تھے۔ میں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بھائی صاحب کو حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا اور تلقین کی تھی کہ اگر کوئی ان مہمانوں کے متعلق دریافت کرے تو انہیں والد صاحب کے دوست بتائیں۔ یہاں تو کسی کو ان باتوں کی فکر نہیں تھی لیکن مقامی ٹاؤٹ جو ایجنسیوں نے یقیناً میرے پیچھے لگا رکھے ہوں گے انہوں نے بھی اپنا ''وظیفہ'' کسی طرح حلال کرنا ہی تھا۔ حیرت انگیز طور پر بھائی جان نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور مجھے اپنی پوری مدد کا یقین دلایا۔ وہ ابھی تک استقامت برقرار رکھے ہوئے تھے اور مجھے راہ حق پر جانتے تھے۔

اگلے روز ناشتہ کرنے کے بعد وہ رخصت ہو گئے لیکن روانگی سے پہلے انہوں نے میرے ''ناں ناں'' کہنے کے باوجود ایک خطیر رقم مجھے دی اور اپنا مکمل علاج کروانے کی تلقین بھی کی۔ انہوں نے مجھے موبائل فون کی ایک ''سم'' دیتے ہوئے تلقین کی کہ اسے صرف ان سے رابطے کے لئے استعمال کروں انہوں نے مجھے دو نمبر دیئے اور اگلی حکمت عملی بھی سمجھا دی۔

میری سادگی کا اندازہ فرمائیں۔ آج سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ ان سے الگ ہوتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں انہیں بس سٹینڈ تک چھوڑنے پر بضد تھا لیکن وہ کسی بھی طرح اس کے لئے تیار نہ تھے۔ بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ بھائی صاحب ان کے ساتھ چلے گئے اور میں آنکھوں میں آنسو لئے انہیں رخصت کرنے لگا۔

○

ان کے رخصتی سے اپنی روانگی تک کا ایک ایک لمحہ میں نے کروٹیں بدل بدل کر گزارا۔ تین روز بعد میری بہن کی شادی تھی میں نے اپنی بہن کو گلے لگا کر روتے ہوئے رخصت کیا۔ ہم نے باراتیوں کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی کیونکہ اب میرے پاس کچھ پیسے آ گئے تھے۔ سارا گاؤں ہمارے ساتھ تھا۔ وہ لوگ میرے ساتھ ہونے والی زیادتی پر سراپا احتجاج رہتے تھے۔ پولیس کو انہوں نے اس مسئلے سے خاصا الگ رکھا ہوا تھا لیکن ایجنسیوں کے سامنے وہ بہر حال بے بس تھے۔ اب ہم پر کوئی خاص ذمہ داری بھی نہیں تھی اور میری صحت بھی مکمل بحال ہو چکی تھی۔ میں

نے اپنی معمول کی کسرت بھی شروع کر دی تھی۔ اس دوران یہ اندوہناک خبر ملی کہ کمانڈر رحمان بھائی کو پولیس نے ایک امام بارگاہ پر حملے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے اور اب ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی جس پر انہیں گولی مار دی گئی لیکن ان کی لاش بھی لواحقین کو نہیں ملی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ زندہ ہیں لیکن ایجنسیوں نے انہیں کہیں غائب کر رکھا ہے۔ اس بات کا مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کسی مذہبی فرقہ واریت میں بھی ملوث ہوں گے کیونکہ میرے تو کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ یوں ہی جہاد جیسے عظیم مقصد کے سامنے ایسے کام بڑے ہیچ نظر آتے تھے۔ بہر حال زندگی میں پھر طویل عرصے تک کمانڈر علی بھائی سے ملاقات نہ ہو سکی۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب میں نے اپنی زندگی کا بدترین فیصلہ کیا اور بھائی صاحب کو اعتماد میں لے کر ان سے اذن رخصت مانگا۔ وہ پہلے تو کچھ ہچکچائے پھر میرے سمجھانے اور حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد بہر حال اس فیصلے پر پہنچ گئے کہ ان حالات میں ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی کیا ہے۔ بصورت دیگر بھی تو میرا حشر کمانڈر رحمان بھائی جیسا بھی ہو سکتا تھا۔ دم رخصت میں نے وہ تمام رقم جو مجھے استاد جی دے کر گئے تھے ان کے حوالے کر دی۔ بھائی صاحب نے مجھے جذباتی انداز میں گلے لگایا۔ میری سلامتی کی دعا کی اور زبردستی کچھ زاد راہ میرے پلے باندھ دیا۔

مجھے یہ تو علم نہیں کہ میں نے یہ فیصلہ پولیس کے ہاتھوں روز بروز ذلیل ہونے سے بچنے کے لئے کیا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں شبرغان جیل کا انتقام سر اٹھا رہا تھا یا پھر مجھے جذبہ جہاد میدان کارزار کی طرف لے جا رہا تھا۔ بہر حال میں جب اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو انہوں نے باری باری گرم جوشی سے گلے لگا کر میرا استقبال کیا۔ استاد جی نے میری استقامت کے لئے دعا مانگی اور میری تربیت کے اگلے مرحلے پر عمل ہونے لگا۔ مجھے بتایا گیا کہ اب ہمارا مقابلہ امریکی فوج سے ہے جس سے نمٹنے کے لئے سخت اور تکلیف دہ تربیتی مراحل سے گزرنا ہوگا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

اس مرتبہ مجھے بم بنانے، دھماکہ کرنے، نقب لگانے اور خصوصاً اغواء کرنے کے خصوصی کورس کروائے گئے۔ مجھے کبھی کبھی اس بات پر حیرانگی ہوتی تھی کہ ہمارے درمیان صرف پاکستانی اور افغانی ہی نہیں، تاجک، ازبک، چیچن، اور دیگر مسلم ممالک کے مجاہدین بھی موجود ہوتے تھے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پہلے ان لوگوں کی تعداد کم تھی شاید طالبان دور حکومت میں انہیں ہم سے الگ رکھا جاتا تھا۔ اب صورت مختلف تھی۔ اس مرتبہ ہمیں تربیت دینے والے زیادہ غیر ملکی ساتھی تھے۔ اس سے پہلے جب میری ٹریننگ ہوئی تو مجھے حملہ کرنے، مقابلہ کرنے، ہتھیار چلانے، گھیرے میں آنے پر گھیرا توڑنے وغیرہ وغیرہ جیسے جنگی اصول سکھائے گئے لیکن اب میری تمام تر تربیت تخریبی کارروائیوں کے لئے ہو رہی تھی جو بڑے اچنبھے کی بات تھی.....!

کبھی کبھی تو میں اس پر الجھ کر رہ جاتا کہ میں یہاں مجاہد بننے آیا ہوں یا تخریب کار۔ میرے ساتھی میری نفسیاتی کیفیت کو سمجھتے تھے انہوں نے بتایا کہ وہ بھی پہلے الجھن کا شکار ہوئے تھے لیکن استاد جی نے بتایا کہ اس مرتبہ ہمارا واسطہ بڑے خطرناک اور گھٹیا دشمن سے ہے۔ ہمیں سی آئی اے اور ایف بی آئی کے ہتھکنڈوں کو اس طرح ناکام بنانا ہے اور اب جنگ کا انداز بدل گیا ہے۔ میں بظاہر تو مطمئن ہو جاتا لیکن ایک خلش سی دل کو لگی رہتی تھی.....!!

○

نیا باب

میں نے آپ کو بتایا کہ میں مقامات اور شخصیات کے نام صحیح نہیں بتاؤں گا۔ اس کی وجہ میرا خوف نہیں اب میں زندگی موت سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ میں نے موت کو اتنی مرتبہ اپنے قریب سے دیکھا ہے کہ کبھی کبھی اس بات سے خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ جب موت کا فرشتہ میری جان لینے آئے گا تو میں کہیں مذاق جان کر ہنسنے نہ لگوں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف رازداری ہے جس کا مجھ سے ہر نئے کام کے آغاز پر حلف لیا جاتا تھا۔ البتہ شوق شہادت اور جذبہ جہاد کا غلط استعمال کرنے والی ان شیطانی سازشوں کو ضرور بے نقاب کروں گا جنہوں نے نکل کر مجاہدین کو آج کے دہشت گرد بنا دیا ہے۔

افغانستان کے ایک دور دراز علاقے میں ہماری تشکیل ہوئی اور آج میں پہلے مشن پر جا رہا تھا۔ ہم لوگ ایک پہاڑی راستے کے بیچوں بیچ گزرتی سڑک پر گھات لگائے بیٹھے تھے جہاں سے افغانستان سرکاری فوج کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، میں جانتا تھا کہ افغانستان کی نام نہاد فوج میں زیادہ تعداد شمالی اتحادیوں کی ہے یا پھر ان غنڈوں اور بدمعاشوں کی جو روس کی افغانستان سے پسپائی کے بعد "وار لارڈز" بن کر بھتہ وصول کیا کرتے تھے اور طالبان نے ان کا قلعہ قمع کر کے افغانستان میں اسلامی حکومت قائم کی تھی۔ طالبان کی پسپائی کے بعد وہ کٹھ پتلی افغان حکومت کی گود میں بیٹھ گئے جہاں انہیں بہترین کور cover میسر تھی اور اس کی آڑ میں وہ اپنے پرانے دھندے میں مصروف تھے۔ شمالی اتحاد کے وحشی درندوں نے جس طرح دشت میں طالبان کو شہید کر کے ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی تھی اور مزار شریف کے کنٹینروں میں جس طرح انہیں مارا تھا وہ مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اور میں اپنی گن مضبوطی سے تھامے اپنے شکار کا منتظر تھا۔

ہمارے ساتھی کی اطلاع کے مطابق عین اس وقت گاڑی کے اس طرف آنے کی اطلاع ملی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

جس کا ہم نے پہلے سے تعین کر رکھا تھا جو بڑی خوش آئند بات تھی۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ چھاپہ مار جنگ میں بطور خاص ٹائمنگ timing کی خصوصی اہمیت ہے اگر حالات واقعات آپ کی پہلے سے طے شدہ ٹائمنگ کے مطابق وقوع پذیر ہوں تو آپ کا آپریشن کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

ہم لوگ واکی ٹاکی پر اطلاع ملتے ہی مستعد ہو گئے۔ ساتھی پہاڑی کے نیچے ایک مقررہ جگہ موجود تھے۔ جہاں انہوں نے اس گاڑی کو روکنا تھا۔ ہم ممکنہ مداخلت کی صورت میں حملے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

چند منٹ بعد ہی مجھے دوربین کے ذریعے ایک بس آتی دکھائی دی۔ میں چونکا کہ یہ تو عام سواریوں والی چھوٹی بس تھی۔ اس میں شمالی اتحاد کے فوجی کہاں سے ہو سکتے ہیں۔ اپنے ساتھی تک میں نے تشویش منتقل کی تو اس نے بتایا کہ افغان استخبارات (جاسوسی) کے لوگ عموماً ایسی ہی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ میں مطمئن ہو گیا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہم نے اس بس کو مخصوص مقام پر ٹرک پر پتھر رکھ کر روک لیا اور بس رکتے ہی میں اور میرے چار اور ساتھی ان کے سروں پر سوار ہو گئے ہم نے سواریوں کو باہر نکال کر ایک طرف سر ہاتھوں کو سر پر رکھ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ خوف اور گھبراہٹ سے ان کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ ان کے شاید وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس طرح اچانک طالبان کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔

ہمارا ایک مقامی ساتھی ان کا سارا سامان جو اب ہمارے لئے ''مال غنیمت'' تھا بس سمیت لے کر پہاڑی سلسلے میں اس خفیہ راستے کی طرف نکل گیا جو ہماری محفوظ پناہ گاہ تک جاتا تھا اور ہم ان کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے پاس جتنے بھی پیسے یا کوئی اور شے تھی وہ سب ہمارے قبضے میں آ گئی۔

بس کے بائیس مسافر ہمیں کلمے پڑھ کر قسمیں کھا کر بتا رہے تھے کہ وہ غریب لوگ ہیں اور مزدوری کرنے ایران جا رہے ہیں لیکن ہمارا مقامی کمانڈر بضد تھا کہ وہ پولیس کے ریکروٹ ہیں اور انہیں طالبان کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ان کے مسلسل واویلے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اپنے کمانڈر کے حکم پر انہیں پہاڑ کے دوسری طرف اپنے ٹھکانے پر لے گئے جہاں ہم نے انہیں تین کمروں میں بند کر دیا۔ یہ کچے کمرے تھے جن میں سانس لینے کے لئے صرف ایک چھوٹی سلاخوں والی کھڑکی لگائی گئی تھی جبکہ دروازوں کو تالے لگا کر بند کر دیا گیا۔

کمانڈر صاحب نے ہمیں حکم دیا کہ انہیں یہاں قید رکھیں اور خود بڑے کمانڈر صاحب سے

ان کے متعلق احکامات لینے اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا۔ میں ایک کمرے کی کھڑکی کے نزدیک کھڑا تھا جہاں بس کا ایک نوجوان مسافر مسلسل رو رہا تھا۔ وہ بار بار پشتو اور فارسی میں کہہ رہا تھا کہ اس کی چھ بہنیں اور بیوہ ماں ہے وہ مر گیا تو سارا خاندان بھوک سے مر جائے گا۔ بار بار قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اس نے ساری زندگی کسی کے خلاف لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔

مجھے اس پر رحم آ رہا تھا..... میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ سب لوگ بے قصور ہیں اور غلط اطلاع پر مارے جائیں گے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے لئے بہر صورت اطاعت امیر لازم تھی۔ میرے افغانی اور دوسرے ساتھی تو انہیں فوراً مار دینے پر تیار تھے کیونکہ ان سب کا تعلق شمالی افغانستان سے لگتا تھا اور ہمارے زخم ابھی تازہ تھے لیکن نہ جانے کیوں میں اس کے لئے تیار نہیں تھا..... !!

میں کھڑکی کے نزدیک گیا اسے ڈانٹ کر خاموش کروایا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے پھر اپنی کہانی دہرانی شروع کر دی۔ میرے لئے اب خاموشی ممکن نہیں تھی۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی ساتھی فاصلے پر تھے اور اسے کہا کہ خاموش رہے میں اسے یہاں سے فرار کروا دوں گا..... اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ اندھیرا ڈھلتے ہی تم لوگ کھڑکی کے راستے فرار ہو جانا۔ میں نے فرار کے لئے راستے کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔ انہیں بتا دیا تھا کہ جب میں یہاں سے نماز کے لئے جاؤں گا وہ اس وقت فرار ہوں اور یہ بھی کہ اگر وہ زندہ طالبان کے ہاتھ لگ گئے تو مارے جائیں گے۔ ان کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ انہوں نے حلف دیا کہ زندہ طالبان کے ہاتھ لگیں گے ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میرا نام کبھی ان کی زبان پر نہیں آئے گا۔

گرفتار، کمزور، مجبور اور مقہور بندے کی قسمیں اور حلف کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ میں جانتا تھا بڑا خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا ہوں۔ میری زندگی اب ان کی زندگی سے وابستہ ہے کیونکہ طالبان اپنے غداروں کو موت سے پہلے جس انجام سے دوچار کرتے تھے اس کا تصور ہی بڑا جان لیوا تھا۔

انسانی سائیکی میں کئی کمزور اور طاقتور لمحات آتے ہیں۔ کبھی کبھی بڑے بزدل بہت دلیرانہ فیصلہ کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی بڑے بڑے بہادر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ میں نے اس کمرے میں موجود چار افغانیوں کو بچانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس وقت تو مجھے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن بعد میں زندگی نے جیسے کڑے امتحانات سے مجھے گزارا، ان کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ شاید یہ نیکی میرے کام آ گئی کہ آج آپ کو اپنی کہانی سنانے کے لئے زندہ موجود ہوں۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

○

سچی بات تو یہ ہے کہ فیصلہ کرنے اور قیدیوں تک پہنچانے کے بعد میں کچھ گھبرایا بھی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور واپسی کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے وقت مقررہ پر اپنے ساتھی سے کہا کہ میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ ہم ان حالات میں باری باری نماز پڑھا کرتے تھے۔ میرے دونوں ساتھیوں نے سر ہلا کر مجھے جانے کا اشارہ کر دیا اور خود باتوں میں مشغول ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ دوسری طرف واقع اس کمرے تک نہیں جائیں گے جو ان دونوں کی پشت پر بنایا گیا تھا۔

سب کچھ میری توقعات کے مطابق ہوا۔ میں نے نماز پڑھی۔ اللہ سے دعا کی اپنی دانست میں میرا یہ عمل اخلاص پر مبنی ہے وہ میری حفاظت فرمائے اور کھانا کھانے لگا۔ اس دوران مجھے تقریباً چالیس منٹ ہو گئے تھے جس کے بعد میں اپنے ساتھیوں تک گیا اور ان سے گپ شپ کرنے لگا پندرہ بیس منٹ میں نے یہاں لگا دیئے اور اپنے منصوبے کے مطابق ایک ساتھی سے باتیں کرتا اپنے کمرے کے قیدیوں کی طرف آیا۔ جہاں ہم دونوں کے لئے یہ حیرت اور صدمہ موجود تھا کہ مٹی کی بچی دیوار میں نصب کھڑکی توڑ کر اس کمرے کے چاروں قیدی فرار ہو چکے ہیں۔

"یہ کیا ہوا؟"...... میں نے بظاہر پریشانی ظاہر کی۔

"بہت غلط ہوا...... ان لوگوں میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی"...... میرا ساتھی بولا۔

"خلیل بھائی موت کا خوف بلی کو شیر کے مقابلے پر لے آتا ہے۔ انہوں نے ہماری کمزوری کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اوہ میرے خدایا! کمانڈر صاحب کو کیا جواب دیں گے۔ چلو ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے"۔ میں نے کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے افضل خان...... ہم کمانڈر صاحب کے حکم کے بغیر یہاں سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے......" اس نے بتایا۔

اس وقت ہم چار ساتھی یہاں موجود تھے۔ باقی کچھ فاصلے پر ایک پناہ گاہ میں موجود تھے۔ جہاں تک صبح سے پہلے رسائی ممکن نہیں تھی۔ صبح ہونے تک ہم پریشان ہوتے رہے۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد کمانڈر صاحب اور چار ساتھی موٹر سائیکلوں پر وہاں آ گئے۔ ہم نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو کمانڈر صاحب خاموش رہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم لوگوں نے ان کا تعاقب نہ کرنے کا ٹھیک فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس علاقے میں "ایساف" کی فوجوں کی موجودگی کی اطلاع ملی ہے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

انہوں نے بتایا کہ "مرکز" نے فیصلہ کیا ہے کہ ان تمام اسیروں کو مار دیا جائے۔ یہ ہمارے دشمن اور امریکہ کے وفادار ہیں۔ میں فیصلہ سن کر سکتے میں آ گیا لیکن اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے رکھے۔ کمانڈر صاحب نے کہا کہ یہ کام جلدی کر کے یہاں سے نکلنا ہے کیونکہ اب ٹھکانہ محفوظ نہیں رہا۔ اگر مفروروں نے کسی بھی امریکن یا یورپی ملک کی فوج تک رسائی حاصل کر لی تو وہ فوراً حملہ کر دیں گے جہاں تک افغانی پولیس کی بات ہے تو وہ طالبان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکے گی۔ ان بے گناہوں کو کس بے رحمی سے مارا گیا۔ مجھ میں بیان کرنے کا یارا نہیں ہے۔ کمانڈر صاحب کے حکم پر ہم نے اس ٹھکانے پر موجود اپنا سامان سمیٹا اور وہاں بوبی ٹریپ اس طرح نصب کر دیئے کہ آنے والوں کو اس کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا اس کے ساتھ ہی ہم وہاں سے نکل گئے۔ پہاڑوں اور تنگ دروں کے اندر اندر میلوں چلتے ہوئے ہم مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ راستے میں کمانڈر صاحب نے صرف دو مرتبہ اپنے سیٹ پر رابطہ قائم کیا تھا۔ ہمیں اس سلسلے میں خصوصی احتیاط کا حکم ملا تھا اور انتہائی ناگزیر حالات میں بھی صرف کمانڈروں کو مرکز یا مقامی مرکز سے رابطے کی اجازت تھی۔ اس کی وجہ وہ امریکن سیٹلائٹ تھے جو ہماری ہر حرکت اور گفتگو کو ریکارڈ کر لیتے جس کے کچھ ہی دیر بعد وہاں "ڈرون" حملہ آور ہو جاتے۔ ان حملوں میں طالبان کی شہادت تو شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ البتہ بے گناہ افغان دیہاتی ضرور مارے جاتے جنہیں بعد میں امریکن اور افغانی حکام دہشت گرد اور القاعدہ ڈیکلیئر کر کے خود کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔ ابھی پاکستان میں ڈرون حملوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اب تو یہ وبا پاکستان کے بندوبستی علاقوں تک پھیل گئی ہے کہ گزشتہ دنوں سنا تھا کہ بنوں میں حملہ ہوا ہے۔ خدا جانے ہمارے حکمرانوں کی بے بسی یا بے حمیتی کی وجہ سے سلسلہ آخر کہاں رکے گا۔

کھانے کے بعد ہم نے مغرب کی نماز ادا کی جس کے بعد مقامی شوریٰ میں قیدیوں کے فرار کی تحقیق شروع ہوئی۔ میرے دماغ پر ابھی تک ہماری گولیوں سے مرنے والے بے گناہوں کے آخری لمحات ثبت تھے اور ضمیر ملامت کر رہا تھا لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے سوا یہاں اور کچھ ممکن نہیں تھا۔ اگر انہیں ذرا سا شک بھی ہو جاتا تو مجھے ذبح کر کے پھینک دیتے۔ نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آ کر زندگی کی بھیانک ترین غلطی کی ہے۔ یہ جہاد نہیں۔ یہ تو فساد ہے یا پھر انتقام کی جنگ جس کا ایندھن میں بھی جلد یا بدیر بن جاؤں گا۔

ہمارے بیانات دوبارہ علیحدہ لئے گئے میں نے لفظ بلفظ وہی کچھ دہرایا جو کمانڈر کو بتایا تھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اس طرح میرے بے چارے دوسرے دونوں ساتھیوں نے بھی وہی بیان دیا۔ آخر میں مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ مفرور ہماری غلطی سے فرار ہوئے ہیں۔ میں چونکہ موقعہ پر موجود نہیں تھا۔ مجھے تو بری کر دیا گیا جبکہ دوسرے ساتھیوں کے متعلق حکم سنایا گیا کہ ان کی مرضی اس فرار میں شامل نہیں لیکن بہر حال وہ کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں جس پر انہیں دس دس بید مارے جائیں گے۔

میں تو سکتے میں آ گیا ..... سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں کیا کہوں؟ زبان سے نکلا ایک غلط لفظ مجھے زندہ درگور کر سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے جرم کی سزا میرے بے گناہ ساتھیوں کو دی گئی جو انہوں نے حیرت انگیز طور پر بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ انہیں دیکھ کر تو مجھے خود سے شرم آ رہی تھی۔ اس بات پر نہیں کہ میرے گناہ کی سزا انہیں ملی ہے؟ بلکہ اس بات پر کہ میں تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہا تھا۔ مجھے تو بعد میں علم ہوا کہ اطاعت امیر کے لئے یہ لوگ جلتی آگ میں بھی چھلانگ لگا سکتے ہیں۔

رات ہم نے آرام کیا۔ صبح نماز کے بعد امام صاحب نے سزا پانے والے ساتھیوں کی استقامت پر ان کے لئے خصوصی دعا کی اور کہا کہ خود احتسابی کا یہ عمل ہی دراصل اسلام کی روح ہے۔ میں خاموشی سے سر جھکائے سب کچھ سنتا رہا اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر بھی ادا کرتا رہا کہ میں بچ گیا کیونکہ ابھی میرا ایمان اتنا مضبوط نہیں ہو رہا تھا کہ میں بھی اسی ردعمل کا مظاہرہ کرتا جو ان کی طرف سے ہو رہا تھا۔

نماز کے بعد ہم نے معمول کا ناشتہ کیا۔ اسے ناشتہ تو نہیں، کھانا ہی کہنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد حالات پر منحصر تھا کہ ہم کب کھانا کھاتے۔ دوران جہاد ہم کئی کئی دن اپنے تھیلے میں محفوظ چنوں، گڑ اور بسکٹوں پر گزارہ کیا کرتے تھے.... !!!

اس مرحلے پر ہماری دوبارہ تشکیل جس گروپ کے ساتھ ہوئی اس کے کمانڈر ایک عربی بھائی تھی جنہیں ہم کمانڈر صاحب ہی کہا کرتے تھے۔ کسی کو ان کے نام یا کنیت کا علم نہیں تھا۔ کمانڈر صاحب نے بال اتنے بڑھائے ہوئے تھے کہ ڈھنگ سے ان کی شکل ہی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چہرے کا جو حصہ داڑھی سے بچا تھا اس کو ان کی آنکھوں سے لگی بڑے بڑے کالے رنگ کی شیشوں کی عینک نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کمانڈر صاحب کے ساتھ ہم اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ ہماری تربیت کچھ اس طرح تھی کہ ہم کوئی سوال مشن سے متعلق نہیں کر سکتے تھے۔ ہم صرف اطاعت امیر کے پابند تھے اور آخری لمحات تک ہم سے یہ خفیہ رکھا جاتا تھا کہ ہم کہاں اور کس مشن پر جا رہے

ہیں۔

میری متجسس طبیعت نے مجھے جلد ہی باخبر کر دیا کہ ہمارا کمانڈر کسی عرب ملک سے نہیں بلکہ سنٹرل ایشیا سے تعلق رکھتا ہے وہ جس طرح ملی جلی پشتو اور فارسی بول رہے تھے وہ کسی عربی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس سے پہلے عربی مجاہدین کے ساتھ بھی معرکے لڑے تھے اور ان کی قوت ایمانی کا قائل بھی تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنے موجودہ کمانڈر صاحب میں ایسے اوصاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

پہاڑی سلسلوں میں ہمارا سفر دو دن اور تین راتیں جاری رہا۔ ہمارے گروپ میں کمانڈر صاحب کے علاوہ دس مجاہدین تھے۔ راستے میں متعدد مرتبہ ہمیں غیر ملکی فوجیوں پر گھات لگانے کے مواقع ملے لیکن کمانڈر صاحب پہلو بچا کر نکل گئے۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ پہلے سے طے شدہ مشن کے علاوہ ہمیں اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ممکن ہے اس علاقے میں سرگرم کسی اور گروپ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہو کیونکہ راستے میں چار مرتبہ ہمیں طالبان اور غیر ملکی افواج کے درمیان جھڑپ کا اندازہ بھی ہوا اور ہم نے کمانڈر صاحب کے سیٹ پر مبارکباد کے پیغامات بھی وصول کئے شاید طالبان نے ان حملوں میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ مجھے ان کافروں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ کیوں نہیں مل سکا۔

راستے میں ہمیں کبھی کبھی طالبان کی طرف سے گاڑی بھی میسر آ جاتی جس میں ایک مخصوص مقام تک سفر کرنے کے بعد ہم پیدل آگے جایا کرتے تھے۔ اس سفر کا اختتام بالآخر قندھار کے ایک نواحی قصبے میں ہوا۔ یہاں ہم اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر ٹھہرے جہاں گرم گرم افغانی پلاؤ، نان، اور قہوہ ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں پہاڑی راستوں میں بھٹکتے آج چوتھا دن تھا اور بھوک بھی خوب چمک رہی تھی۔ جی بھر کے کھانا کھایا۔ جس کے بعد کمانڈر صاحب نے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ ابھی ہم فوراً مشن پر جا رہے ہیں۔ ہمیں یہاں بریف کیا گیا کہ افغانی فوجیوں کی تنخواہ لے کر ایک سرکاری ٹرک جا رہا ہے۔ ہم نے گھات لگا کر رقم پر قبضہ کرنا تھا۔

مجھے اب سمجھ آنے لگی تھی کہ اس مرتبہ ٹریننگ کا جو ریفریشر کورس کروایا گیا تھا اس کی وجہ کیا تھی؟ اب ہمیں شاید اس نوعیت کا جہاد کرنا تھا جس پر میرا ضمیر آمادہ نہیں ہو رہا تھا لیکن دماغ اس بات کو ضرور قبول کرتا تھا کہ ہمیں تو دشمن کو نقصان پہنچانا اور خود کو مضبوط کرنا ہے۔ جس کے لئے وسائل یہیں سے حاصل کرنے تھے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھوڑی دیر بعد ہم اپنے مشن پر جا رہے تھے۔ یہ قدرے میدانی لیکن درختوں اور پہاڑی ٹیلوں سے اٹا ہوا علاقہ تھا۔ قریباً پون گھنٹے بعد ہم اپنے ٹارگٹ ایریا میں پہنچ گئے جہاں کمانڈر صاحب نے سیٹلائٹ فون پر کسی سے بات کی اور مطمئن ہونے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہو کر ہماری تربیت کرنے لگے۔ چند منٹ کے اندر ہی ہم سب گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے بعد ہمیں واکی ٹاکی پر سگنل ملا کہ شکار ہمارے پھیلائے جال کی طرف آ رہا ہے اور چند منٹ بعد دور سے تین جیپیں آتی دکھائی دیں۔ اگلی جیپ پر ایک ایل ایم جی نصب تھی اور ایک غیر ملکی فوجی دوربین سے بڑا واضح دکھائی دے رہا تھا جس کے باقی ساتھی بھی چوکس بیٹھے تھے۔ درمیان میں شاید وہ جیپ تھی کہ جس میں خزانہ جا رہا تھا اور اس کے بعد ایک اور جیپ جس میں افغان فوجی سوار تھے جیسے ہی پہلی جیپ نشانے پر آئی۔ سڑک سے قریباً پچاس گز دور موجود ہمارے ایک ساتھی نے اس پر راکٹ لانچر فائر کیا جو جیپ کے درمیان میں لگا اور وہ الٹ گئی۔ یہی انجام اس کے بعد والی دونوں جیپوں کا ہوا۔

غیر ملکی اور افغان فوجیوں کے ہلنے جلنے سے پہلے ہم ان کے سروں پر موجود تھے۔ ہم نے احکامات کے مطابق تمام فوجی مار دیئے صرف دو غیر ملکی جن میں سے ایک زخمی تھا، زندہ قابو کر لئے۔ یہ دونوں ہمارا بہترین اثاثہ تھے۔ طالبان ان کے بدلے امریکیوں سے اپنے پندرہ بیس ساتھی اور کافی رقم آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔ مقامی علاقے سے آشنا دو ساتھی اور میں ان دونوں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہانکتے ہوئے پہلے سے طے شدہ ٹھکانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ ایک زخمی جس کے بازو اور سر پر چوٹ لگی تھی درد سے مسلسل کراہ رہا تھا اور چلنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اپنی ایمرجنسی سے اس کے بازو پر فرسٹ ایڈ باندھ دی جو ہمیں ساتھ رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ اپنی چھاگل سے پانی کے ذریعے اس کو دو درد کشا گولیاں بھی کھلا دیں جس پر اس نے میرا شکریہ بھی ادا کیا۔

اس مختصر گروپ کا چونکہ کمانڈر میں تھا اس لئے دونوں ساتھیوں کو میری بات ہی ماننا تھی۔ یہاں سے قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہمارے ساتھی گاڑی کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے دونوں فوجی ہم سے وصول کر کے اپنی گاڑی میں ڈالے اور چلے گئے۔ ہم اپنی ترتیب کے مطابق دوسری طرف مڑ گئے۔ ان فوجیوں کے نام کیا تھے؟ کس ملک کے شہری تھے؟ ان کے ساتھ کیا

ہوا؟ اس کا مجھے علم نہیں لیکن یہ بات میں جانتا ہوں کہ طالبان کی کوشش ہوتی ہے کوئی زندہ غیر ملکی ان کے ہاتھ لگ جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تاوان وصول کر سکیں۔ جیپوں کی جو رقم ہمارے قبضے میں آئی تھی وہ دوسرا گروپ لے کر نکل آیا تھا اور انہوں نے تینوں جیپوں کو آگ لگا دی تھی۔ مقامی آبادی طالبان کی حمایتی اور امریکہ دشمن تھی جو اس کارروائی پر یقیناً خوش ہوں گے۔

ہم اب مقامی گائیڈ کے ذریعے اس علاقے سے جلد از جلد نکل جانا چاہتے تھے کیونکہ چند منٹ بعد ہی امریکیوں کے ہیلی کاپٹر یہاں پہنچ سکتے تھے اور ایسا ہی ہوا۔ ہم ابھی ٹارگٹ ایریا سے بمشکل 10 کلومیٹر دور پہنچے ہوں گے کہ ہمارے حساس کانوں نے ہیلی کاپٹر کی آواز سن لی۔ اگلے لمحے ہم نزدیکی پہاڑی کے اندر بنے ایک چھوٹے سے غار میں اس طرح چھپ گئے کہ اب پہاڑی کا حصہ ہی معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ہمارے جو ساتھی غیر ملکی فوجیوں کو لے کر نکلے ہیں ان تک اس ہیلی کاپٹر کی رسائی ممکن نہیں وہ اب تک نہ جانے کہاں پہنچ گئے ہوں گے۔

ہیلی کاپٹر نے وہاں دو تین چکر کاٹے پھر تین اور ہیلی کاپٹر آ گئے۔ ان ہیلی کاپٹروں میں موجود فوجیوں نے اب تک جائے واردات پر پوزیشنیں سنبھال لی ہوں گی جس کے بعد نزدیکی دیہاتوں پر ریڈ کرتے اور وہاں پر موجود بوڑھوں یا ہاتھ لگنے والے نوجوانوں پر تشدد کر کے ان سے طالبان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو انہیں کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو مقامی پختون آبادی کی شمالی اتحاد اور امریکنوں سے نفرت تھی اور وہ طالبان کے حامی سمجھے جاتے تھے جبکہ دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ کسی طالب کے بجائے جو انہیں جاسوسی کے الزام میں گولی مار دے، کسی امریکی کی گولی سے مرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

○

تین ماہ ایسی ہی کارروائیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس دوران ہمیں پانچ مرتبہ براہ راست امریکنوں اور افغان فوجیوں پر نقب لگانے کا موقعہ ملا اور ہم نے بڑی کامیابی سے یہ معرکے سر کئے۔ کسی کارروائی میں ہمارا ایک ساتھی زخمی بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ امریکنوں نے ہمارے ایک سابق گاؤں پر گولہ باری کر کے وہاں چھ بے گناہ عورتوں اور بچوں کو طالبان کے شبے میں ضرور مار ڈالا جس پر بڑا شور بھی مچا۔ بے غیرت افغانی صدر نے بھی اس پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ لیکن ایسا پہلی مرتبہ تو ہوا نہیں تھا۔ دو ماہ پہلے امریکیوں نے ایک بارات پر بمباری کر دی تھی جس پر انہیں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

شبہ تھا کہ بارات کی آڑ میں طالبان سفر کر رہے ہیں۔ اس سانحے پر عالمی پریس نے بھی امریکنوں کے خوب لتے لئے جس کے بعد وہ کچھ محتاط ضرور ہو گئے تھے لیکن انہوں نے اپنا طرز عمل کبھی تبدیل نہ کیا۔ دراصل امریکن جو بظاہر بہت بہادر بنتے ہیں اندر سے خوف زدہ ہیں۔ خوف زدہ آدمی کی نفسیات ہوتی ہے کہ اسے درخت بھی دشمن دکھائی دیتے ہیں اور امریکنوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ زبانی کلامی جو جی چاہے کہتے رہیں اندر سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ عراق کے بعد اب افغانستان میں آ کر کس عذاب میں پھنس گئے ہیں۔ انہیں ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بلٹ پروف لباس، بلٹ پروف گاڑیاں کچھ بھی ان کے خوف کو کم نہیں کر سکا اور خوف کی اس کیفیت میں کبھی کبھی ان پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے جس کا شکار بے گناہ افغان بنتے ہیں۔

میں نے آپ کو بتایا کہ میں جہاد کی اس قسم کو زیادہ پسند نہیں کرتا تھا اور چاہتا کہ طالبان کے اولین دور کی طرح ہم دشمن سے دو بدو مقابلہ کریں جس طرح ہم ماضی میں کیا کرتے تھیں لیکن امریکنوں کی آمد کے بعد یہ صرف چھاپہ مار جنگ بن کر رہ گئی تھی جس کے لئے میں خود کو مکمل تیار بھی نہ کر سکا۔ میں تو پٹھان بچہ تھا اور سیدھا دو دو ہاتھ کر کے دشمن کو مارنے یا خود مر جانے کا قائل تھا لیکن اب میں نے بھی ان حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس مجبوری کا احساس مجھے ہو گیا تھا کہ ہمارے اس جدید دور میں یہی طریق جنگ مناسب ہے۔

مجھ میں پہلی انقلابی تبدیلی اس روز آئی جب ہم قریباً آٹھ ماہ افغانستان میں مصروف رہنے کے بعد پاکستان کے ایک سرحدی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک پاکستانی ٹرائبل ایجنسی ہے جس کا نام میں معافی چاہتا ہوں نہیں لوں گا۔ یہاں مقامی طالبان جو خود کو پاکستانی طالبان کہتے تھے، نے ہمیں خوش آمدید کیا۔ ہماری خاطر تواضع کی۔ مقامی کمانڈر طاہر میرا دوست بن گیا کیونکہ اس نے میرے علاقے کے کچھ مجاہدین کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہاں ہمیں خاصی آزادی میسر تھی۔ ہم اپنی گاڑیوں اور اسلحہ سمیت ایجنسی کے بازاروں میں جاتے وہاں کچھ وقت گزارتے مقامی انتظامیہ سے قریباً ہر روز سامنا ہوتا لیکن وہ ہم سے کنی کترا کر گزر جاتے۔ بعد ازاں مجھے علم ہوا یہ سب کچھ ایک باہمی سمجھوتہ کے تحت ہوا ہے۔ مقامی طالبان اور ایف سی کے درمیان یہ سمجھوتہ طے پایا تھا جس کی قریباً ہر شق کی طالبان خلاف ورزی کر رہے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے سمجھوتہ ختم ہو گیا کیونکہ اس کی پہلی شرط یہی تھی کہ نہ تو طالبان پاکستانی سرحد پار کر کے افغانستان جائیں گے اور نہ ہی ادھر سے کوئی طالب یا دہشت گرد کچھ بھی لے کر انہیں یہاں آئے گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں کئی عربی، ازبک، تاجک اور چیچن دیکھے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہو رہے تھے اس کی سمجھ بھی مجھے اس وقت آئی جب ہمارے مقامی کمانڈر نے میری تشکیل ایک ایسے گروپ میں کی جس نے ایف سی پر حملہ کرنا تھا۔ یہ میرے لئے ناقابل برداشت اور ناقابل قبول تھا۔ فرنٹیئر فورس پاکستان کی فورس تھی اس سے ہماری کیا دشمنی؟ ہر طالب یہ جانتا تھا کہ خلیفہ ملا عمر نے نائن الیون کے بعد حکم جاری کیا تھا کہ کوئی طالب بدترین حالات میں بھی پاکستانی فوج سے جنگ نہیں کرے گا جہاں یہ ناگزیر ہو وہاں بہر صورت پہلو تہی کی جائے...... اس کے باوجود یہ طالبان پاکستان کی پیرا ملٹری فورس پر حملہ کرنا چاہتے تھے؟

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ خلیفہ ملا عمر کے طالبان نہیں کوئی اور ہیں یا پھر طالبان کا کوئی باغی گروہ ہے یا پھر یہ لوگ کسی پاکستان اور اسلام دشمن ایجنسی کے آلہ کار ہیں۔ کم از کم میرا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ افغانستان کی سابقہ اسلامی حکومت کے طالبان ایسا کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

ان طالبان میں زیادہ تعداد پاکستان کے مقامی طالبان کی تھی اور ان کا کمانڈر بھی پاکستانی تھا۔ میں اس کا فرضی نام خالد لکھ رہا ہوں۔ آپ میری مجبوری سمجھتے ہیں۔ افغانستان سے آنے والے طالبان کے جس گروپ میں میں شامل تھا اس میں شاید میں اکیلا پاکستانی تھا باقی 9 طالب افغانی، تاجک، ازبک اور عربی تھے۔ ان کے کچھ ساتھی یہاں پہلے سے موجود تھے جو میرے لئے عجیب کی بات تھی کیونکہ پاکستان میدان جنگ نہیں تھا میدان جنگ تو افغانستان تھا جہاں امریکی اور اتحادی فوجیں موجود تھیں پھر یہ سب کیا تھا؟

اس روز پہلی مرتبہ میرے اندر بغاوت نے سر اٹھایا لیکن حالات و واقعات نے مجھے اتنا عقل مند ضرور بنا دیا تھا کہ کوئی لمحوں میں میری زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ میں نے فی الوقت ''انتظار کرو اور دیکھو'' کی پالیسی اپنانے کا فیصلہ کیا۔

اب ہم کمانڈر خالد کی کمال میں آ گئے تھے اس نے عشاء کی نماز کے بعد سب کو جمع کیا اور ایک جذباتی تقریر میں کہا کہ پاکستان چونکہ امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن چکا ہے اس نے امریکنوں کے ساتھ مل کر طالبان کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں سرحد عبور کر کے اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے بھی نہیں جانے دیا جاتا۔ اس لئے پاکستان کی فوج بھی امریکنوں کی طرح ہماری دشمن ہے۔ ہمارا کوئی ملک نہیں ہوتا ہم کسی سرحد کے پابند نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس زہرناک تقریر کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

بعد اس نے ہماری تشکیل کی اور ہم مقامی ساتھی کے ساتھ اپنا اسلحہ لے کر ایک ایف سی پوسٹ کی طرف چل دیئے۔ میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں اور میں کسی بھی لمحے یہاں سے فرار کے لئے پر تول رہا تھا۔ اچانک ہی میرے دل میں خیال آیا جس نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے سوچا میں تو خلوص نیت سے جہاں کر رہا ہوں۔ اللہ کو میری نیت کا بھی علم ہے اور وہ میری مجبوری بھی جانتا ہے پھر بھی اگر اس نے مجھے یہاں رکھا ہوا ہے تو اس میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ یوں بھی میرا ایمان تھا کہ اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہم انسان بسا اوقات اتنا شعور نہیں رکھتے کہ اسرار الٰہی کو جان سکیں۔ مجھے چند روز بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ جس کا ذکر آگے ہوگا۔

بادل نخواستہ مجھے کمانڈر خالد کے حکم کی تعمیل تو کرنی تھی لیکن میں نے یہ ارادہ ضرور کر لیا تھا کہ انشاء اللہ پاکستان کا تو کوئی فوجی میرا نشانہ نہیں بنے گا۔ البتہ میں ان کا کام ضرور آسان کر دوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میری ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ راکٹ لانچر میرے اور ایک ازبک ساتھی کے پاس تھا باقی گروپ نے کلاشنکوف اور ایک ایل ایم جی کے علاوہ چند گرنیڈ استعمال کرنے تھے۔

پوسٹ تک ہم نے آسانی سے چوروں کی طرح چھپ چھپ کر سفر طے کر لیا جس کے بعد اپنی تربیت کے مطابق اسے گھیرے میں لے لیا۔ میرے کندھے پر راکٹ لانچر اور پشت پر کلاشنکوف بندھی تھی۔ میرے آگے دوسرے ازبک راکٹ لانچر والے نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ پہلا فائر اس نے کیا۔ راکٹ سیدھا پوسٹ پر لگا لیکن ایسی پوزیشن میں جس سے پوسٹ کو مطلوبہ نقصان نہ پہنچا..... ایف سی والے چوکس تھے۔ انہوں نے فوراً جوابی حملہ کر دیا۔ مجھے جلدی اندازہ ہو گیا کہ امریکنوں اور پاکستانی فوجیوں میں کیا فرق ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی گھبراہٹ کے انتہائی منظم اور موثر فائرنگ کر رہے تھے میرے ساتھی بھی چونکہ تربیت یافتہ تھے وہ بھی اپنا کام کر رہے تھے اور میں اپنا.....!

جی ہاں! میں نے تین راکٹ فائر کئے لیکن تینوں کو غلط سمت میں فائر کیا اس کے ساتھ ہی اپنی کلاشنکوف سنبھالی اور اپنے آگے والے ازبک اور تاجک کے پرخچے اڑا دیئے۔ ہم اس طرح پھیل کر لڑ رہے تھے کہ کسی کو اندازہ ہی نہ ہو سکتا گولی کدھر سے آئی ہے اور کیسے۔ اس کے ساتھ میں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اسلحہ پھونکنا شروع کر دیا اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بمشکل

Uploaded By Muhammad Nadeem

دس منٹ بعد میں نے اپنے نزدیک آہٹ محسوس کی یہ ہمارا گروپ کمانڈر تھا جس نے ملی جلی عربی اور پشتو میں کہا۔

"نکل چلو..... چار ساتھی مارے گئے ہیں۔"

"نہیں ..... ہمیں بزدلوں کی طرح میدان نہیں چھوڑنا"..... میں نے اپنا کیس پکا کرنے کے لئے جوش دکھایا جبکہ میں اس سے بھی پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں یہاں سے نکلو"..... شاید میرے جذبہ ایمانی سے وہ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر امیر کا حکم ہے تو میں چلتا ہوں....." میں نے کہتے ہوئے اپنا لانچر اٹھایا۔

"بے وقوف نہ بنو..... اسے پھینک دو....." اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں ..... میں اپنا ہتھیار جیتے جی خود سے الگ نہیں کر سکتا....." میں نے کہا اور اس کے ساتھ جھکتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کوئی قرون اولیٰ کا مجاہد ہوں۔ اس لئے خاموش رہا۔ ہم دس ساتھی یہاں آئے تھے اور چار بچ کے جا رہے تھے۔ ادھر کے نقصان کا مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔

دو گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد ہم اپنے محفوظ ٹھکانے تک پہنچ گئے۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے ایف سی نے ہمارا تعاقب نہیں کیا۔ جنگی اصولوں کے مطابق یہ ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ گوریلا جنگ کے اصول ہوتے ہیں جن کی معمولی خلاف ورزی لڑائی کا پانسہ پلٹ سکتی ہے۔ عموماً شب خون اس لئے مارا جاتا ہے کہ مخالف فوج اپنے ٹھکانے سے نکل کر ہمارا تعاقب کرے اور ہمارے گھات میں لگے ساتھی بطخوں کی طرح ان کا شکار کر لیں۔ ان گھات میں بیٹھے طالبان کے پاس "نائٹ ویژن" (رات کے اندھیرے میں دیکھنے والی دوربین) موجود ہوتی تھی۔ اتنا جدید اور مہنگا اسلحہ کہاں سے آ رہا تھا؟ اس کا جواب بھی مجھے کچھ دنوں کے بعد مل گیا۔

معسکر میں ہمارا استقبال کمانڈر خالد نے کیا۔ اس نے ہم چاروں کو شاباش دی۔ کامیاب واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ میری بہادری کو بطور خاص سراہا گیا کہ میں نے فرار ہوتے ہوئے اپنا راکٹ لانچر وہیں نہیں چھوڑا جبکہ ایک ساتھی اپنی "ایل ایم جی" وہاں پھینک آیا تھا۔ مجھے بطور خاص تمام طالبان گلے لگا کر مبارکباد اور "جزائے خیر" کی دعا دے رہے تھے اور میں حیران تھا کہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

یہ تو بہت بھولے ہیں یا پھر بہت چالاک۔ ہم نے کافروں سے تو جنگ نہیں کی تھی کہ ہم نے تو اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہایا تھا جن کا شمالی اتحاد سے بھی کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

عجیب کشمکش میں پھنس کر رہ گیا تھا میں..... بہر حال اس وقت بہترین حکمت عملی ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور خاموش رہ کر اپنے جذبات چھپائے رکھنا تھا سو میں نے ایسا ہی کیا۔ ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان سے گھر جانے کی رخصت مانگتا عموماً اس کا فیصلہ بھی مقامی کمانڈر کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ یوں بھی گھر پر کوئی میرے لئے پھولوں کے ہار لے کر تو کھڑا نہیں تھا۔ وہاں بھی میرے لئے کوئی نہ کوئی مصیبت موجود ہوتی۔

افغانستان سے لوٹنے کے بعد اب تک دو مرتبہ میں نے بھائی صاحب سے رابطہ کیا تھا اس کے لئے بڑا محفوظ طریقہ اپنایا تھا۔ دونوں مرتبہ انہوں نے بتایا کہ ایجنسی والوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور میرے متعلق پوچھتے رہتے ہیں وہ تو اللہ بھلا کرے ہماری مقامی ایم پی اے صاحب کا جو والد صاحب کی وجہ سے ہمارا خیال رکھتے تھے اس لئے بھائی صاحب کی جان بچی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اخبارات میں مجھ سے علیحدگی کا اعلان شائع کروا دیں۔ ممکن ہے اس طرح ان کی جان بچ جائے ورنہ یہ لوگ انہیں تنگ کرتے رہیں گے کیونکہ افغانستان سے قید کاٹ کر آنے والوں کے لئے ابھی معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بھائی صاحب میری بات سن کر خاموش ہو گئے۔ شاید وہ یہ فیصلہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بہر حال میرے بضد ہونے پر انہوں نے چپ سادھ لی۔

دس بارہ روز تک ہم معمول کی گشت کرتے رہے۔ اس دوران میں نے بظاہر سادگی سے لیکن دلچسپی لے کر یہ کھوج لگانے کی کوشش کی کہ آخر پاکستانی طالبان کا خرچ کیسے چلتا ہے؟ اسلحہ خصوصاً جدید ترین اسلحہ کہاں سے آتا ہے اور ان کے پاس موجود جدید ترین کمیونی کیشن سسٹم کہاں سے آ گیا۔ ایسے جدید ہتھیار اور مواصلاتی نظام تو افغانستان میں طالبان کے پاس نہیں تھا۔ میں نے کسی سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ان کی تمام سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ نہیں لیا لیکن میرا دل و دماغ دونوں اب یہاں رہنے پر راضی نہیں تھے اور میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ جہاد کے لئے اور میدان بھی موجود تھے۔ کم از کم میں اپنے ملک کی فوج کے خلاف جہاد کا قائل نہیں تھا۔

○

اس روز اچانک ہی کمانڈر خالد نے مجھے اور چار دوسرے طالبان کو اپنے پاس بلایا اور ہم سے الگ میٹنگ کی۔ اس نے ہمیں جو بریف کیا اسے سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کمانڈر خالد کے مطابق ہمیں افغانستان کے ایک سرحدی علاقے سے کچھ سامان اور کرنسی وصول کرنی تھی۔ مجھے شک تو ہوا لیکن میں نے یہ نہیں دریافت کیا کہ کس سے؟ کمانڈر خالد نے البتہ خود ہی کہنا شروع کیا کہ ہمیں جہاد کے لئے وسائل کی ضرورت ہے۔ مسلمان حکمران بے غیرت ہو چکے ہیں۔ امریکہ کی غلامی کی وجہ سے وہ اپنے خوف کا شکار ہیں اور افغان جہاد کے دوران جو عرب ممالک ہمیں اپنے مسلم بھائی سمجھتے ہوئے اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ ہماری مدد کیا کرتے تھے آج ان کے تمام وسائل ہمارے خلاف اور ہمارے دشمنوں کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں جہاد جاری رکھنے کے لئے اگر کافر بھی ہماری مدد کریں تو ہمیں انکار نہیں ہونا چاہئے.....!!

ان کی بات بظاہر مطمئن کرنے کے لئے کافی تھی ویسے بھی ہم میں دماغ سے کام لینے والے بہت کم اور ہاتھوں سے کام لینے والے بہت زیادہ تھے۔ کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ جو کافر یا غیر مسلم جہاد کے لئے ہماری مدد کرے گا۔ جواب میں ہمیں اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ مجھے سمجھ تو آ گئی کہ یہاں جہاد کے نام پر کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے لیکن میں خاموش رہا۔ میرا تجسس بڑھنے لگا اور میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون سا غیر مسلم دوست ہے جو ہماری ایسی بے لوث مدد کر رہا ہے۔ اب میں بھی پنجابی کے ایک محاورے کے مطابق بُرے کے گھر تک جانا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اگلے روز ہم نے عام کپڑوں میں عام شہری کی حیثیت سے سفر کا آغاز کیا۔ میرے چاروں ساتھی مقامی تھے۔ ان میں سے انگریزی میں معمولی سی شدھ بدھ صرف میں رکھتا تھا۔ ایجنسی سے پشاور اور وہاں سے پھر دوسری ایجنسی تک کا سفر ہم نے عام مسافروں کی طرح کیا اور مطلوبہ ایجنسی کا علاقہ شروع ہوتے ہی ہمارے مقامی طالبان ساتھیوں نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان کے لئے شاید یہ معمول کی بات تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا سا لگا کہ اس ایجنسی میں بھی طالبان کی قریباً تیس فیصد تعداد غیر ملکی تھے۔ یہ تمام ازبک، تاجک، چیچن اور عربی مجاہد تھے۔ کسی کے خلوص خصوصاً ہمارے عربی بھائیوں کے متعلق میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کر سکتا اور آج تک اس پر قائم ہوں۔ یہ دراصل افغانستان کے جہاد کے دوران پاکستان آنے والے وہ عرب شہزادے تھے جنہوں نے سونے کا چمچہ منہ میں لے کر آنکھ کھولی تھی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

لیکن اللہ نے ان کی غیرت ایمانی برقرار رکھی اور یہ افغانستان کو جہادی مرکز جان کر یہاں آ گئے تھے۔ یہ اپنے ساتھ اتنی زیادہ دولت لائے تھے کہ انہیں کسی اور چیز کی حاجت ہی نہیں رہتی تھی۔ انہوں نے اپنے خزانوں کے منہ مجاہدین کے لئے کھول رکھے تھے۔ طالبان کا قریباً تمام خرچ انہی کے پیسوں سے چلتا تھا یا پھر جو افغان حکومت سے جو مال غنیمت ملتا۔

میرا دل کہتا تھا کہ میری طرح یہ بے چارے بھی صرف امریکہ دشمنی اور شوق شہادت کے لئے یہاں موجود ہیں۔ انہیں بھی میری طرح علم نہیں کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ ویسے بھی عربی مجاہدین کو ہمارے نظم سے الگ رکھا جاتا تھا اور یہ لوگ ہمارے ساتھ گھل مل کر رہنے کی بجائے اپنے ہم زبانوں کو ترجیح دیا کرتے تھے لیکن ازبک، تاجک اور چیچن میرے لئے اب قابل اعتبار نہیں تھے جس کا مجھے بعد میں ثبوت مل گیا۔

O

نیا باب

اسی رات سرحد عبور کر کے ہم افغانستان چلے گئے۔ جلال آباد کے نزدیک سروبی نامی ایک جگہ پر ہم نے اپنے اس پُراسرار محسن سے ملاقات کرنی تھی جو ہماری ضروریات پوری کر رہا تھا۔ کمانڈر صاحب نے یوں تو ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا لیکن یہ بھی کہہ دیا تھا کہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ وہاں سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ صرف غیر ملکی فوجیوں سے محتاط رہنا ہے جن کی شکل ہمیں ابھی تک یہاں دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ ہمارے دو مقامی طالبان ہماری حفاظت کے لئے یہاں موجود تھے۔ دراصل اب ان کے ذریعے ہی ہم نے باقی سفر طے کرنا تھا۔ ان میں سے ایک گلفام کا نام مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ خدا جانے یہ صحیح ہے یا غلط۔

اس علاقے میں ہمارا قیام ایک معمولی سے ہوٹل میں تھا جس کے دو کمرے ہمارے ساتھیوں نے پہلے سے ہمارے لئے بک کروائے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا مالک بھی ہمارا ساتھی ہے۔ یہاں حیرت انگیز طور پر میں نے انڈیا کی بنی ہوئی کچھ گاڑیاں اور ٹرک دیکھے جن کے متعلق علم ہوا کہ دراصل یہ ایک بھارتی کنسٹرکشن کمپنی کی گاڑیاں ہیں یہ کمپنی افغانستان کی تعمیر نو میں افغان حکومت کی مدد کرنے کے لئے بھارتی حکومت نے بھیجی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد ہم قہوہ پی رہے تھے۔ میں کمرے کی کھڑکی کھولے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس کمپنی کی ایک گاڑی وہاں آ کر رُکی جس سے تین بندے باہر نکلے ان میں ایک گٹھے جسم کا گنجا نجانے کیوں پہلی ہی نظر میں مجھے مشکوک دکھائی دیا۔ تینوں نے باہر کھڑے ہمارے ساتھیوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور وہی گنجا ایک ساتھی کے ساتھ اندر آ گیا۔ باقی دونوں نیچے ہی بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہمارے سامنے موجود تھا۔ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کرواتا تو میں اس کی شکل سے ٹپکتی نحوست یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ وہ کون ہے۔

''میرا نام گپتا ہے..... میں آپ کا دوست ہوں..... میرے خیال سے یہ تعارف کافی ہو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

گا''.....اس نے انگریزی میں مسکراتے ہوئے کہا اور ہم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس نے بے تکلفی سے ہمارے ساتھ قہوہ پینا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان چلنے لگی۔ ہندی، اردو، پشتو، اور انگریزی کے ملاپ سے وہ جو زبان بول رہا تھا وہ ہمیں اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے ہمارے سامنے تقریر شروع کر دی۔ گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ وہ تو افغانستان کی تعمیر نو کرنے آئے ہیں۔ انہیں طالبان کی حکومت بہت پسند ہے۔ طالبان کی حکومت امریکہ نے نہیں پاکستان نے ختم کی ہے جس نے طالبان حکومت کی کمر میں خنجر گھونپا۔ ان کے تمام ٹھکانوں کی امریکہ کو نشاندہی کی اور امریکہ کے ساتھ مل کر طالبان کا قتل عام کروایا۔ اس نے بطور خاص پاکستان کی سرحد میں پناہ لینے والوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کی کہانیاں سناتے ہوئے ثابت کرنا چاہا کہ طالبان کا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے۔ جس سے نمٹنے کے بعد جیسے ہی ان کی حکومت افغانستان میں قائم ہوگی وہ فوراً اسے تسلیم کر لیں گے۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اس مکار کا گلہ گھونٹ دوں جبکہ باقی تمام ساتھی جنہیں اس کی کچھ باتیں سمجھ آ رہی تھیں کچھ نہیں آئی تھی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بڑے پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ہمارے یہ مسلمان بھائی جو بظاہر جہاد یوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں آخر پاکستان کے خلاف اس گھناؤنی سازش کا حصہ کیوں بن رہے ہیں۔ مجھے ان پاکستانی طالبان سے نفرت ہونے لگی تھی جو خلیفہ عمر کے احکامات کے بالکل منافی اسلامی شریعت کے نفاذ کی آڑ میں اس کھیل کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ مجاہد سادہ دل ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان میں سے بہت کم کو اس کا علم رہا ہو۔ نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ بہرحال مجھے اس بات کی سمجھ آ گئی تھی کہ افغانستان کے اس طرف اور اس طرف مختلف انداز کا جہاد ہو رہا ہے۔

گپتا ہمارے ساتھ اس طرح فری ہو رہا تھا جیسے ہم اس کے قریبی عزیز ہوں۔ اس نے مجھے بطور خاص ایک سیٹلائٹ فون تحفہ میں دیا جس میں اس کا نمبر پہلے سے فیڈ feed تھا۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں جنوبی پنجاب سے آیا ہوں اور مستقبل میں مجھ سے کام لینے کا متمنی تھا۔ اس نے ہمیں ایک بیگ تھماتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے کمانڈر صاحب کے لئے ہے۔'' بیگ میں پاکستانی، افغانی اور امریکی کرنسی کے بنڈل دکھائی دے رہے تھے۔ یہ تھا وہ روپیہ پیسہ جو پاکستان میں نام نہاد شریعت نافذ کرنے کے لئے استعمال ہونے جا رہا تھا۔ مجھے اب سمجھ آئی کہ پاکستانی طالبان کو ماہوار تنخواہیں کہاں سے ادا کی جاتی ہیں اور باقاعدہ فوج کی طرح ان کی تنخواہوں کے

لئے رقم کون مہیا کرتا ہے۔

خدا جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی ہمت عطا فرمائی جب اس نے امریکی ڈالرز کا ایک لفافہ الگ سے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''ہماری تمہاری دوستی کے نام پر''.....

اس نے مجھے پنجابی زبان میں شراب و شباب کی دعوت دی اور کہا کہ میں اس کا خصوصی مہمان بن کر جتنے دن چاہوں جلال آباد اور کابل میں رہ سکتا ہوں۔

میں نے اس کا ہونٹ بھینچتے ہوئے شکریہ ادا کیا جس پر اس نے آئندہ ملاقات کی تلقین کرتے ہوئے سیٹلائٹ فون کے ذریعے رابطہ رکھنے کو کہا۔ اس کے ذریعے علم ہوا کہ دس ایل ایم جی گنیں، دس راکٹ لانچر اور ان کا بارود ہمارے ساتھ جائے گا۔ افغانستان کا بارڈر وہ کراس کروائیں گے جس کے بعد ہمارے طالبان ساتھی ہمیں سنبھال لیتے۔ میں جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتا تھا کیونکہ اس کا وجود مزید برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا لیکن مغرب تک وہ بیٹھا رہا۔ اذان کے بعد ہم نے نماز بھی ادا کی۔ وہ وہیں موجود رہا جس سے یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے مقامی حکام یعنی افغان حکومت کا مکمل تعاون حاصل ہے بلکہ یہاں قابض امریکہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے شواہد مل رہے تھے کہ سی آئی اے اور ''را'' مل کر پاکستان کے خلاف مذموم سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ کم از کم مجھے اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ بعد میں مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ افغانستان کی انٹیلی جنس ایجنسی RAAM ریاست امور ملیہ جو سابقہ بدنام زمانہ انٹیلی جنس ایجنسی ''خاد'' کو توڑ کر بنائی گئی تھی، بھی RAW ہی کی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اور طالبان میں RAAM کے ایجنٹ ہر وقت متحرک رہتے ہیں۔ جن کی کمانڈ پاکستانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ موجود بھارتی قونصل خانوں میں سفارتی لبادے اوڑھے ''را'' کے افسران کر رہے ہیں۔ گپتا بھی ان میں سے ایک اور ''سروبی'' کا انچارج تھا۔ یہ لوگ خود کو ''معاون'' کہتے تھے اور یہاں افغانستان کی تعمیر اور پاکستان کی تخریب میں بھی امریکنوں اور شمالی اتحاد کی مکمل اور بھرپور معاونت کر رہے تھے۔ میں تو تھرا کر رہ گیا۔

فی الوقت کسی بھی مرحلے پر ری ایکٹ Re-Act کر کے میں ان کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسے بہرحال مطمئن کیا اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا اور اپنے ساتھیوں سمیت اس پراڈو گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا جس میں پہلے سے سارا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

سامان چھپا کر رکھا گیا تھا۔ پیسوں والا بیگ میں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ مقامی طالب نے سنبھالی جو میرے اندازے کے مطابق افغان انٹیلی جنس کا کوئی کارندہ تھا۔ قصہ مختصر چالیس گھنٹے کے طویل اور مسلسل سفر کے بعد ہم اپنی ایجنسی میں اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

افغانستان سے پاکستان کی اس ایجنسی تک کے راستے میں یقیناً پاکستان کے ہزاروں اور نیم فوجی موجود رہے ہوں گے لیکن یقین کیجئے ہمارے ساتھیوں نے جو راستے اختیار کئے ان پر سوائے مقامی خاصہ داروں کے اور کوئی مجھے دکھائی نہیں دیا جو طالبان کو دیکھتے ہی مؤدب ہو کر راستہ دے دیا کرتے تھے۔ ہمیں راستے میں اس بات کی مہلت بھی نہ ملی کہ گاڑی میں موجود سامان چیک کر لیتے جو بڑی ترتیب سے سجا کر اس میں صفیں ڈالی ہوئی تھیں جن پر کچھ کمبل وغیرہ ڈال کر انہیں کیموفلاج کیا گیا تھا۔

ہمارا استقبال کمانڈر خالد نے بڑی گرم جوشی سے کیا۔ پہلے سے اس کام کے لئے مستعد تین چار طالبان نے جو غیر مقامی تھے سامان اتارنا شروع کر دیا ہم سامنے ایک چھپر کے نیچے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ میں نے کمانڈر خالد کو رقم کا بیگ سیٹلائٹ فون اور وہ ڈالرز والا لفافہ اور سیٹلائٹ فون مجھے واپس لوٹاتے ہوئے کہا کہ ان پر صرف میرا حق ہے اور اسے میرا انعام سمجھا جائے۔ میرا شمار اب ان کے انتہائی قریبی اور قابل اعتماد ساتھیوں میں ہونے لگا تھا۔ ہمارے لئے بطور خاص چائے تیار کی گئی تھی۔ چائے کی پیالی میرے منہ کو لگی تھی جب پیالی ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ ایک دھماکے کی آواز نے مجھے چونکا دیا جس کے بعد کا منظر تو میرے بدن میں سنسنی دوڑا گیا۔

ہوا یوں کہ لکڑی کی ایک پیٹی اٹھائے ہوئے ایک طالب کا پاؤں کسی رکاوٹ میں الجھا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ پیٹی زمین پر گر کر ٹوٹ گئی لیکن اس میں سے جو کچھ باہر آیا وہ بہت ہی پریشان کن تھا۔ اس پیٹی میں ایل ایم جی کے گولیاں اور سفید سفوف کے بھرے پولی تھن کے دس بارہ لفافے تھے۔ یہ ہیروئن تھی، افیون یا کچھ اور؟ اس کا مجھے اندازہ نہیں لیکن تھی نشہ آور شے کیونکہ دوسرے تاجک ساتھی نے فوراً اس پر اپنی چادر ڈال کر چھپا لیا۔ کمانڈر خالد کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے اس نے فارسی زبان میں طالب کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے کیا۔ دوسرے طالبان نے جلدی سے چادر میں لفافے لپیٹے اور اندر سٹور میں لے گئے۔

اب سمجھ آئی کہ اس دھندے میں ڈرگ منی بھی شامل ہے اور افغانستان سے افیون اور ہیروئن بھی "را" اور "سی آئی اے" کے ذریعے ہی طالبان میں موجود ان کے ایجنٹ ساری دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ یہ بڑی لرزہ خیز سچائی ہے لیکن اسے قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ میں نے پہلے کی طرح اس پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کوئی تجسس نہیں دکھایا۔ ہونٹوں کو سی لیا۔ چہرے کو نارمل رکھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ڈالرز میں نے ابھی تک نہیں گنے تھے۔ انہیں میں نے اپنے کرتے کی لمبی جیب میں رکھ لیا۔

سیٹلائٹ فون اندر کمرے میں اپنے بیگ میں رکھ لیا اور معمول کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ ہمیں طالبان کے مختلف گروپوں کے درمیان اختلافات کی خبریں ملتی رہتی تھیں اور اب مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ میں طالبان کے بجائے خود کو کسی جرائم پیشہ گروہ کا ممبر سمجھ رہا تھا۔ پچھتاوے کی آگ مجھے جھلسا رہی تھی.....!!

○

وہ رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دی۔ اب یہاں ایک لمحہ گزارنا بھی میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ دو دن اور تین راتیں اس کیفیت کی نذر ہو گئے۔ تیسرے دن ہمارے ٹھکانے پر خاصی ہلچل تھی۔ معلوم ہوا کہ کل طالبان ایک چینی انجینئر کو اغوا کر کے لائے ہیں جسے آگے پہنچانا ہے لیکن پیرا ملٹری فورسز نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر فی الوقت فرار کے راستے بند کر دیئے تھے۔

اس لمحے میں نے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا اب زندگی کا کوئی مقصد تو رہا نہیں۔ یہاں طالبان شک ہونے پر مجھے مار ڈالیں گے اور اپنے شہر میں ایجنسیوں والے دانت نکالے میرے منتظر ہیں۔ میں نے فرار تو ہونا ہی ہے لیکن اب اکیلے نہیں۔ اس چینی انجینئر کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اگر میں اسے لے کر قریبی پوسٹ تک جو یہاں سے بمشکل پانچ کلومیٹر دور ہو گی پہنچ گیا تو ممکن ہے اپنے پچھتاوے کا کسی حد تک خاتمہ کر سکوں اور کفارہ ادا کر کے اپنا ضمیر مطمئن کر لوں۔ ممکن ہے اس طرح مجھے پاکستانی حکومت کی ایجنسیوں سے نجات مل جائے۔ میرا ضمیر اس لحاظ سے ضرور مطمئن تھا کہ ابھی تک میں حکومت پاکستان کے خلاف کسی سرگرمی کا حصہ نہیں بنا نہ ہی میں نے کسی غیر ایجنسی کی غلامی اختیار کی ہے۔ میری حالت تو طوفان کی زد میں آئی اس کمزور کشتی کی سی تھی جس کے بادبان ٹوٹ چکے ہوں اور سمندر کی لہریں اسے ہوا کی

Uploaded By Muhammad Nadeem

سمت میں بہا کر لے جا رہی ہوں۔

یرغمال بنائے گئے چینی انجینئر کو ان لوگوں نے ایک کمرے کے کونے میں رکھا ہوا تھا جسے باہر سے تالا لگا تھا کیونکہ یہ کمرے کچے مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ ان میں عارضی طور پہ کچھ ہو بھی چکا تھا لیکن یہاں ایسا ممکن نہیں تھا۔ چاروں طرف طالبان موجود تھے۔ میری رسائی اس تک ممکن نہیں تھی اور ایسا ہوتا بھی تو وہ میری زبان نہ سمجھ سکتا۔

بہر حال مجھے امید تھی کہ قدرت مجھے اپنے گناہوں کے کفارے کا موقعہ ضرور عطا فرمائے گی۔ میں اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوا۔ اب بھی میں خلوص دل سے یہی دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ مجھے اس توفیق سے نواز دے۔ عشاء کی نماز کے بعد سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ ہمیں ابھی تین دن مزید آرام کرنا تھا۔ طالبان اپنے معمول کے گشت پر نکل گئے۔ کمانڈر خالدان کے ساتھ جا چکا تھا۔ یہاں آٹھ دس طالبان، میں اور انجینئر رہ گئے۔ طالبان کمروں کی چھت پر بچھی چارپائیوں پر آرام کرنے لگے جبکہ میں اور دو ساتھی نیچے رہ گئے۔

''اسے کھانا دے دیں کہیں بھوک سے مر ہی نہ جائے''۔ ایک افغانی نے کہا، میں چونکا، یہی بہترین موقع تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے سے چاول، اور شوربہ لے کر آیا۔ دوسرا افغانی جس کے پاس تالے کی چابی تھی اس کے ساتھ چلا اور میں اپنی گن سنبھال کر بظاہر ان کی حفاظت کے لئے ان کے پیچھے چلا جبکہ دونوں گدھے اپنی گنیں وہاں چھوڑ گئے۔ ان کی یہ غلطی ہی میرے کام آ گئی۔ دروازہ کھول کر کھانے والا طالب اندر گھسا دوسرے نے اس کے تعاقب میں ٹارچ جلائی اور ہم تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

O

Uploaded By Muhammad Nadeem

تین عمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئے۔ میں نے اپنی گن کا زوردار بٹ پہلے کھانا لے جانے والے کے سر پر مارا۔ دوسرا حملہ حیران و پریشان ٹارچ بردار پر کیا۔ دونوں کو کاری وار لگے تھے اُن کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ ایک کے سر سے تو خون کا فوارہ چل رہا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ سنبھالی اپنی کمر سے بندھے ایمرجنسی چاقو سے چینی انجینئر کے ہاتھوں اور ٹانگ میں بندھی رسیاں کاٹیں جو تشکر آمیز اور حیران کن نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہماری گاڑیاں عموماً چابی سمیت کھڑی ہوتی ہیں اور امید کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ میں نے انجینئر کی طرف دیکھا وہ بالکل نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ بہت بہادر آدمی لگتا تھا، ورنہ ایسے حالات میں تو اچھے بھلوں کی ٹانگیں لڑکھڑا جایا کرتی ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا کر میرا شکریہ ادا کیا۔

میں نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، اس کی طرف دیکھا اور اپنی گن اس کی طرف بڑھائی جو اس نے تھام کر مجھے انگریزی میں کہا کہ میں اس کا استعمال جانتا ہوں۔ ''ویل ڈن'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر اگنیشن میں چابی گھمائی اور ہیڈ لائٹس جلائے بغیر گاڑی اس راستے پر ڈال دی جو قریبی سڑک تک جاتا تھا۔ چھت پر موجود طالبان کے تو یہ وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ نیچے ایسی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ ڈالروں والا لفافہ، سیٹلائٹ فون، پن گن، ایمرجنسی چھرا اور دو لوڈ میگزینیں تھیں۔ میرا حوصلہ اس بات سے دوچند ہو گیا کہ انجینئر گن کا استعمال جانتا ہے۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں دھرا لوڈ پستول میں نے اپنے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ لیا اور گاڑی بھگا دی۔ اس حادثے کا علم چھت پر موجود طالبان کو میرے فرار کے شاید چار پانچ منٹ بعد ہوا ہو گا کیونکہ وہ اونچی آواز میں چھت پر ریڈیو سے خبریں سن رہے تھے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مجھے اپنے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی لیکن اب میں ان کی زد سے نکل چکا تھا جب تک وہ لانچر یا بڑی گن ان ایکشن کرتے ہم ان کی رینج سے نکل گئے۔ قریباً پانچ میل تک مجھے کچا راستہ طے کرنا تھا۔ میں اللہ سے دعا مانگ رہا تھا کہ طالبان کی کوئی گشتی پارٹی اس طرف نہ نکلی ہو۔ اللہ نے میری دعا قبول کی راستے میں صرف تین مرتبہ میں نے ہیڈ لائٹس کے "ڈپر" مار کے سامنے کا راستہ دیکھا اور چاند ستاروں کی روشنی میں سڑک پر آ گیا۔

اس سڑک پر ہمارا معمول کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس طرف طالبان نے گھات لگائی ہوگی لیکن ان کے پاس یہاں گاڑی ہونے کا امکان نہیں تھا۔ سڑک پر میں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں کیونکہ یہاں رات کو ایس۔ سی کا گشت بھی ممکن تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد ہم ان تک پہنچ جائیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے قریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ سڑک پر گری نظر آئی جس کا مطلب تھا کہ ہم طالبان کے ناکے میں پھنسنے والے ہیں جنہیں اب تک گاڑی اور انجینئر کے اغوا و فرار کا علم ہو چکا ہوگا۔ شاید انجینئر نے بھی درخت کی شاخ دیکھ لی تھی۔ یہ "فورویل" گاڑی تھی اور مجھے امید تھی کہ انشاءاللہ ہم یہ رکاوٹ عبور کر لیں گے، میں نے انجینئر کی طرف دیکھا وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاید میرا عندیہ بھانپ گیا تھا "نو پرابلم" اس نے مضبوط ارادے سے کہا۔

غیر ملکی ہونے کی وجہ سے اس نے سیٹ سنبھالتے ہی بیلٹ باندھ لی تھی جو ہم نے کبھی نہیں باندھی تھی۔ میں نے لائٹ آف کی اور گاڑی کو طاقتور گیئر پر کر دیا۔ طالبان کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ ان کی گاڑی ہے انہوں نے کوئی عام گاڑی ہی سمجھ کر گھات لگائی ہوگی۔

درخت کی شاخ سے ٹکرا کر گاڑی کو ہلکا سا جھٹکا ضرور لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جمپ لگا کر شاخ عبور کر گئی جس کے ساتھ ہی ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی چونکہ لائٹس آف تھیں، اس لئے طالبان بھی اندازے سے لیکن دیوانہ وار گولیاں برسا رہے تھے۔ یوں تو میں نے زندگی میں متعدد مرتبہ موت کو شہ رگ سے قریب دیکھا ہے، لیکن یقین مانئے اس روز موت ہم دونوں کو چھو کر گزر گئی درجنوں گولیاں گاڑی میں دھنسیں کوئی بھی ٹائر میں نہیں لگی، البتہ پچھلی طرف موجود ٹینی دھماکے سے پھٹ گئی۔ جس صورتحال سے میں گزر رہا تھا اس میں بڑوں بڑوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ پتہ پانی ہونے لگتا ہے، لیکن اللہ کی خصوصی مدد بھی حاصل تھی اور میرے لئے قابل اطمینان بات یہ تھی کہ انجینئر کے حواس نہ صرف قائم تھے بلکہ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے

تین چار فائر بھی کر دیئے۔ میں نے اب ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں اور گاڑی کی ایمرجنسی سگنل بھی لگا دیئے کیونکہ اس کے علاوہ اس وقت آگے سے آنے والی ایف۔سی پوسٹ کو اپنے متعلق بتانے کا میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

خدا کا شکر ہوا کہ اس کے بعد قریباً دس منٹ کے سفر میں ہمیں کسی اور خطرناک صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ گاڑی میں نے سیدھی پوسٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی۔ ہم دونوں نیچے اترے اور میں نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیئے، یہی عمل انجینئر نے دہرایا۔ چند لمحوں میں ہمیں ایف۔سی کے چوکس اور مستعد جوانوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ انجینئر کو دیکھتے ہی پہچان گئے اور اس سے پہلے کہ مجھ سے کوئی سوال کریں انجینئر نے انہیں انگریزی میں میرا تعارف ایک "محسن" کی حیثیت سے کروا دیا جو مجھے اغوا کاروں کے چنگل سے اپنی جان پر کھیل کر نکال لایا تھا۔ یہ کہانی اس نے تواتر سے پہلے پوسٹ کے باہر پھر پوسٹ کے اندر مقامی انچارج کیپٹن صاحب کو سنائی، جنہوں نے میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر کو فوراً اطلاع دینے لگے۔

لیکن..... خطرناک مرحلہ تو اب آیا تھا۔

ایف۔سی والوں نے میری تلاشی نہیں لی۔ ڈالر ابھی تک میرے زیر جامے میں محفوظ تھے، میں نے انہیں جو بیان لکھایا اس میں بتایا کہ میں چھوٹا سا بیوپاری ہوں پنجاب کے ایک شہر میں کام کرتا ہوں اور رسم و رواج کے معمول کے مطابق اپنی payment وصول کرنے آیا تھا کہ اغوا کاروں کے ہتھے چڑھ گیا، جو میرا بھی تاوان وصول کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ان کی حراست میں تیسرا دن تھا کہ یہ انجینئر صاحب وہاں تشریف لے آئے۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور فرار کی کوشش کی چونکہ مجھے اس علاقے کی سمجھ بوجھ تھی اور اغوا کاروں کو اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ میرا تاوان میرے گھر والوں سے وصول کر لیں گے، اس لئے وہ میری طرف سے مطمئن تھے۔

میں نے ایف۔سی والوں سے درخواست کی کہ مجھے کسی انعام و اکرام کی خواہش نہیں نہ ہی میں اپنی تشہیر چاہتا ہوں کیونکہ ہم کاروباری لوگ ہیں اگر میرے متعلق ایسی بات سامنے آئی تو ہمارے بزنس کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ اس لئے برائے مہربانی مجھے رہا کر دیں اور کسی بھی محفوظ شہر تک پہنچا دیں، میں اس واقعے کا ساری زندگی کسی سے ذکر بھی نہیں کروں گا۔ کیپٹن صاحب نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا مجھے پھر شاباش دی۔ حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے لیکن

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں بضد رہا کہ اگر وہ مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں تو براہ کرم میری بات مان لیں۔ جس پر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے لیکن ہیڈ کوارٹر سے جو ٹیم آ رہی ہے اس سے ملنے کے بعد ہی مجھے کسی محفوظ مقام تک پہنچائیں گے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ اس ٹیم میں جو بقول کیپٹن صاحب کے ہیڈ کوارٹر سے آ رہی ہے انٹیلی جنس کے لوگ شامل ہوں گے۔ بال کی کھال اتارنا جن کی عادت ہے اور وہ الٹے سیدھے سوالات سے میرا ناطقہ بند کر دیں گے۔ کیپٹن صاحب نے میرے ساتھ ایک مہربانی ضرور کی کہ فون پر میرا رابطہ اپنے گھر والوں سے کروا دیا۔ میں نے بھائی صاحب سے بات کی اور اپنی دو تین باتوں ہی میں بظاہر یہ سمجھا دیا کہ انہیں کیا کہنا یا کرنا ہے؟ خدا جانے انہیں میری بات کی سمجھ آئی یا نہیں۔ شاید وہ نیند سے بیدار ہو کر میرا فون سن رہے تھے، بہرحال خیریت یہ گزری کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

کپتان صاحب نے ہم دونوں کو کھانا کھلایا۔ چائے پلوائی اور آرام کرنے کی پیشکش کی۔ چینی انجینئر کی بات اس کی ایمبیسی والوں سے کروائی گئی وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ چینی انگریزی اور اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ مجھے اس نے جذباتی انداز میں پانچ چھ مرتبہ گلے لگایا جس سے کم از کم پوسٹ والوں کو ہماری کہانی پر ضرور یقین آ گیا۔ کپتان صاحب نے ہمیں آرام کرنے کی پیشکش کی لیکن کم از کم میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔

○

علی الصبح ہم دونوں کو نزدیکی ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا، جہاں بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد ہی دو ہیلی کاپٹر یکے بعد دیگرے لینڈ کئے جن میں چینی اور مقامی اعلیٰ حکام تشریف لائے تھے۔ میں زندگی بھر اس چینی انجینئر کا احسان نہیں اتار پاؤں گا جس نے آنے والوں کو باقاعدہ بریفنگ کے انداز میں میری کہانی دوبارہ سنائی، جس پر میں نے ان کی نظروں میں اپنے لئے احترام پایا۔ سفارتکاروں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے انعام سے نوازنا چاہتے تھے لیکن فی الوقت میرے مسائل کچھ اور تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر میں آنے والی انٹیلی جنس کے اعلیٰ آفیسر سے بھی یہی درخواست کی اور اسے بتایا کہ میرے لئے ان کا سب سے بڑا انعام یہی ہوگا کہ مجھے محفوظ شہر میں پہنچا دیں میں مرنے تک یہ بات اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا۔

بریگیڈیئر صاحب حیرانگی سے میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ انہوں نے علیحدگی میں

شاید اپنی ہائی کمان سے بات کی ہوگی۔ بہرحال اللہ نے مجھ پر کرم کیا اور میری خلاصی ہوگئی۔ انٹیلی جنس والوں نے مجھے زبردستی دس ہزار روپیہ کیش دے دیا اور مجھے راولپنڈی بس اڈے پر پہنچا دیا۔ انہوں نے میرے گھر والوں سے بات کر لی تھی۔ میرا ایڈریس وغیرہ نوٹ کر لیا تھا اور مجھ سے جلد ہی رابطے کا کہہ دیا تھا، کیونکہ بقول ان کے وہ مجھے اس ''کارنامے'' پر بڑے انعام سے نوازنا چاہتے تھے جبکہ میرے لئے سب سے بڑا انعام یہی تھا کہ انہیں میرے ماضی کی خبر ابھی تک نہیں ہوئی تھی، میری اصلیت سے بے خبر وہ مجھے وہی سمجھ رہے تھے جو میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے سمجھیں بصورت دیگر میرے لئے شاید لاینحل مسائل پیدا ہو جاتے۔

انٹیلی جینس والے تو مجھے اپنی گاڑی میں میرے گھر چھوڑنے پر اصرار کر رہے تھے لیکن میرے بضد ہونے پر انہوں نے شاید مجھے ''پاگل'' جان کر میری جان چھوڑ دی اور مجھے بادل نخواستہ ایک بس میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔ روانگی پر انہوں نے مجھے فون نمبر اور گھر پہنچتے ہی اطلاع کرنے کی ہدایت کی تھی۔ میرے ''ناں ناں'' کرنے کے باوجود انہوں نے بطور خاص مجھے بس میں سب سے آگے سپیشل سیٹ لے کر دی جس پر میں اکیلا سفر کر رہا تھا۔

بس کی روانگی تک میری دھڑکنیں بے قابو رہیں۔ مجھے ایک ہی سوچ بار بار پریشان کر رہی تھی کہ اگر انہیں میری اصلیت کا علم ہوگیا تو میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ دل تو کہتا تھا کہ میرے حالیہ کارنامے کی وجہ سے مجھے معافی مل جائے گی لیکن دماغ نہیں مانتا تھا، جب میں نے کچھ کیا نہیں تھا صرف افغانستان میں قید کاٹنے کے ناقابل معافی جرم کی سزا مل رہی تھی تو اب نجانے وہ مجھ سے کیا سلوک کرتے! یہ خوف میری جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

بس روانگی کی قریباً تین گھنٹے بعد ایک شہر میں رکی اور میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح باہر آ گیا، اس کے بعد دوبارہ میں بس کی طرف نہیں گیا یہاں سے ایک ٹیکسی کے ذریعے میں نے قریبی شہر تک رسائی حاصل کی وہاں سے فون کر کے بھائی صاحب کو اپنی خیریت سے مطلع کیا اور انہیں بتایا کہ میں شاید ابھی گھر آ کر ملاقات نہ کر سکوں اور جیسے ہی کسی ٹھکانے کا بندوبست ہوتا ہے آپ کو وہاں بلا لوں گا۔ بھائی صاحب نے میری بات پر صاد کیا۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ کسی کو میرے متعلق کچھ نہ بتائیں اور یہی کہتے رہیں کہ انہوں نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور میرے معمولات کی کچھ خبر نہیں رکھتے۔ بادل نخواستہ انہوں نے میری حفاظت کے پیش نظر میری یہ بات بھی مان لی اور میں مطمئن ہو کر ایک بڑے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

شہر میں میرا ایک سابق جہادی ساتھی علی شیر رہتا تھا، ہم دونوں طالبان جہاد میں لگے ہوئے تھے خوش قسمتی سے وہ قید ہونے سے بچ گیا اور فرار ہو کر اب پاکستان میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ علی شیر کا تعلق مقبوضہ کشمیر میں جہاد کرنے والی ایک اہم تنظیم سے تھا۔ آپ اس تنظیم کا نام ''تحریک جہاد'' سمجھ لیجئے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے میرے لئے بعض مقامات اور افراد کے صحیح نام دینا ممکن نہیں، البتہ واقعات مکمل صحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

O

علی شیر کو میں نے اس کے شہر پہنچ کر PCO سے فون کیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اس نے مجھے بس اڈے ہی میں رکنے کو کہا اور تھوڑی دیر بعد ایک موٹر سائیکل پر مجھے لینے آ گیا۔

''افضل خان تم''؟

اس نے جذباتی انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو کر کہا۔

''ہاں یار..... تم نے مجھے یاد نہیں رکھا..... لیکن میں تو تمہیں نہیں بھلا سکتا''۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''نہیں افضل خان تم میرے جہادی ساتھی اور بھائی ہی نہیں بلکہ میرے محسن بھی ہو، تم نے میری اس وقت جان بچائی تھی جب.....''

''بس۔ بس.....'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''بار بار اس کا تذکرہ نہ کیا کرو۔''

علی شیر ماضی کے اس واقعے کا حوالہ دے رہا تھا جب ہم دونوں پنجشیر کے محاذ پر شمالی اتحاد کے گھیرے میں آ گئے تھے میں نے آخری لمحات تک اس کا ساتھ دیا اور اس سے پہلے کہ شمالی اتحاد والے ہم تک پہنچیں۔ اللہ نے ہماری مدد کی۔ جب مقامی طالبان ہماری مدد کو پہنچ گئے۔ جنہوں نے ہم دونوں کو وہاں سے نکال لیا۔ علی شیر کچھ زخمی تھا، اسے واپس بھجوایا گیا جس کے بعد ہم آج ملاقات کر رہے تھے لیکن ہم نے اپنا ٹیلی فونک ملاقاتوں کا سلسلہ برقرار رکھا تھا۔ اسے میرے حالات کی خبر تھی اور ایجنسیوں کی طرف سے میرے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا اس پر متعدد مرتبہ اس نے مدد کی پیشکش کی تھی اور بتایا تھا کہ ان کی تنظیم کو ایجنسیوں کی معاونت حاصل ہے اگر میں اس کے پاس آ جاؤں تو محفوظ رہوں گا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ تب میری غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا تھا کہ میں خوامخواہ کسی پر بوجھ بنوں، لیکن اب معاملات دوسرا رُخ اختیار کر چکے تھے۔

میں علی شیر کی موٹر سائیکل پر اس کے ٹھکانے پر آ گیا۔ یہ مضافاتی علاقے کی ایک حویلی تھی جہاں ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔

جس شخصیت نے یہاں میرا استقبال کیا وہ کمانڈر خان بھائی تھے.....! ہم دونوں جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئے، کمانڈر خان سے بہت دیر بعد رابطہ ہو رہا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق تو خود انہیں ایجنسی نے غائب کر دیا تھا۔ انہیں زندہ اور بخیر و عافیت دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

رات دیر گئے تک ہم تینوں باتیں کرتے رہے میں نے انہیں اپنے متعلق پورا سچ نہیں بتایا تھا معلوم نہیں کس طاقت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ شاید قدرت ابھی مجھے کسی اور امتحان میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ شاید ابھی میری آزمائش باقی تھی۔ بہرحال دونوں نے مجھے کہا کہ اب میں پاکستان نہ جاؤں، کیونکہ حالات بہت خراب ہیں اور جن پر معمولی شک بھی ہو انہیں ایف بی آئی کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو انہیں گوانتاموبے لے جاتے ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں بھی اب یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے بھی ہم جس مقصد کے لئے افغانستان جہاد کرنے گئے تھے اب وہ حالات نہیں رہے۔ اس کھیل میں ایسے کھلاڑی آ گئے ہیں جنہوں نے مجاہدین کو دہشت گرد بنا دیا ہے۔

عشاء کے بعد دیر گئے تک ہم باتیں کرتے رہے..... علی شیر نے مجھے بتایا کہ وہ اگلے تین چار روز میں بھائی صاحب کو محفوظ طریقے سے یہاں تک پہنچا دے گا جس پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

صبح اذان کی آواز سے آنکھ کھلی.....!

کمرے میں خان بھائی اور میں سو رہے تھے۔ علی شیر شاید کہیں اور چلا گیا تھا۔ ہم نے نماز وہیں ادا کی۔ کمرے سے ملحقہ کچن میں خان بھائی نے مجھے بتایا کہ اس نے علی شیر کی ''تحریک جہاد'' میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اس طرح ایک تو اس کی ایجنسیوں سے جان چھٹی ہوئی ہے اور وہ جہاد میں بھی مصروف ہے جو ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اس نے پہلے بھی یہی دعوت دی اور کہا کہ افغانستان میں تو حالات روز بروز بدل رہے ہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی کون غلط ہے اور کون صحیح اور جہاں تک پاکستان کی طالبان تحریک کا تعلق ہے تو یہ لوگ پاکستان سیکیورٹی ایجنسیوں سے جنگ کر رہے ہیں، جس کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں، نہ ہی اس کی غیرت اور ایمان یہ برداشت

Uploaded By Muhammad Nadeem

کرتے ہیں کہ وہ پاکستان سے جنگ کریں۔

خان بھائی نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ میں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملا دی اور بتایا کہ میں ایسے واقعات کا عینی شاہد ہوں اور اب میں بھی یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ واپس افغانستان نہیں جاؤں گا۔

''اللہ بہتری کے اسباب پیدا کریں گے۔''

انہوں نے مجھے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

نیا باب

انسان اپنی دانست میں کتنا ہی چالاک ہوشیار بنے لیکن وہ تقدیر کے بچھائے جال سے نکل نہیں سکتا۔ نیک لوگ اسے آزمائش کہتے ہیں اور ہم جیسے کمزور اور گناہ گار اسے شاید تقدیر کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ خدا جانے وہ زندگی کا کون سا کمزور لمحہ تھا جب میرا تعارف بانو سے ہوا۔

اس روز معمول کے مطابق میں اور علی شیر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے جب خان بھائی کی آمد دو مہمانوں کے ساتھ ہوئی۔

''السلام علیکم''... خان بھائی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی عادت کے مطابق بلند آواز سے کہا اُن کے ساتھ دو اور مہمان تھے۔ میرے چونکنے کی وجہ اُن کے ساتھ آنے والے مہمان ہی تھے جن میں سے ایک نوجوان اور دوسری خاتون تو میں نہیں کہوں گا لڑکی تھی۔

شاید ان مہمانوں کی آمد کا علم علی شیر کو تھا کیونکہ اس نے ان کی آمد پر کوئی حیرت ظاہر نہیں کی البتہ میرے لئے اس کمرے میں کسی خاتون کی آمد اچنبھے کی بات ضرور تھی۔

میں نے سلام کا جواب دے کر احتراماً ان کے لئے جگہ خالی کی تو ساتھ آنے والے نوجوان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

''ارے نہیں بھائی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم کوئی غیر نہیں کوئی مہمان نہیں۔ آپ کے ساتھ ہیں''..... وہ مسکراتے ہوئی میری طرف متوجہ ہوئی۔

میں نے جواب طلب نظروں سے خان بھائی کی طرف دیکھا جو خود بھی مسکرا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کروں انہوں نے خود ہی کہا:

''افضل یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ فاروقی بھائی اور یہ ہیں بانو بہن''۔

انہوں نے دونوں مہمانوں کا تعارف کروایا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ابھی تک بانو نے خود کو جس بڑی سی چادر میں لپیٹ رکھا تھا اس کے ایک کونے سے اپنا چہرہ بھی چھپایا ہوا تھا، لیکن کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا چہرہ ننگا کر دیا۔

''بہت گرمی ہو رہی ہے۔''

اس نے بظاہر یہی تاثر دیا۔

میں نے پھر استفسار بھری نظروں سے خان بھائی کی طرف دیکھا۔

''فضل یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فاروقی صاحب اور بانو صاحبہ سے ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ دونوں کا تعلق بھارت کی جہادی تنظیم ''مسلم برگیڈ'' سے ہے۔ ان کے کارناموں سے تو تم آگاہ ہو گے ہی؟

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

کیونکہ ان دنوں بھارت میں اس تنظیم سے متعلق خاصا شور و غوغا ہو رہا تھا اور وہاں ہونے والے اکثر تخریب کاری کے واقعات میں ان ہی کا نام آتا تھا۔

''دونوں، مسلم برگیڈ'' کے روح رواں ہیں۔ بانو بہن نے الحمد اللہ مکمل جہادی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ خصوصاً بارڈر لگانے میں تو انہیں کمال حاصل ہے۔ فاروقی بھائی افغان جہاد میں حصہ لے رہے ہیں اور اب الحمد اللہ بھارتی مسلمانوں کے لئے امید کی کرن بن کر طلوع ہوئے ہیں۔ فی الوقت میں اس سے زیادہ ان کا تعارف نہیں کروا سکتا۔ انشاء اللہ جلد ہی ہم ان کے ساتھ مل کر اپنے مظلوم مسلم بہن بھائیوں کے لئے جہاد کریں گے۔''

''انشاء اللہ'' بے ساختہ میرے منہ سے دوبارہ نکلا۔ اس کی وجہ شاید میرا جذبہ کم اور بانو زیادہ تھی جو مسلسل مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں جس پس منظر سے یہاں تک پہنچا تھا وہاں شاید ایسی باتوں کا سرے سے تصور ہی نہیں تھا۔ یا پھر حالات نے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی کہ دھیان ایسی باتوں کی طرف جاتا۔ والدہ کی شدید خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے..... لیکن میں نے زندگی کے اس پہلو پر شاید کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

خدا جانے میں کس کمزور لمحے کی گرفت میں آ گیا تھا۔ بانو کی طرف دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں کوئی جھنجھناہٹ ہو رہی ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں میں کیا سحر تھا جس نے مجھ پر صندور پھونک دیا اور میں تو جیسے

سناٹے میں آ گیا۔

''یوں تو ساری دنیا کے مسلمان ہی مظلوم اور مقہور ہیں کہیں ان پر اپنے ظلم ڈھا رہے ہیں اور کہیں غیروں نے انہیں زندہ درگور کر رکھا ہے۔ لیکن انڈین مسلمان بطور خاص ہماری مدد کے مستحق ہیں۔ گجرات کے واقعات تو آپ کے علم میں آ گئے لیکن آپ نہیں جانتے گجرات جیسا کوئی نہ کوئی سانحہ آئے روز بھارت کے کسی نہ کسی شہر میں ہوتا رہتا ہے۔ مسلمانوں پر زندگی کے تمام دروازے ایک ایک کر کے بند کئے جا رہے ہیں اور عملاً ہم وہاں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو جیل والوں کے احکامات کے بہر صورت پابند ہوتے ہیں اور پابندی نہ کرنے کی صورت میں انہیں جو سزا دی جاتی ہے اس کا تصور ہی محال ہے۔''

بانو بول رہی تھی اور اس کا ایک ایک لفظ نیزے کی انی کی طرح میرے دل میں اتر رہا تھا۔ جس درد بھرے لہجے میں اس نے بات کی اس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ سچی بات ہے میرا تو جی چاہتا تھا کہ ابھی ہاں سے اٹھوں بانو کے ساتھ بھارت جاؤں اور جہاد شروع کر دوں۔

شام تک وہ لوگ ہمارے ساتھ رہے.....!

اس دوران بانو نے خود کو بڑی سے چادر سے بھی ایسے غیر محسوس انداز میں الگ کر لیا تھا کہ کسی کو کچھ اندازہ ہی نہ ہو پائے ..... لیکن جیسے جیسے اس کے جسمانی خطوط نمایاں ہو رہے تھے میرے تن بدن میں سنسنی پھیل رہی تھی اور یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

کاش! تب میں کچھ سمجھ پاتا..... سوچتا ہوں آج زندگی نے جس مقام تک پہنچا دیا ہے اس میں صرف تقدیر ہی کو ذمہ دار ٹھہراؤں یا پھر اپنی عقل کا بھی ماتم کروں؟ کیونکہ یہ سب کچھ جو میرے ساتھ گزرا بقائمی ہوش و حواس گزرا تھا..... لیکن تب مجھ پر جہاد کا غلبہ طاری تھا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں علم ہوا کہ ''جہاد'' جیسے مقدس الفاظ کا ہم کتنی بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں اور اصل میں جہاد ہوتا کیا ہے؟

لیکن ..... میں بھی ان بدبختوں میں شامل ہوں جو سب کچھ لٹانے کے بعد ہوش میں آتے ہیں۔ جب لٹانے کو بھی کچھ باقی نہیں رہتا صرف پچھتاوا رہ جاتا ہے۔ جواب میرے جان کو آ گیا ہے۔

O

شام تک دونوں ہمارے ساتھ رہے..... خان بھائی اور علی شیر نے ان کے لئے بطور خاص

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بازار سے کھانا منگوایا تھا۔ دونوں فاروقی کو ساتھ لے کر بازار گئے تھے اور بانو کو یہاں چھوڑ گئے۔ تب تو میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب کسی منصوبے کا حصہ ہے لیکن بعد میں اندازہ ہو گیا کہ شطرنج کا پہلا مہرہ تو اسی روز چلا تھا جب بانو سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

''بہت تعریف سنی تھی آپ کی؟''

بانو نے دونوں کی روانگی کے کچھ دیر بعد میری مسلسل خاموشی توڑنے کے لئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی نہیں میں تو کسی قابل نہیں''..... میں نے قدرے شرماتے اور گھبراتے ہوئے کہا۔

''جانے دیجئے۔ آپ کے کارنامے تو ہمارے مجاہدین ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ نے دوستم کی جیل بھی کاٹی ہے۔''

اس نے اپنی معلومات جتاتے ہوئے کہا۔

''ہم جس راستے کے مسافر ہیں اس میں جیلیں اور سزائیں ہی ملتی ہیں۔''

میں نے مرنجان مرنج طریقے سے کہا۔

''اور یہ زمانہ آپ کو دے بھی کیا سکتا ہے۔ بڑی کم ظرف دنیا ہے خصوصاً ہمارے مسلمان حکمران''.....

بانو کے لہجے میں تلخی اتر آئی تھی۔

''آپ بجا فرماتی ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر انسان اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے۔ اگر ہم دنیا سے مدد مانگیں تو ملے گا بھی کیا؟ اللہ کے ہاں! البتہ اس کا بہت بڑا اجر موجود ہے۔''

میں نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''بانو غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید وہ میرے الفاظ کی معنویت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ ان کی سچائی کو پرکھ رہی تھی اور شاید یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مستقبل میں یہ گدھا ہماری سواری کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ہماری گفتگو قریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دوران اس نے میرا بالکل معصومانہ انداز سے مکمل اور بھرپور تعارف حاصل کر لیا تھا جس میں میرے بچپن سے اب تک کے حالات، گھر اور رشتہ داروں کی تفصیلات اب تک کے میرے جہادی کارنامے اور میں نے بے وقوفوں کی طرح اسے ایک ایک بات بالکل اس طرح بتائی تھی جیسے پہلی جماعت کے بچے کو سمجھایا

جاتا ہے۔

عام حالات میں شاید بانو کو یہ معلومات ساری زندگی حاصل نہ ہو پاتیں جو اسے یہاں ڈیڑھ دو گھنٹے میں مل گئی تھیں۔ آج سوچتا ہوں کہ ایجنسیوں والے مار مار کر ہماری کھال اتار دیا کرتے تھے، لیکن ہم انہیں کبھی ان کی مرضی کے جوابات نہیں دیتے تھے خصوصاً اپنی ذاتی زندگی سے متعلق تو ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لاتے تھے جبکہ یہاں گنگا ہی الٹی بہہ گئی تھی۔

میں نے محض بانو کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے بعض ایسی باتیں بھی بتا دی تھیں جو اس نے مجھ سے پوچھی ہی نہیں تھیں۔

اس کی وجہ کیا تھی؟

میں نے جب بھی ایمانداری سے اس سوال کا جواب اپنے آپ سے چاہا اور اپنا تجزیہ کیا تو مجھے یہی جواب ملا کہ اس وقت میرے دل و دماغ پر دراصل جنسیت کا غلبہ طاری تھا۔ آپ اسے جو بھی نام دے لیں بعد میں اسے میں بھی محبت کہنے لگا تھا کیونکہ بانو سے ملنے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مجھے تو اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بنایا سجایا ہوا نہیں تھا لیکن خدا جانے اس میں کیا سحر تھا جس نے مجھے جکڑ لیا اور میں اُلو بن گیا۔

بانو نے میری اصلیت اگلوانے کے لئے بڑا شاندار طریقہ اپنایا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارت میں حالات افغانستان جیسے نہیں وہ بڑی سیکولر سوسائٹی ہے جہاں جہاد کے لئے بھی صرف مردوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں خواتین بھی مجاہدین کے شانہ بشانہ مصروف جہاد ہیں۔ خصوصاً کمیونی کیشن اور مال برداری کا شعبہ انہوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔ اس نے اپنے بھی دو تین کارنامے جو یقیناً جھوٹ تھے سنا کر مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔

بانو سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو تاریخی رومانی ناولوں کا ایسا کردار سمجھنے لگا تھا جو زمانہ قدیم میں دوران جہاد کسی صحرائی دوشیزہ کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے اور ناول کے اختتام پر دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان ناولوں میں ہیرو مسلمان مجاہد اور ہیروئن کوئی غیر مسلم دوشیزہ ہوا کرتی ہے، جبکہ یہاں دونوں کردار مسلمان تھے۔

بانو کی اچانک آمد پر تو میں قدرے گھبرا گیا تھا اور مجھے بڑا عجیب بھی لگا تھا لیکن اب میرا جی چاہتا تھا کہ خان بھائی اور علی شیر واپس نہ آئیں اور میں اسی طرح اپنے سامنے بیٹھی اس قلوپطرہ کو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

دیکھتا رہوں۔اس سے باتیں کرتا رہوں جس کے تیکھے نین نقش اور سانولی رنگت نے مجھے ڈس لیا تھا اور اب ناگن کا زہر میرے سارے جسم میں پھیلنے لگا تھا لیکن..... ایسا ممکن نہیں تھا۔کم از کم فی الوقت ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد فاروقی، علی شیر اور خان بھائی کھانے کے پیکٹوں سے لدے پھندے واپس آ گئے۔

میں نے معمول کے مطابق چاہا کہ کھانا خود پلیٹوں میں رکھ کر مہمانوں کے سامنے رکھوں ہم ایسے ہی کرتے آئے تھے مجموعاً یہاں کھانا بازار سے آیا کرتا تھا، البتہ کبھی کبھی علی شیر یا میں کوئی ڈش تیار کر کے دو تین دن فریج میں رکھ کر کھاتے رہتے۔

میں ابھی بمشکل کچن میں داخل ہوا تھا کہ بانو میرے تعاقب میں آ گئی۔

''آپ؟''

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جی ہاں..... میں..... میرے خیال سے یہ خواتین کا کام ہے''..... اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم تو..... مم میرا مطلب ہے آپ تو.....''

''مہمان ہیں''..... اس نے مسکراتے ہوئے میری بات مکمل کی۔

''جی ہاں''..... میں نے سنبھل کر کہا۔

''جی نہیں''..... اس نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''دیکھئے یہ مناسب دکھائی نہیں دیتا کہ میرے ہوتے ہوئے آپ خانہ داری کے فرائض ادا کریں۔یوں بھی مجاہدین کی خدمت کرنا ہی تو میری زندگی کا حاصل ہے۔مجھے اس سے تو محروم نہ کیجئے۔''اس نے بظاہر ایسے ملتجی لہجے میں کہا کہ میں کٹ کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر میں بانو کھانا بڑے سلیقے سے پلیٹوں میں سجا کر لے آئی۔ہم نے فرشی دری پر بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھایا۔اس دوران میں چوروں کی طرح بانو کو دیکھتا رہا۔جس نے کئی مرتبہ میری نظروں کی چوری پکڑ بھی لی۔فاروقی اور میرے دونوں ساتھی بظاہر ہم دونوں سے بالکل لاپرواہ ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔انہوں نے ہم دونوں کو شاید ایک دوسرے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

کاش! مجھے تب ان باتوں کا احساس ہو جاتا اور میں اس سازش کا حصہ بننے سے رک جاتا

جس کا حصہ مجھے بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

کھانے کے بعد بانو نے بطور خاص ہمیں چائے بنا کر پلائی کیونکہ میں تازہ تازہ اس کے عشق میں مبتلا ہوا تھا، اس لئے یہ چائے بھی مجھے ظاہر ہے دنیا کی بہترین چائے لگی تھی۔

''آپ دونوں یہاں اکیلے رہتے ہیں''.....؟

اچانک ہی بانو نے مجھ سے دریافت کیا۔

''جی ہاں''..... میرے بجائے علی شیر نے جواب دیا..... ''یہ ہمارا مہمان خانہ ہے۔ٹھکانہ بھی اور سیف ہاؤس Safe House بھی۔یکنوں کے تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔''

''کھانے پکانے کا بندوبست.....؟ میرا مطلب ہے''..... بانو نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ایک دوسرے کے ہاتھوں پکے بدذائقہ کھانے کھا کھا کر اب تو عادت سی ہو گئی ہے، البتہ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ ٹھیک رکھنے کے لئے بازار سے کھانا لے آتے ہیں۔جس سے عموماً معدہ خراب رہتا ہے''..... علی شیر نے وضاحت کی۔

''ارے یہ تو بڑی غلط بات ہے بھئی..... اچھا جب تک ہمارا یہاں قیام ہے میں آپ کی یہ خدمت کرتی رہوں گی..... کیوں فاروقی بھائی''.....

بانو نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد فاروقی کی طرف ایسے دیکھا جیسے اسے حکم دے رہی ہو۔''کیوں نہیں..... کیوں نہیں..... ضرور..... ضرور..... اگر ساتھیوں کو اعتراض نہ ہو۔فاروقی نے یہ بات بطور خاص میری طرف دیکھ کر کہی تھی۔

''اعتراض تو کوئی نہیں..... لیکن اچھا نہیں لگتا..... دیکھئے ناں آخر آپ مہمان ہیں۔آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے''۔میں نے خان بھائی یا علی شیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جواب دیا۔

''یہ آپ نے کیا مہمان مہمان کی رٹ لگا رکھی ہے۔ارے بھئی! ہم مجاہد ہیں ہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔اللہ نے ہمارے ذمے ایک دوسرے کی خدمت کا فریضہ لگایا ہے۔اس سے ہم بھاگ تو نہیں سکتے ناں''۔اس لمحے بانو کا انداز بڑا محبت بھرا اور ناصحانہ تھا۔

''ہماری خوش قسمتی ہو گی اگر آپ جیسی مجاہدہ ہمارے ساتھ قیام کریں، لیکن اس گھر کی حالت آپ کے سامنے ہے''۔خان بھائی نے کہا۔

''اس کی آپ فکر نہ کیجئے''..... بانو نے جواب دیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بانو کی گفتگو اور شخصیت سے بظاہر ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ہماری کمانڈر ہے اور اس کا حکم ہمیں بہر حال ماننا ہی ہے۔ مجھے تو اس وقت تک اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہے کون؟ لیکن میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے باقی دونوں ساتھیوں کو اس سارے کھیل کا علم تھا اور وہ اس کا حصہ بھی بنے ہوئے تھے۔

اگلے روز فاروقی اور بانو ہمارے گھر آ گئے۔

دونوں کا دس روز تک ہمارے ہاں قیام رہا۔ اس دوران درجنوں مرتبہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر مجھے اور بانو کو تنہائی میں گفتگو کا موقع فراہم کیا اور ان دس دنوں میں سچی بات تو یہ ہے کہ میں بانو کا بندہ بے دام بن چکا تھا، شاید لوگ اسے محبت یا عشق کہتے ہوں لیکن حالات و واقعات اور زندگی کے تلخ تجربات نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہ سارا پاکھنڈ ہوتا ہے ہم دراصل جنسی جذبات کے غلبے کا شکار ہوتے ہیں اور فرار کے لئے اسے عشق محبت کا نام دے لیتے ہیں۔

بانو نے اس دوران بطور خاص میرا اتنا خیال رکھا کہ اب مجھے اس کی عادت سی پڑ گئی تھی اور یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی روانگی کے بعد کیا کروں گا؟ کیسے جیوں گا؟

لیکن..... اس دوران ہم نے صرف عشق محبت ہی نہیں کیا۔ فاروقی اور بانو نے ہم دونوں کو بھارت میں اپنے طریق جہاد سے آگاہ کیا۔ مقامی ماحول سے آشنائی بہم پہنچائی اور ہمارے "جذبہ جہاد" کو مسلسل مہمیز لگاتے رہے۔ انہوں نے ہم دونوں کو ذہنی طور پر اس بات کے لئے مکمل تیار کر لیا کہ ہم بھارت جا کر ہندو کے خلاف جہاد کریں گے۔ جس نے وہاں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ میں نے "دونوں" کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ خان بھائی تو اگلے ہی روز گھر چلے گئے تھے۔ یوں بھی وہ ہمارے ساتھ زیادہ دیر قیام کر کے ہمارے اور اپنے لئے سیکیورٹی مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بانو اور فاروقی کی روانگی سے دو روز پہلے خان بھائی ہمارے درمیان واپس آ گئے ہم نے اپنا پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ اب مجھے اور علی شیر کو بھارت جانا تھا جس کے لئے سارا بندوبست بانو اور فاروقی کے ذمے تھا۔ روانگی سے ایک روز پہلے انہوں نے ہمیں کچھ خطوط دیئے جو بھارت سے لکھے گئے تھے اور بتایا کہ یہ خطوط بھارتی ہائی کمیشن میں پیش کرنے پر ہمیں آسانی سے ویزے مل جائیں گے۔ فاروقی نے علی شیر اور میری ملاقات ایک مقامی ایجنٹ سے بھی کروا دی تھی جس نے ہم دونوں کے پاسپورٹ ان کی موجودگی ہی میں تیار کروا کے ہمارے حوالے کر دیئے۔ یہ سارے

Uploaded By Muhammad Nadeem

اخراجات بانو اور فاروقی نے ادا کئے۔ میرے متفکر ہونے پر وہ ایک ہی جواب دیتے کہ یہ ان کا فرض ہے اور چونکہ اب میں "علم بریگیڈ" کے ڈسپلن میں آ چکا ہوں اس لئے مجھے ان کی کسی بات پر اعتراض کا حق بھی نہیں ہے۔

جس روز انہوں نے واپس بھارت جانا تھا اس سے قبل کی قریباً ساری رات میں نے اور بانو نے گھر کی چھوٹی سے چھت پر جاگ کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے گزاری تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں کسی نامحرم سے بغل گیر ہوا۔ اس جذباتی لمحے نے جو بانو کے آنسوؤں نے پیدا کیا تھا ہم دونوں کو بے اختیار ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اچانک ہی کسی ناکردہ احساس جرم کے تابع میں اس سے الگ ہو گیا۔

صبح جب وہ ناشتے کے بعد ہم سے رخصت ہو رہے تھے تو میری آنکھوں میں رُکے آنسو بے اختیار سارے بندھن توڑ کر میرے گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے قریباً شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے اپنے رومال سے چہرہ صاف کیا اور اس بات کا بخوبی اہتمام کیا کہ میری اس کمزوری کا علم بانو کے علاوہ اور کسی کو نہ ہو۔

میں انہیں رخصت کرنے کے لئے ریلوے سٹیشن تک جانا چاہتا تھا لیکن ہماری سیکیورٹی اور احتیاط کے پیش نظر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وقت رخصت بانو نے بڑی ہوشیاری سے میرے اور اپنے لئے کمرے میں تنہائی کا موقع پیدا کر لیا۔ جہاں وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ میں نے روتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔ بانو نے جلد از جلد مجھ سے ملنے کا وعدہ لیا اور مجھے گدھا بنا کر چلی گئی۔

ان کی روانگی کے بعد تین چار دن میں نے کس طرح گزارے۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ۔ دوسرے ہی دن بانو کا انڈیا سے فون آ گیا۔ اس نے اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ اسی روز خان بھائی بھی ہمارے پاس موجود تھے، ان کی ہدایت پر ہی ہم اگلے روز بھارتی ویزہ کے حصول کے لئے بھارتی ہائی کمیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کراچی سے اسلام آباد کا سفر مجھے مکمل تفصیلات کے ساتھ اچھی طرح یاد ہے۔ یہ احساس کہ میری حیثیت ایک مفرور اور مطلوب ملزم کی ہے، مجھے مسلسل ڈس رہا تھا۔ یہ سفر ہم نے اپنی ٹریننگ کے مطابق مختلف پڑاؤ کرنے کے ساتھ کیا تھا۔ ہم چاہتے تو کراچی سے جہاز کے ذریعے براہ راست اسلام آباد جا سکتے تھے کیونکہ روانگی سے پہلے فاروقی نے خان بھائی کو ہمارے لئے اچھا خاصا زادِ راہ دے دیا تھا جس کا علم مجھے ان کی روانگی کے بعد ہوا جب خان بھائی نے مجھے اور علی شیر کو یہ رقم دی۔

''یہ کیا؟''...... میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا زادِ راہ......'' خان بھائی نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن یہ تو......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''افضل خان ابھی تک ہم نے افغانستان میں جہاد کیا ہے ہر جگہ معاملات کی ایک جیسی نوعیت نہیں ہوا کرتی۔ کہیں کچھ رنگ بھی ہوتا ہے۔ تمہیں قدم قدم پر ان کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں تو اپنے ان بھارتی مجاہدین بھائیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے ہماری اس ضرورت کا احساس کیا اور ہمارا اتنا خیال رکھا۔ پھر تم نے ان پیسوں سے عیاشی تو کرنی نہیں۔ ہم تو ہر وقت میدانِ جہاد میں ہوتے ہیں جہاں اپنی حفاظت کے لئے کسی بھی لمحے کوئی بھی ایمرجنسی پیش آ سکتی ہے۔''

انہوں نے میری بات کاٹ کر مجھے مطمئن کر دیا۔

روانگی سے پہلے بانو نے ہماری بہت تصاویر اتاری تھیں اور بتایا تھا کہ یہ تصاویر ہماری بھارت آمد سے پہلے بھی ان کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں زندگی کے بہت سے گرم سرد دیکھ چکا ہوں اور کئی نئی باتوں کی سمجھ بھی آنے لگی ہے جو پہلے نہیں آتی تھی تو اس ''ضرورت'' کا علم بھی ہو گیا ہے جس کا تذکرہ آگے کروں گا۔

تین روز تک سفر کرتے ہم بالآخر اسلام آباد پہنچ گئے۔ رات ایک عام سے ہوٹل میں بسر کی اور علی الصبح اپنی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ مختلف مراحل سے گزرتے بالآخر ہم بھارتی ہائی کمیشن کے سامنے پہنچ گئے۔ اس دوران تین مرتبہ ہمیں مختلف لوگوں نے چیک کیا لیکن ہماری

معصومیت اور اسی اطلاع پر کہ ہم بھارت کسی شادی پر نہیں بلکہ اپنے پیاروں کی موت کا سوگ منانے جا رہے ہیں کسی نے کوئی خاص تردد نہ کیا البتہ ہمارا نام پتہ ضرور لکھ لیا جو ظاہر ہے ہم نے لکھوایا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہاں مستقل اس بات کا دھڑکا لگا رہا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں۔ میں نے ایک غیر ملکی کی جان ضرور بچائی تھی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ بعد میں ہونے والی انکوائری نے لوگوں کو میری اصلیت سے آگاہ کر دیا ہو؟ گو کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پاکستان کے آئین کی کسی شق کی خلاف ورزی نہیں کی تھی لیکن اس مملکتِ خداداد میں کسی کے مجرم ہونے کے لئے کوئی حجت درکار نہیں ہوئی بس جس کے گلے میں رسا فٹ آ گیا اسے لٹکا دیا۔

بھارتی ہائی کمیشن میں میلہ لگا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے یہاں موجود تھے۔ مجھے علم ہوا کہ ''ٹوکن'' حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ ''نذرانہ'' دیا جاتا ہے جو ہم نے دیا اور یہاں تین روز سے اپنی باری کے منتظر لوگوں سے پہلے ہماری باری آ گئی۔ وہ بے چارے چیختے چلاتے ہی رہ گئے۔

ہم دونوں جس کھڑکی کے سامنے پہنچے وہاں پہلے سے لوگ موجود تھے اور ان کے سروں پر دو سرکاری ملازمین بھی مسلط تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ ہیں۔ وہ سب کو باری باری گھور رہے تھے۔ کبھی کبھی ہماری طرف بھی ساکن آنکھوں سے دیکھتے۔ جس برآمدے نما کمرے میں ہم کھڑے تھے وہاں کونے میں لگے شارٹ سرکٹ کیمرے ہماری ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہے اور ہماری فلم بنا رہے تھے۔

ہماری باری آنے پر میں نے اپنا پاسپورٹ اور پُر کیا ہوا ویزہ فارم آگے بڑھایا۔ اندر موجود ویزہ آفیسر نے اسے کھول کر دیکھا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا اور اپنے کمپیوٹر پر کچھ چیک کرنے لگا جس کے بعد اس نے دوبارہ ہماری طرف دیکھا اور کچھ فاصلے پر لگے انٹرکام کے ذریعے غالباً کسی اعلیٰ افسر سے بات کی یا پھر کوئی ہدایت لی تھی۔ جس کے بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آیا۔

''آپ لوگ تھوڑا انتظار کریں، ابھی ویزہ مل جائے گا......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک کونے میں لگے بنچوں پر بیٹھنے کے لئے کہا جہاں پہلے سے کچھ لوگ اپنے ویزوں کے منتظر تھے۔

ابھی ہمیں بیٹھے مشکل چند منٹ ہی گزرے تھے جب ایک نوجوان نے وہاں آ کر چند نام

Uploaded By Muhammad Nadeem

پکارے۔ اس کے ہاتھوں میں پاسپورٹ پکڑے ہوئے تھے جس کا نام پکارتا اسے پاسپورٹ تھما دیتا۔ ہمارے نام بھی ان میں شامل تھے۔ ہم نے بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے پاسپورٹ پکڑے اور باہر آ گئے جہاں ایک نئی مصیبت ہماری منتظر تھی۔

یہ کوئی سیکورٹی والا تھا جس نے ہمیں چند قدم دور ہی گھیر لیا۔ ہمارے پاسپورٹ چیک کئے اور ٹوکن نمبر دریافت کئے۔ ہم نے بتایا تو اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ تم آج ہی آئے ہو اور آج ہی ویزہ مل گیا۔ ''اوئے کیا چکر ہے...... سچ سچ بتا دو...... ورنہ یاد رکھنا''...... اس نے سیکورٹی والوں کے مخصوص سٹائل میں کہا۔

میں ذہنی طور پر اس صورتحال کے لئے پہلے سے تیار تھا، نجانے میرے دماغ میں کہاں سے یہ خیال آ گیا تھا کہ ضرور ہمیں یا پھر یہ سوال کیا جائے گا۔

''سر جی! ہم پہلے ہی مصیبت کے مارے ہیں۔ الٹا آپ ہم سے الٹے سیدھے سوال کر رہے ہیں۔ پانچ ہزار روپیہ لگ چکا ہے اب تک ہمارا، ایک ہزار ٹوکن کا دیا ہے اور چار ہزار اندر دیئے ہیں تب کہیں جا کر باری آئی ہے۔'' میں نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ایسی شاندار اداکاری کی تھی۔ شاید یہ آغاز تھا کیونکہ اب مجھے قدم قدم پر ایسے ہی اداکاری کے جوہر دکھانے تھے۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا:

''چلو اوئے بھاگ جاؤ...... نکل جاؤ جلدی سے۔''

اور ہم نکل گئے۔

○

باب

اس مرتبہ ہم کراچی نہیں گئے۔

پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق اب ہمیں لاہور ہی میں قیام کرنا اور یہیں سے تیاری کے بعد اپنے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ہم نے لاہور کے ایک سستے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا، پیسے بچے تو اس سے اچھی جگہ قیام کر سکتے تھے لیکن احتیاط لازم تھی۔ ہوٹل میں ہمارا دو دن قیام رہا۔ ان دو دنوں میں یہاں آنے والے ہر شخص کو ہم نے اپنا ہمدرد بنا لیا تھا۔ انہیں ہم'' بے چاروں'' پر ترس آ رہا تھا جن کے دو قریبی عزیز بھارت میں فوت ہو گئے اور ہم اب ٹرین کے ٹکٹ لئے روانگی کے منتظر تھے۔ ہوٹل کے مالک نے ہمیں دو دن اپنی طرف سے مفت کھانا کھلایا کیونکہ وہ بھی ہماری طرح ''پردیسی'' تھا۔ اس نے اپنے ہوٹل کا نام ہی ''پردیسی ہوٹل'' رکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ریل کے ٹکٹ حاصل کئے اور دو روز بعد اپنے مختصر سامان کے ساتھ جس میں ہمارے بیگ، ایک دو پہننے کے کپڑے اور بانو کے لئے بطور خاص خریدے گئے کپڑے اور جوتے تھے۔

پاکستانی کسٹمز پر ہماری بڑی سخت چیکنگ ہوئی تھی، ہمارے پاس آدھے آدھے خالی بیگ اور پھر عزیزوں کی وفات کے واویلے نے یہاں بھی ہمارا ساتھ دیا اور کئی ایسی پیچیدگیوں سے بچ گئے جن سے عام مسافروں کا سامنا ہوتا ہے۔

اٹاری پر پھر وہی عذاب لیکن یہاں بھی ہم محفوظ رہے اس کی وجہ بانو اور فاروقی کی وہ بار بار کی تلقین تھی کہ کبھی زیادہ سامان لے جانے کی غلطی نہ کرنا، یہاں بھی ہم نے امیگریشن والوں کو ان کے منہ پر ان کی اصلیت لکھی تھی وہی کچھ بتایا اور سنایا جو اس سے پہلے بتاتے اور سناتے آئے تھے۔ اب تک ہم دونوں اتنی مرتبہ یہ ڈرامہ دہرا چکے تھے کہ اب ہمیں یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی اس کام کے لئے جا رہے ہیں اور اب تک ہم نے جو جھوٹ جانا تھا وہ اصل میں سچ ہے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

اٹاری پر پاکستانی زائرین اور مسافروں کی زندگی کو جس جس طور پر جہنم بنایا جاتا ہے اس پر الگ سے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خدا خدا کر کے رات گئے ٹرین روانہ ہوئی جس کی کھڑکیوں پر باہر سے سلاخیں لگا کر ہمیں جانوروں کی طرح اندر بند رکھا گیا تھا اور دروازوں پر بھارتی سیکورٹی اہلکار براجمان تھے۔ دلی پہنچ کر اس صورتحال سے قدرے چھٹکارہ ملا۔

ریلوے سٹیشن پر بانو اور فاروقی ہمارے منتظر تھے۔ ان کی ہدایات پر ہم نے بھی پتلون قمیض پہن رکھی تھی لیکن یہاں جو بانو کا روپ میں نے دیکھا میں تو دنگ ہی رہ گیا۔ اس نے جین اور شرٹ پہنی ہوئی تھی اور مکمل ہندو ناری دکھائی دے رہی تھی۔ میں چونکا لیکن پھر اس کا اسیر بنا، اس کے ساتھ پارکنگ میں کھڑی کار تک آ گیا۔

بانو اور فاروقی دونوں نے جدید لباس پہن رکھا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی فاروقی نے ہمارے تجسس کو ختم کرنے کے لئے خود ہی کہنا شروع کیا۔

"افضل بھائی! یہاں ہم عام زندگی میں مسلمانوں کے نام نہیں رکھتے۔ اس سوسائٹی میں ابھی اتنا ظرف پیدا نہیں ہوا کہ یہ لوگ کسی مسلمان کو عام انسان سمجھیں اور ہم جس راستے کے مسافر ہیں وہاں یوں ہی ہمیں اپنی اصلیت چھپانی پڑتی ہے۔ یہاں ہم نے اپنے مشن کے لئے اپنے کچھ ہندو دوست بھی بنا رکھے ہیں۔ خصوصاً یہاں ان حکومتی محکموں میں جن سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ ہمارے دوست موجود ہوتے ہیں۔ انہیں ہماری اصلیت کا علم نہیں ہوتا لیکن اس بات کا علم ضرور ہوتا ہے کہ ہماری مدد کرنے پر ہم انہیں مایوس نہیں کریں گے۔"

اس نے اور بھی بہت سی باتیں کیں، درمیان میں بانو بھی لقمہ دیتی جاتی تھی جو میرے لئے سند کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ زندگی میں پہلی مرتبہ میں ایک ایسے تجربے سے گزر رہا تھا جس میں انسان کو تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دکھائی دیتا ہے وہ ساون کا اندھا بن جاتا ہے جسے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ یہی میرا حال تھا۔

میں نے زندگی کے بڑے نشیب و فراز اب تک دیکھ لئے تھے۔ دوستم کی جیل سے بھارتی سرحدوں تک کا سفر میرے لئے بے پناہ تجربات کا حامل تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں اُلو بن کر رہ گیا۔ لوگ اسے عشق کہتے ہیں، میں اسے دماغ کا خلل کہوں گا جس کا میں شکار ہوا۔ اب میرے لئے بانو پہلے اور جہاد دوسرے نمبر پر آ گیا تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا جیسے میں کوئی از منہ قدیم کا مجاہد ہوں اور بانو میری وہ محبوبہ جو اپنے مجاہد محبوب کو جہاد پر روانہ کرنے کے بعد گھر نہیں بیٹھ رہتی بلکہ خود

بھی مجاہدہ بن کر مجاہدین کی خدمت پر کمر بستہ رہتی ہے۔

O

اس سفر کا اختتام دہلی کی ایک ماڈرن آبادی کے خوبصورت بنگلے پر ہوا جس کے باہر کسی ہندو ایڈووکیٹ کا نام لکھا تھا۔ میں چونکا ضرور لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بانو نے کہا۔

"کھنہ صاحب ہمارے دوست ہیں، ان کے ذریعے ہم دہلی میں پولیس کے معاملات نبٹاتے ہیں۔ جب کوئی پاکستان سے آتا ہے تو اسے دہلی میں اپنی آمد کی پولیس رپورٹ کرنی ہی پڑتی ہے۔ کھنہ صاحب ہمیں تاجر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ہم نے بھی انہیں یہ بتایا ہوا ہے کہ پاکستان سے ہمارے مہمان "پھیرے باز" ہوتے ہیں..... یہاں بہت ہوشیاری سے چلنا پڑتا ہے..... سمجھ گئے ناں"۔

"ہاں"..... میں نے ہونقوں کی طرح گردن ہلا دی۔

علی شیر خاموش رہا جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پہلے ہی سے سب کچھ جانتا ہے بعد کے واقعات نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ وہ میرے ساتھ پہلی مرتبہ بھارت نہیں آیا تھا۔ شاید اس گروپ میں سب سے نیا اور نو وارد "مجاہد" میں ہی تھا۔

کھنہ صاحب کو شاید ہماری آمد کا پہلے سے علم تھا۔ میں نے تو یہی اندازہ لگایا کیونکہ جیسے ہی گاڑی ان کے گیٹ کے سامنے رُکی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ ایک گٹھے ہوئے جسم کے گورکھے نے کھولا جو شکل ہی سے بڑا کرخت دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کھٹکا لگا لیکن چند لمحوں کے لئے۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دروازے پر کوئی خفیہ کیمرہ نصب ہے جس کے ذریعے ہماری شناخت کے بعد دروازہ کھولا گیا ہے۔ گاڑی ڈرائیور نے جو دلی سٹیشن سے یہاں تک خاموش رہا تھا پہلے سے وہاں کھڑی تین چار گاڑیوں کے ساتھ ہی پارک کر دی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ گھر ہے یا دفتر؟ جہاں اتنی کاریں کھڑی ہیں۔

حیرت ہوتی ہے آج سوچ کر کہ ہمارا واسطہ کتنے چالاک اور مکار لوگوں سے پڑا تھا۔ خدا جانے بانو کوئی جادوگرنی تھی کہ میرے تمام خدشات پہلے سے اس کے علم میں تھے۔

"کھنہ صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔ ہمیں بھی ایسے ہی لوگوں کی ضرورت رہتی ہے اس لئے تو ان کے پاس آتے ہیں۔"

اس نے میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''بڑی پہنچ والے بندے ہیں۔ اس شہر میں جس کا کوئی بھی کام پھنس جائے وہ کھنہ صاحب کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔''

فاروقی نے اس کی بات مکمل کر دی۔

ہم کار سے اترے اور برآمدے سے گزرتے ہوئے اس کمرے تک پہنچے جسے کھنہ صاحب کے پی اے کا کمرہ بتایا گیا تھا۔ کوئی نادیدہ قوت بار بار میرے کانوں میں کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی آفس یا گھر نہیں البتہ کوئی Safe House خفیہ ٹھکانہ ضرور ہو سکتا ہے لیکن تب شاید میرے کان بھی بہرے ہو گئے تھے۔ عقل پر پردہ تو اسی روز پڑ گیا تھا جب کراچی میں بانو انتہائی جذباتی انداز میں مجھ سے بغل گیر ہوئی تھی۔ اب میرے بے وقوف بننے میں کون سی کسر باقی رہ گئی تھی۔

کھنہ صاحب کا پی۔ اے ان لوگوں سے خاصا فری دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نہ صرف گرم جوشی سے دونوں سے مصافحہ کیا بلکہ فاروقی سے پورا اور بانو سے نصف معانقہ بھی کر لیا۔ بانو نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بھارت میں بڑی آزاد سوسائٹی ہے اور انہیں با دل نخواستہ ہی سہی یہاں کے ماحول کے مطابق رہنا پڑتا ہے اس لئے میں اس کی کسی حرکت کا سیریس نوٹس نہ لوں لیکن اس کے باوجود ایک ہندو سے مسلمان لڑکے کے اس طرح ملنے کو میرے دماغ نے ہضم نہیں کیا جبکہ وہ مجاہدہ بھی تھی البتہ دل نے دماغ کا ساتھ نہ دیا اس پر تو بانو ہی بانو چھائی ہوئی تھی۔

''کھنہ صاحب سے ملا دیں مہمان طویل سفر سے تھکے ہوئے ہیں اور انہیں آرام کی بھی ضرورت ہے۔''

فاروقی نے کہا۔

''آپ لوگ تو بس ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ ارے کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجئے ناں جناب۔''

پی۔ اے نے بڑے عجیب سے انداز میں بانو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب بے فکر رہیئے۔ جلد ہی آپ کے ہاں ڈنر کرنے آ رہے ہیں ہم''۔

بانو نے کہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پی۔ اے مسلمان ہے۔

''رے نصیب! رے نصیب''۔ اس نے بانو کی بات پر بڑے لکھنوی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اگلے چند منٹ میں ہم کھنہ صاحب کے کمرے میں موجود تھے۔ کمرے کی فضا میں رچی

سگریٹ کی بو تو یہ بتا رہی تھی کہ ہماری آمد سے پہلے یہاں کچھ لوگ موجود رہے ہوں گے جنہیں کھنہ صاحب نے فارغ کرنے کے بعد ہم سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے بھی ہمارا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا لیکن **معانقے** سے پرہیز برتا۔

اس نے باری باری ہم سب کی مزاج پرسی کی اور ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے جب ایک مودب ویٹر بڑی پُرتکلف چائے کی ٹرالی گھسیٹتا اندر داخل ہوا، ہماری طرف دیکھے بغیر اس نے میز پر برتن سجائے اور واپس لوٹ گیا۔ کھنہ اپنی میز سے اٹھ کر اب کمرے کے کونے میں ہمارے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ میرے ''ناں ناں'' کرنے کے باوجود بانو نے ایک پلیٹ میں میرے لئے کچھ لوازمات رکھے اور ہم نے چائے کے ساتھ ہلکا پھلکا کھانا شروع کیا۔ کھنہ اس دوران بڑی بے تکلفی سے ہم سے باتیں کرتا رہا۔

میں اندازہ نہ کر پایا کہ بظاہر تو وہ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا لیکن اصل میں ہمارے متعلق ہوئے نامحسوس انداز میں معلومات اکٹھی کر رہا تھا اس نے میرا انٹرویو اتنی ہوشیاری سے مکمل کیا مجھے کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے ایک سوال کر کے مجھے تو چکرا کر رکھ دیا۔

''یار کوئی کرنسی وغیرہ بھی لائے ہے یا نہیں؟''۔

میں نے سوال کے جواب کے لئے بانو کی طرف دیکھا۔ جو مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''ہمارے پاس تو بس وہی پیسے ہیں جو تبادلے میں لئے تھے۔ کچھ امریکن ڈالر ہیں......''

میں نے وضاحت کی۔

''انہیں دکھا دو''...... بانو نے کہا اور میں سناٹے میں آ گیا۔

یہ کیا بات کہہ رہی ہے؟ میں نے سوچا۔ بانو کی طرف دیکھا۔ بانو شاید میری بے چینی کو بھانپ گئی تھی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ اکثر ٹورسٹ اپنے ساتھ غلطی سے جعلی کرنسی لے آتے ہیں۔ کھنہ صاحب اپنے دوست ہیں۔ ہم ان سے تو کچھ چھپا نہیں سکتے ناں''۔

بانو نے کہا۔

''لیکن ہم نہیں لائے''......

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نے قریباً چڑتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب ہمیں تو غم ہے کھنہ جی کو بھی مطمئن کرنا ہے ناں....''

بانو نے میری دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

''یار بُرا نہ منانا.....میں تمہارا ایڈوائزر ہوں۔ خدانخواستہ تم سے کوئی ایک نوٹ بھی غلط پکڑا گیا تو بانو جی ساری عمر مجھے معاف نہیں کریں گے۔ تم نہیں جانتے یہ نوٹ تبدیل کرنے والے بھی گھپلا کر دیتے ہیں اور بعد میں کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔''

کھنہ نے کہا۔

اس کی لاجک بڑی عجیب تھی لیکن ہمارے پاس اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اور علی شیر نے اپنی ساری رقم اسے دکھا دی۔ خدا جانے وہ کون سی نیک ساعت تھی جب کسی لاشعوری جذبے کے تابع میں نے اپنے ڈالرز جو علیحدہ سے بڑے محفوظ رکھے ہوئے تھے کھنہ کو نہیں دکھائے۔

''اور تو نہیں ناں''.....کھنہ نے ہمارے پیسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاں سر جی! ہمارے پاس تو بس یہی تھوڑے سے پیسے ہیں۔''

میں نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری دکھائی۔

''اوئے یار پندرہ بیس ہزار میں تم یہاں سے کیا خریدو گے اور وہاں کیا بیچو گے۔''

اس نے اپنی دانست میں بڑا شاندار حربہ آزمایا تھا۔

''اوہو کھنہ صاحب آپ نے تو ہمارے مہمانوں کی تفتیش شروع کر دی۔ بس ختم کریں اسے.....لاؤ جی اپنے پاسپورٹ نکالو''۔

بانو نے اچانک بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو کھنہ کا رویہ بالکل بدل گیا۔

''یار میں معافی چاہتا ہوں بھئی.....بُرا مت منانا.....دراصل پچھلے ہفتے ہی ایک کیس ہوا ہے۔ ہم نے جس لڑکے کا اندراج کروایا تھا۔ وہ جعلی کرنسی چلاتا پکڑا گیا جس پر بڑی مشکل اور منت سماجت سے اس کی جان چھڑا کر اسے واپس بھیجا ہے۔''

کھنہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''اچھا لاؤ اپنے پاسپورٹ۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

میں نے بانو کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے مجھے نارمل کرنے کے لئے کہہ دیا۔

''ہاں! ہاں! بھئی دے دو.....باقی سب کچھ کھنہ صاحب نے ہی کرنا ہے۔''

ہم نے اپنے پاسپورٹ کھنہ کو دے دیئے۔ ہمارے لئے ان کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی تو نہیں رکھتا تھا کیونکہ پاسپورٹ ہم نے صرف بھارت میں داخل ہونے کے لئے استعمال کرنے تھے اس کے بعد ہم ان سے بے نیاز ہو جاتے لیکن کھنہ کے پاس اپنے پاسپورٹ سرنڈر کرنا مجھے بہت عجیب لگا۔ کھنہ نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے پھر رخصت کیا اور ہم اس ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گئے جس میں یہاں تک آئے تھے۔ پہلے کی طرح بانو اکیلی آگے اور ہم تینوں پیچھے بیٹھے تھے۔ سارے راستے بانو نے اپنا معمول جاری رکھا اور وہ ہمارا خیال بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ بانو میری خاموشی کا نوٹس لے کیونکہ میرا دل اب تک پیش آنے والی صورتحال سے مطمئن نہیں تھا۔ اس مرتبہ ہمارے سفر کا اختتام دہلی کے ایک مضافاتی علاقے کے خوبصورت گھر میں ہوا۔ ٹیکسی والا یہاں سے واپس لوٹ گیا۔ ہم گھر کے اندر آ گئے جہاں پہلے سے ایک خانساماں اور چوکیدار ہمارے منتظر تھے۔

''فی الوقت ہمارا ٹھکانہ یہ ہے۔''

بانو نے گھر کے ایک بیڈ روم میں میرا بیگ رکھنے کے بعد میری طرف گھوم کر اچانک اس طرح کہا کہ میں کچھ شرما سا گیا۔

''کیا بات ہے افضل تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔''

اس نے میرے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے اتنے قریب آ کر کیہ بات کہی کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ بانو میرے اتنا نزدیک تھی کہ اس کی سانس لینے کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً اس نے میرے دل کی بے قابو دھڑکنوں کو بھی محسوس کیا ہوگا۔

''نن نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں''.....میں نے سنبھل کر کہا۔

''نہیں افضل میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے کہا۔

خدا جانے اس کی آنکھوں میں کیا سحر تھا جس نے مجھے جکڑ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا ضمیر ہی بدل گیا ہو۔

''میں بھی اگر تمہاری جگہ ہوتی تو یقیناً میرے بھی یہی جذبات ہوتے افضل لیکن میں نے تمہیں وہیں بتا دیا تھا کہ اب تم بالکل الگ طرح کی دنیا میں آ رہے ہو۔ یہاں ہمارا بہترین ہتھیار

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ریاکاری اور دھوکہ ہے۔ اگر ہم دشمن کو دھوکے میں نہیں رکھیں گے تو ہم اس کے بچھائے جال میں پھنس جائیں گے۔ اس نے ابھی تک وہی انداز اپنایا ہوا تھا۔ اس انداز میں اس نے مجھے قریباً دھکیلتے ہوئے سامنے پلنگ پر بٹھا دیا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اب میرا اپنے آپ سے رہنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔

''دیکھو ناصر''..... اس نے میرے کندھے پر پھر بے تکلفی سے ہاتھ رکھا۔

''کھنہ کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ''ڈبل کراس'' ہے۔

''ڈبل کراس''..... میں نے پلنگ سے تقریباً اچھلتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... اور ہم ایسے لوگوں کی تلاش میں ہوتے ہیں'' بانو نے اطمینان سے اپنی بات جاری رکھی۔

''بانو! میں تمہاری باتیں..... تم میری.....

''سمجھ سے باہر ہیں''..... اس نے میرا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں''..... میں نے اتنے ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

''دیکھو افضل..... افغانستان اور ہندوستان کے جہاد میں بڑا فرق یہی ہے کہ وہاں جہاد ہتھیار سے اور یہاں دماغ سے لڑا جاتا ہے۔ بھارتی ایجنسیوں کے لوگ سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ہم اپنی مدد کے لئے جن جہادی ساتھیوں کو بلاتے ہیں وہ ویزہ اور پاسپورٹ لے کر ہی آتے ہیں۔ حکومت پاکستان سے آنے والے ہر مسافر کا وہ آخری لمحات تک تعاقب کرتے ہیں۔ کھنہ جیسے لوگ ان کے ٹاؤٹ ہوتے ہیں جن کی بات پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے ہیں..... اس لئے ہم اپنی اطلاعات ان کے ذریعے ہی بھارتی ایجنسیوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح نامحسوس انداز میں یہ لوگ ہماری مرضی کے اطلاعات آنے تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہم اسے کتنی ہی مرتبہ یہ بات کہتے کہ تم لوگ کرنسی نہیں لائے لیکن اسے یقین نہ آتا۔ اب اسے یقین آ گیا ہوگا..... افضل! یہ تو آغاز ہے۔ ابھی ہم نے بہت دور تک جانا ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے کسی سے اس طرح محبت ہو سکتی ہے جیسے.....'' اس نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

کاش میں الفاظ میں اپنی کیفیت بیان کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری تھی۔ دنیا کی کوئی لغت

وہ الفاظ نہیں رکھتی۔ میرا جسم پگھل کر موم بن گیا تھا اور میں خود تو آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے محسوس کر رہا تھا۔ میرا واسطہ شاید انٹیلی جنس کمیونٹی کی مکار ترین عورت سے تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرا انتخاب اس نے کیوں کیا تھا؟ لیکن مجھ سے بڑا گدھا اسے شاید ہی میسر آتا۔

''او معاف کرنا..... میں تمہیں دیکھ کر جذباتی ہو جاتی ہوں''..... اتنا کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر چلی گئی۔

کسی انتہائی ماہر نفسیات کی طرح وہ مجھ سے کھیل رہی تھی۔ میں جو اس کے لئے ربڑ کا ایسا کھلونا بن چکا تھا جسے بچے توڑ مروڑ کر کوئی بھی شکل دے دیا کرتے ہیں۔ میں ہکا بکا اس پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد فاروقی کمرے میں داخل ہوا۔

''کچھ آرام کر لیں۔ رات کو کھانے کے بعد باہر نکلیں گے''۔

اس نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے..... جیسے تمہاری مرضی''۔

میں نے مختصر جواب دیا اور فاروقی کمرے سے نکل گیا۔

دروازہ بند کر کے میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ کل صبح سے ٹائٹ پتلون قمیض نے میرے بدن کو جکڑ رکھا تھا جس سے نجات پا کر میں نے معمول کے کپڑے پہنے اور بستر پر لیٹ گیا۔

مجھے سخت تھکاوٹ ہو رہی تھی لیکن..... نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ بانو کے علاوہ مجھے نہ تو کچھ سجھائی دے رہا تھا نہ ہی کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ بانو نے مجھے ساون کا اندھا بنا دیا تھا جسے چاروں طرف سوائے ہریالی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لمحے میرا جی چاہتا تھا کہ بانو کے ساتھ گزرے یہ لمحے ابدی ہو جائیں..... لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے بالآخر میں نیند کی دیوی کی بانہوں میں سما گیا۔ آنکھ کھلی تو شام ڈھل چکی تھی.....!

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر والان میں آ گیا، جہاں ایک میز کے گرد فاروقی اور علی شیر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مجھے کچھ خجالت سی ہوئی یہ لوگ شاید کافی دیر سے یہاں بیٹھے تھے۔

''معاف کرنا یار..... آنکھ لگ گئی..... وقت کا پتہ ہی نہیں چلا'' میں نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''نو پرابلم..... بھئی پھر کیا ہوا.....'' فاروقی نے کہا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں تو تمہیں اٹھانے لگا تھا لیکن بانو صاحبہ نے منع کر دیا....." علی شیر نے بتایا۔

"واہ یار تم بھی کمال کے بندے ہو..... اب ساری رات کیا جاگ کر گزاریں گے۔"

میں نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ علی شیر سے کہا۔

"کوئی بات نہیں یار..... ہم نے بھی رات جاگ کر ہی گزارنی ہے..... کیوں پریشان ہو رہے ہو"..... فاروقی نے ایک کپ میں میرے لئے چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے چائے لے لی۔ جس کی اب میں شدت سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ہم آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ فاروقی ہمیں دہلی کے متعلق بتا رہا تھا۔ یہاں کے لوگ، ان کا مزاج، عادات، اوقات کار اور اسی طرح کی دوسری باتیں جب اچانک ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

"بانو آپ کا فون ہے"..... اس نے نمبر دیکھ کر کہا۔

موبائل پکڑ کر وہ ایک کونے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد واپس آ گیا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ بھئی..... ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں"۔ اس نے اگلا حکم سنایا۔ میں نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کپڑے تبدیل کئے اور تھوڑی دیر بعد ہم ایک چھوٹی کار پر جسے فاروقی چلا رہا تھا، دہلی جا رہے تھے۔ یہ کار کہاں سے آئی تھی؟

جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تب تو یہاں کوئی گاڑی نہیں تھی؟ ویزہ وغیرہ جیسے سوالات میرے دماغ میں ضرور کلبلائے لیکن پھر خود سے ہی پانی کے بلبلوں کی طرح ختم ہو جاتے اور میں خود بخود مطمئن ہو جاتا۔ بانو کا اداس اور محبت بھرا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتا اور مجھے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دینے لگی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس لمحے مجھے اس پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بانو کے متعلق ایسا کیوں سوچا!..... جب یہ سب سوچتا ہوں تو خود پر رونا بھی آتا ہے، ہنسی بھی آتی لیکن اب میرا پچھتاوہ کس کام کا۔

بانو ایک مقامی فائیو سٹار ہوٹل میں پہلے سے ہماری منتظر تھی.....!

میں نے اپنی زندگی میں ایسے ہوٹلوں کا تذکرہ تو سنا تھا۔ شاید گھر سے چوری دیکھی گئی کسی فلم میں دیکھا بھی ہو گا لیکن خود کبھی ایسے ہوٹل میں قدم دھروں گا۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بانو نے جدید انداز کا لباس پہن رکھا تھا اور اپنی عمر سے کچھ سال کم کی انتہائی کم سن دوشیزہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہم تینوں کا استقبال مقامی روایات اور ماحول کے مطابق کیا۔ میں نے بانو ہی کا دیا سوٹ پہن رکھا تھا اور علی شیر مجھ سے بھی زیادہ معزز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم چاروں اپنے لئے پہلے سے ریزرو میز کی طرف آ گئے۔ جس کے سامنے ایک بڑے خوبصورت سٹیج پر نیم برہنہ رقاصہ موسیقی کی دھنوں پر تھرک رہی تھی۔ لوگ ناؤ نوش میں مصروف اور ایک دوسرے سے بالکل بے خبر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک موذب ویٹر ہماری میز پر مشروبات رکھ گیا تھا۔ جن میں سب سافٹ ڈرنک ہی تھے۔ خدا کا شکر ہے کوئی دوسری شے نہیں تھی۔ بانو یہاں میری شاید تربیت کرنے لائی تھی اس نے اپنے ہاتھوں سے پلیٹ میں مجھے کھانا ڈال کر دیا۔ واقعی اسے مہذب طریقے سے کھانے کا طریقہ بھی اس طرح بتایا کہ مجھ پر کچھ بھی قطعی گراں نہ گزرے۔

اس ہوٹل میں دہلی کے وی۔ آئی۔ پیز اور غیر ملکی شخصیات کے علاوہ شاید کوئی اور گھسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گو کہ یہاں ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔ ماحول بڑا رومانٹک بنایا گیا تھا اور ہر طرف شراب و شباب کی رنگینیوں میں ڈوبے لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے لیکن..... کوئی طاقت بار بار میرے کانوں میں سرگوشی کر رہی تھی کہ ہماری نگرانی کی جا رہی ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی خفیہ آنکھیں ایسی ضرور ہیں جو ہمیں دیکھ رہی ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں وہ جب بھی گمراہ ہونے لگیں یا راستے سے اترنے لگیں، قدرت ایک مرتبہ ضرور انہیں وارننگ دیتی ہے۔ شاید ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا لیکن بانو کے سحر میں جکڑا میں بے بس انسان قدرت کی اس وارننگ کو نظر انداز کرتا رہا۔

رات دیر گئے تک ہم یہاں رہے!

ایک پہر رات بیت چکی تھی جب ہم گھر کے لئے روانہ ہوئے اور دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ بانو ہمارے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس میں بھی یقیناً کوئی مصلحت رہی ہو گی۔ فاروقی نے جیپ گھر پر چھوڑا اور اب وہ بھی واپس لوٹ گیا تھا۔ گھر کے دروازے پر ایک گارڈ ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمارا وی۔ آئی۔ پیز کی طرح استقبال کیا۔ گو کہ میں دن میں بھی سوتا رہا تھا لیکن کھانے کی میز پر کیا اس ماحول کی خماری جس میں تین چار گھنٹے گزرے تھے، مجھے فوراً نیند آ گئی اور صبح دیر گئے تک سوتا رہا۔ جو میرے لئے پریشانی کی بات بھی تھی کیونکہ میری نماز خطا ہو گئی تھی۔ اور شاید یہ بے خودی کی حالت میں زندگی میں پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہوا تھا ورنہ تو جب سے ہوش سنبھالا تھا میں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اپنے گھر والوں کی طرح علی الصبح بیدار ہوتا اور باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ خدا جانے مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی یا پھر دیر تک سونے رہنے کا پچھتاوا بہرحال میں نے اللہ توبہ کی۔ جلدی سے غسل کیا۔ نماز پڑھی اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ یہاں فاروقی اور علی شیر ٹی وی پر خبریں سن رہے تھے۔ میں نے دونوں کو سلام کیا تو علی شیر نے میری طرف حیرانی سے دیکھ کر کہا۔

''خیریت ہے ناں مولوی صاحب؟''

وہ مجھے اب بھی مولوی صاحب ہی کہہ رہا تھا میرے بیشتر جہادی ساتھی مجھے اسی نام سے مخاطب کرتے تھے۔

''بس یار غفلت ہوگئی۔ نماز بھی قضا ہوگئی۔''

میں نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''بانو صاحبہ کا فون آرہا ہے بار بار..... وہ ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کریں گی۔

میں نے جب بتایا کہ تم سو رہے ہو تو انہوں نے جگانے سے منع کر دیا اور کہا تھا کہ جب تم بیدار ہو گے تو انہیں بتایا جائے۔'' فاروقی نے مجھے مطلع کیا۔

''سوری یار! میری وجہ سے آپ لوگوں کو بھی.....''

مجھے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی لیکن فاروقی نے میری بات کاٹ دی۔

''نو پرابلم..... یار اب تم لوگ خود کو یہاں کے ماحول میں ڈھال لو۔ ہمارا کام آج کل میں شروع ہو جائے گا۔ بس یہاں دو چار دن کا ہی سیر سپاٹا ہوتا ہے۔''

فاروقی نے بے تکلفی سے کہا۔

''فاروقی بھائی! ہم یہاں سیر سپاٹے کرنے نہیں آئے۔ ہم جس عظیم مقصد کے لئے آئے ہیں اس کا آپ کو بھی بخوبی علم ہے''..... میں نے کہا۔

''ہاں.....'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر خود ہی چونک اٹھا جیسے کوئی غلط بات کہہ دی ہو.....'' میں ناشتے کے لئے کہہ دوں۔ بانو صاحبہ پانچ منٹ تک پہنچ جائیں گی وہ یہیں نزدیک ہی ''موجود ہیں''۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ بانو آ گئی۔

بانو نے مقامی روایات کے مطابق ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اگر وہ چیخ چیخ کر بھی اس حالت میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتی تو کسی کو یقین نہ آتا کہ وہ مسلمان لڑکی ہے۔ ساڑھی میں لپٹی وہ کوئی انتہائی ماڈرن اور معزز گھرانے کی دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی۔

مسکراتے ہوئے اس نے ہندو عورتوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر ہمیں ''نمستے'' اور پھر مسکراتے ہوئے ''صبح بخیر'' کہا۔

خدا جانے اصلیت کیا تھی لیکن تب ہمیں یہی سمجھایا گیا تھا کہ یہ سب کچھ ہماری تربیت کا حصہ ہے۔ یہ افغانستان میں جہاں ہم نے مجاہدین کے روپ میں جہاد کرنا ہے۔ ہندوستان میں تو جہاد کے لئے بھی کئی روپ دھارنے پڑتے تھے۔ ناشتہ ہم نے ایک میز کے گرد لگی کرسیوں پر بیٹھ کر کیا۔

ناشتے کے بعد فاروقی وہاں سے چلا گیا۔ علی شیر اور میرے علاوہ اب یہاں بانو ہی رہ گئی تھی۔ آج سے ہمارا جہاد شروع ہو جائے گا۔ بانو نے اچانک ہی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل..... ہم تو یہی چاہتے ہیں۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''آج آپ دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ مقامی تنظیم کے مطابق اور احتیاطی اقدامات کے پیش نظر آپ دونوں کو کمانڈر صاحب نے الگ الگ گروپ سے وابستہ کر دیا ہے۔''

بانو نے کہتے ہوئے بطور خاص میری آنکھوں میں جھانکا۔

''جیسے آپ پسند کریں''..... میں نے کہا۔

''علی شیر بھائی آپ ہمارے حیدر آباد کے بھائیوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور آپ دوسرے گروپ کے ساتھ''..... اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''الحمد اللہ''..... میں نے جواب دیا۔

''علی شیر بھائی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ آپ کچھ پوچھنا چاہیں گے۔''

اس نے علی شیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں جی..... جیسے آپ کی مرضی''.....

علی شیر بڑا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے پہلے ہی سے تمام باتوں کا علم ہے جبکہ اس نے مجھے ابھی تک یہی تاثر دیا تھا کہ میری طرح وہ بھی پہلی مرتبہ ہندوستان آیا ہے۔

بانو نے ہمیں مقامی سطح پر کام کرنے والے گروپ کا مختصر سا تعارف کروانے کے بعد کہا۔

''باقی باتیں کمانڈر صاحب سے ملاقات کے بعد ہی آپ زیادہ بہتر طریقے سے جان پائیں گے۔ اس کے کچھ دیر بعد فاروقی کمرے میں آیا اور علی شیر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ روانگی سے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

پہلے علی شیر نے گرمجوشی سے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔

''افضل بھائی کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔ اب انشاءاللہ جنت میں ملاقات ہوگی۔ دعا کرنا زندگی کا یہ مقصد پورا ہو جائے۔''

میں نے بھی جواب میں ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا اور ہم نے روایتی طریقے سے ایک دوسرے کو دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد ہماری ملاقات جن حالات میں ہوئی جن کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا تذکرہ وقت آنے پر کروں گا۔

O

علی شیر کی روانگی کے بعد بانو اور میں اکیلے رہ گئے تھے......!

''افضل! میں نے خود کو زندگی میں اتنا کمزور کبھی محسوس نہیں کیا جتنا تم سے ملنے کے بعد کرنے لگی ہوں...... سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمہیں اس لڑائی میں جھونکنا نہیں چاہتی......افضل! اس نے ڈرامائی انداز میں میری طرف مڑتے ہوئے کہا...... ''آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں اور بھاگ چلیں۔

''بانو! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''......میں بھی خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں افضل تمہیں یہ اچھا نہیں لگا لیکن......''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے جذبات اچھی طرح سمجھتا ہوں بانو! تم نے ایک پتھر کا دل رکھنے والے نوجوان کو بھی پگھلا کر رکھ دیا ہے میں کمزور تر میں ہو گیا ہوں...... لیکن اس سب کچھ کے باوجود میں اس مشن اور مقصد سے الگ نہیں ہو سکتا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔''

O

میری اس بات کا جواب بانو نے جس طرح دیا اسے بیان کرنے کا مجھ میں یارا [نہیں]... لیکن آج سوچتا ہوں تو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ دراصل وہ مجھے ''چیک'' کر رہی تھی کہ [کہیں] میں بھارت آ کر گھبرا تو نہیں گیا۔

میرے جواب سے اسے کم از کم یہ تسلی ضرور ہو گئی ہو گی کہ میں اس کے اشاروں پر بندر کی [طرح] بیابی سے ناچ رہا ہوں اور آئندہ میں وہی کروں گا جو وہ چاہے گی۔

[ش]ام تک کا وقت میں نے اکٹھے گزارا جس کے بعد ایک کار ہمیں لینے کے لئے آئی جس [میں بیٹھ کر] ہم دہلی شہر پہنچے۔ یہاں رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ عازم سفر ہوئے۔

[ا]س سفر کا اختتام دس گھنٹے کی مسلسل ڈرائیونگ کے بعد ہوا۔ اس درمیان ہم نے تین گاڑیاں [بدل]یں۔ تینوں گاڑیاں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی اپنی جگہ موجود ہوتیں۔ [اس کے] ساتھ ہی راستے میں دو جگہ ہمیں پولیس نے روکا لیکن گاڑی کا ڈرائیور خود باہر نکل کر [ا]ن سے کیا کہتا تھا کہ وہ لوگ احترام سے ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔

[ا]س وقت تک چونکہ میری عقل پر مکمل پردہ پڑا ہوا تھا اس لئے میں بھی سمجھتا کہ ان لوگوں نے [کوئی] مضبوط حوالہ Reference رکھا ہوا ہے جس کا نام لینے یا کارڈ دکھانے پر پاکستان کی [...] [ج]س والے فوراً جان چھوڑ دیتے ہیں۔

[بڑ]ے چالاک لوگ تھے......! کیا مجال جو ان کے کسی بھی عمل پر آخری لمحات تک مجھے شک [ہوا ہو]۔

[میں] نے آپ سے کہانی کے آغاز میں کہا تھا اب پھر اپنی بات دہراتا ہوں کہ میں کسی بھی [...] یا کوئی ایسی بات نہیں بتاؤں گا کہ جو ملکی سالمیت اور میرے لئے مستقبل میں نقصان دہ [...] تھیں کیونکہ وہاں معاملات یہاں کی طرح ٹیڑھے اور پیچدار نہیں بلکہ دو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اور دو چار کی طرح بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے۔

بالآخر ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔

یہ شہر کے بجائے ایک گاؤں تھا لیکن بھارت کے دیہات خصوصاً جنہیں مضافات کہا جا ... ہے بالکل شہری رنگ میں رنگے دکھائی دیتے ہیں۔ گوکہ یہاں کھیت کھلیان ہی تھے لیکن خاصا تر ... یافتہ ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ گاؤں کے اندر تک پکی سڑک، پانی اور نکاسیٔ آب کا مکمل نظام موجود رہتا۔ البتہ بھارت میں سوئی گیس کے بجائے لوگ سلنڈروں کی گیس استعمال کرتے ہیں پھر ایندھن کے دیگر ذرائع استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

یہ ایک حویلی نما گھر تھا جس کے دیواریں بڑی اونچی اور دروازہ بھی خاصا بڑا اور مضبوط تھا ... لوہے کے ایسے پھاٹک اب کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سفید نوجوان نے پھاٹک کھولا اور ہم ا... جیسی جیپ سمیت اندر آ گئے جس میں اس وقت سوار تھے۔

یہاں تین چار اور نوجوان بھی موجود تھے جو شکلوں سے میری طرح الحق دکھائی دے رہے تھے۔ بانو کو دیکھ کر سب نے احترام سے نظریں جھکا لیں۔

سب مجھے "عامر بھائی"۔ "عامر بھائی" کہہ کر باری باری معانقہ کر رہے تھے۔ بھارت میں یہی میرا نام تھا اور اب مجھے اپنی نئی تنظیم میں اسی نام سے شناخت کیا جاتا تھا۔

یہاں پہنچنے پر بانو نے جیسے نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ بالکل ان بہروپیوں کی طرح جو نئے نئے سوانگ رچانے میں یہ طولیٰ رکھتے ہوں۔ یہاں خلاف معمول صرف مرد ہی نہیں تین ... عورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں یہ سب دراصل "شمش بریگیڈ" کے مجاہد تھے جو بھارت کے مختلف حصوں میں کارروائیاں کرتے تھے۔ مجھے بھی بتایا گیا کہ یہ گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کا رد عمل ہے اور کمانڈر شمش الحق نے جنہیں یہ لوگ بڑے عقیدت اور محبت سے "شمشو بھائی" کہا کرتے تھے یہ جہادی جماعت بنائی تھی۔ بانو نے مجھے یہاں آنے کے بعد اطلاع دی تھی کہ کسی بھی صفت یہاں "شمشو بھائی" سے ملاقات ممکن ہے وہ ہر نئے مجاہد سے خود ملتے تھے۔ کھانا ہم سب نے ایک بڑے کمرے میں زمین پر بچھی چٹائیوں پہ بیٹھ کر کھایا۔ عورتیں ایک طرف اور مرد دوسری طرف کھانا کھا رہے تھے۔ یہیں ایک کمرے میں باجماعت نماز کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا اور جہادی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ اس جگہ کو "شمش بریگیڈ" کے مرکز ہیڈ کوارٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ ادارے بھی میں نے خود ہی قائم کی تھے۔ ابھی تک مجھے کسی نے اس سے متعلق نہیں بتایا ...

یہاں آنے کے بعد خاصی محتاط ہو گئی تھی اور مجھ سے بظاہر ایسا ہی برتاؤ کر رہی تھی جیسا وہ یہاں دوسرے لوگوں سے کرتی تھی اس کے انداز و اطوار یہاں پہنچنے کے بعد جس برق رفتاری سے تبدیل ہوئے تھے۔ اس کے بعد کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ وہ بہترین اداکارہ تھی اور کسی بھی situation کے مطابق خود کو ڈھالنے پر کمال رکھتی تھی۔

رات کے قریباً بارہ بج رہے تھے جب میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ کمانڈر شمش الحق کسی بھی وقت مجھ سے ملاقات کے لیے یہاں آ سکتے ہیں۔ دستک جس شریفانہ انداز سے ہوئی تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ضرور شمشو بھائی ہی ہوں گے۔

دروازہ کھولا تو سامنے تین نوجوان کھڑے تھے تینوں نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور عام سے نوجوان ہی دکھائی دے رہے تھے۔ دو کے کندھے سے کلاشنکوف لٹک رہی تھیں جبکہ تیسرا بظاہر خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔ تینوں باری باری مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ خالی ہاتھ کھڑا سینے والے چھریرے بدن اور قدرے پست قد کے شمشو بھائی تھے جن کے ماتھے پر ایک ابھرا نشان بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ کون ہیں؟

"میرا نام شمش الحق ہے۔ آپ مجھے شمشو بھائی کہہ سکتے ہیں"۔ اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"میری خوش قسمتی کہ آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔" میں نے احتراماً کہا۔ "آئیے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو بے وقت ڈسٹرب کرنے پر معافی چاہتا ہوں لیکن آپ تو خود مجاہد ہیں۔ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے دن اور رات سب برابر ہیں"۔ شمشو بھائی نے کہا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم نہ تو یہاں ایک دوسرے کے مہمان ہیں اور نہ ہی میزبان..." میں نے جواب دیا۔

شمشو بھائی کے ساتھ آنے والے دونوں نوجوان واپس چلے گئے تھے۔ ہم دونوں کمرے کے کونے میں بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے جس پر دو تین گاؤ تکیہ بھی رکھے تھے۔

"ٹیک لگا لیں..." شمشو بھائی نے ایک گاؤ تکیہ میری طرف بڑھایا۔

"کوئی بات نہیں... خیر ہے..." میں نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

میری زندگی اس طرح خاک نشینی میں تو گزری تھی۔ وہاں افغانستان میں نہ کبھی کرسی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نصیب ہوئی نہ کبھی چار پائی۔

شمشو بھائی نے دوسرے کونے میں ٹیک لگالی۔ اس نے اپنے پہلو سے لگا قیمتی آٹو میٹک پستول اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

"آپ کے لئے چائے منگوالوں......" گفتگو کے آغاز سے پہلے اس نے کہا۔

"نہیں نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں"...... میں نے جواب دیا۔

"جیسے آپ کی مرضی...... آپ تو جانتے ہیں ہمارے ہاں تکلف نہیں چلتا۔ مخصوص حالات میں تو کئی کئی دن ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوتا لیکن یہاں چونکہ اللہ نے سہولت دے رکھی ہے اس لئے آپ کا دل چاہے تو پلیز بے تکلفی سے کہہ دیا کریں"...... شمشو بھائی نے کہا۔

"شکریہ" میں نے مختصر جواب دیا۔

شمشو بھائی نے اپنی گفتگو کا آغاز مجاہد کمانڈر کی طرح اللہ کے کلام سے کیا اور مجھے بتایا کہ بھارت بھارت کے مسلمان اپنی بے ہمتی اور بزدلی کی وجہ سے آج تیسرے درجے کی اچھوتوں سے بھی گری ہوئی قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ خاص طور سے بابری مسجد کی شہادت کے بعد سے ہندوؤں کا جب اور جہاں دل چاہتا ہے وہ مسلمانوں کے خلاف ظلم وستم کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا تعلق گجرات سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کے خون سے سرکاری فوج کی موجودگی میں ہولی کھیلی گئی جس کے بعد سے ان کے لئے خاموش بیٹھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ شمشو بھا پولیس کے سابق ملازم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جہاد کا آغاز انہوں نے پولیس کے مال خانے سے چوری کئے اسلحے سے ہی کیا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ نے وسائل پیدا کئے اب ان کے پاس خا مقدار اور تعداد میں مطلوبہ اسلحہ موجود رہتا ہے۔

انہوں نے میرا طویل انٹرویو لیا اور افغانستان میں موجود بعض ایسے کمانڈوں کے نام بتا جو میرے بھی نام سے آشنا تھے، شمشو بھائی کی باتوں سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کا را کسی بین الاقوامی جہادی تنظیم سے ہو چکا ہے اور وہ جہاد کے جدید انداز سے بھی قدرے آ ہیں۔ انہوں نے بطور خاص مجھ سے RXD سے متعلق باتیں کیں اور اس ضمن میں میر صلاحیتوں سے بڑے متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ عربی مجاہدین سے ہم نے بارود لگانے کی خصوصی تربیت حاصل کی تھی۔ اس کے بھی بڑے معترف دکھائی دیئے۔

ہماری گفتگو کا خاتمہ معمولی کی دعاؤں اور نیک تمناؤں پر ہوا۔ شمشو بھائی نے مجھے بتایا کہ

مجھے جلدی میدان جہاد میں متحرک دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہی میری خواہش اور اللہ سے التجا بھی تھی اس کی ایک بڑی وجہ بانو تھی۔

جی ہاں! بانو کی وجہ سے میں نامحسوس طور پر خود کو معتوب کرتا رہتا۔ ایک احساس جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ مجھے لاشعوری کے طور پر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر میرا اس خاتون کے ساتھ زیادہ ساتھ رہا تو خدانخواستہ میں غلط راستے پر نہ نکل جاؤں۔

مجھے یہ بات اب بالکل سچ محسوس ہونے لگی تھی جو میرے مرحوم والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بھی غلط صحبت جو آپ کو ایک لمحہ ہی کے لئے کیوں نہ میسر ہو ساری زندگی کی نیکیوں کو اکارت کر دیا کرتی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں بانو سے دور رہوں کیونکہ اس کی قربت مجھے گناہ کے قریب کر دیتی تھی اور میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ یہ خوف ہمیشہ دامن گیر رہا کہ کہیں میری ساری زندگی کی محنت اور ریاضت بانو کے عشق کی بھینٹ میں نہ چڑھ جائے۔

شمشو بھائی نے صبح کی نماز ہمارے ساتھ ادا کی پھر یہاں سے چلے گئے...... بظاہر وہ بڑے محتاط دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ساتھیوں کا طرز عمل بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

صبح ہم نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا۔ ایک مرتبہ پھر عورتیں اور مرد الگ الگ بیٹھے تھے جس کے بعد "نووارد مجاہدین" ریفریشر کورس شروع ہوا۔ میرے ساتھ تین اور ساتھی تھے۔ ہم نے پہلے سے دی گئی ہدایات اور اپنی تربیت کے مطابق ایک دوسرے کو اپنے وہ نام بتائے تھے جو ہمیں پہلے ہی سے الاٹ کر دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک دوسرے کے متعلق کچھ بھی بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ہدایت نہ بھی کی جاتی تو بھی میں اس سلسلے میں ماضی کے تجربے کی بنیاد پر بہت محتاط تھا اور بھارت میں تو بطور خاص زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

ہمارے انسٹرکٹر نے اپنا تعارف خالد بھائی کے نام سے کروایا۔ اسے چونکہ ہماری استعداد کا علم تھا اس لئے اس نے ہمیں صرف ہندوستانی پولیس، انٹیلی جنس کے طریق کار اور مقامی صورتحال کے متعلق ہی بریفنگ دی تھی جس میں کوئی ایسی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا جب بانو اندر آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے میں گھبرا گیا...... لیکن کیا مجال جو اس کو معمولی سی بھی گھبراہٹ ہوئی ہو۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

وہ بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی.....!!

''بور تو نہیں ہو رہے''؟ اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں''.....

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور مجھے شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ ''ہم لوگ آج رات یہاں سے نکل جائیں گے۔ ایک دوسرے ٹھکانے کی طرف جہاں میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی جب تک کہ کمانڈر صاحب کا اگلا حکم نہ ملے''..... اس نے اپنی دانست میں مجھے خوش خبری ہی سنائی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے ملنے والی اس اطلاع سے مجھے خوشی ہی ہوئی تھی۔ آپ اسے جو بھی معنی دیجئے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ احساس جرم کا شکار ہونے کے باوجود میں بانو سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''میرے ساتھ رہنے سے تم بوریت تو محسوس نہیں کرو گے ناں''..... اس نے میرے اتنے نزدیک آ کر یہ سوال کیا تھا کہ اس کی گرم سانس مجھے اپنے منہ پر لگنے کا احساس ہوا۔

''نہیں بانو ..... میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارے بغیر اب کیسے جی پاؤں گا''.....

مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ لفظ میرے منہ سے نکل رہے تھے۔ جس نے کبھی زندگی میں ایسی بات کی نامحرم کے سامنے کہنے کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ میرے کمرے میں موجود رہی۔ اس دوران مجھے سوائے اس کی موجودگی کے اور کسی بات کا احساس نہیں تھا اور میں غالباً یہی چاہتا تھا کہ وہ اب یہاں سے اٹھ کر کہیں اور نہ جائے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ اسے بہر حال وہی کچھ کرنا تھا جس کے لئے وہ تربیت یافتہ تھی اور ٹائمنگ کا فیصلہ بھی اسی نے کرنا تھا۔

''اچھا میں چلوں..... تم تیار رہنا۔ ہم رات کو کسی بھی وقت یہاں سے نکلیں گے''

اس نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

''او۔ کے''..... میں نے جواب دیا۔

بانو چلی گئی..... مغرب کے بعد مجھے مطلع کیا گیا کہ میں اگلے سفر کے لئے تیار رہوں اور تھوڑی دیر بعد میں ایک ساتھی کے ہمراہ پتلون شرٹ میں ملبوس باہر جا رہا تھا۔ ہم دونوں اس حویلی کے دروازے سے باہر آئے جہاں بانو ایک کونے میں پہلے ہی سے ایک مقامی ساتھی کے ساتھ کھڑی تھی۔

دونوں ساتھیوں نے ہمیں ''خدا حافظ'' کہا۔ اس کے بعد ہمیں یہ سفر اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر ہمیں کوئی سواری یہاں میسر نہیں تھی۔

''زحمت کے لئے معافی لیکن.....''

بانو نے غالباً یہی کہنا چاہا تھا جو میں سوچ رہا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میرے خیال سے اس طرح زیادہ اچھا رہے گا.....'' میں نے کہا۔

بانو نے میری طرف عجیب سی نظروں سے مسکراتے ہوئے دیکھا اور ہم دونوں اس سڑک کی سمت چل دیئے جہاں سے کوئی سواری مل سکتی تھی۔

سڑک قدرے سنسان ضرور تھی لیکن غیر آباد نہیں۔ اکا دکا بس، ٹرک یا کار وغیرہ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم دونوں سڑک کے کنارے ایک بس سٹاپ پر کھڑے تھے جہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ایک بس کی ہیڈ لائٹیں دور اندھیرے میں نمایاں ہو رہی تھیں۔

''اس بس کو ہاتھ دے کر روکنا ہمیں اس میں مراد آباد تک جانا ہے''۔ اس نے کہا میں چوکس ہو گیا۔

بس کو میں نے ہاتھ دے کر روکا۔ ہم دونوں بس میں سوار ہو گئے۔ جہاں پہلے سے سواریاں موجود تھیں لیکن کسی نے ہم پر خاص توجہ نہ دی۔ ہم دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یہاں عورت اور مرد کا اکٹھے بیٹھنا قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے سفر کر رہے تھے۔ بس کی زیادہ سواریاں تو اونگھ رہی تھیں۔ کنڈیکٹر نزدیک آیا۔ میں نے مراد آباد کے دو ٹکٹ لئے۔ اسے پیسے دیئے تو اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

بس کا سفر قریباً دو گھنٹے جاری رہا..... اس دوران بانو جان بوجھ کر بظاہر نیند کے بہانے متعدد مرتبہ مجھ سے ٹکرا چکی تھی۔ باقی سواریوں کا بھی یہی حال تھا لیکن میں چوکس تھا۔ اچانک بس کو جھٹکے لگنے لگے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا سڑک پر سرخ لائٹیں جل رہی تھیں جس کا مطلب تھا ہمیں پولیس ناکے پر روکا گیا ہے۔

اس سے پہلے بھی طویل سفر کے دوران ایسا دو تین مرتبہ ہوا تھا لیکن اس مرتبہ نجانے کیوں میرا دل دھک سے رہ گیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

اچانک بریک لگنے سے اونگھتے مسافر بیدار ہو گئے تھے۔

کیا ہوا؟

کیا بات ہے؟

کیا مصیبت آ گئی؟

یار ہم تو پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ ہیں!

مختلف طرح کے تبصرے ہو رہے تھے۔ بانو ماحول سے قطعی بے نیاز دکھائی دے رہی تھی۔

بس رُک گئی اور پولیس کے تین چار مسلح جوان اندر داخل ہوئے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی پکڑی ہوئی تھی۔ دو پولیس والے دروازے پر ہی رُک گئے جبکہ ٹارچ والا ہر مسافر کو مثبت انداز سے دیکھتا ہمارے نزدیک آ کر رُک گیا۔ اس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

''کیا نام ہے تیرا اوئے؟''..... اس نے بڑے اکھڑ اور پولیس والے لہجے میں سوال کیا۔

''کمار''..... میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

میرے لئے یہ صورتحال اتنی اچانک اور پریشان کن تھی جس نے مجھے واقعی چکرا کر رکھ دیا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں سے کیسے ڈیل deal کروں کیونکہ اب تک اس طرح کی نوبت نہیں آئی تھی۔ عموماً بانو اور دوسرے ساتھی یہ معاملات سنبھال لیا کرتے تھے۔

''ہوں ں ں.....'' اس نے عجب سے لہجے میں مجھے گھورتے ہوئے پوچھا ''کہاں سے آئے ہو؟''

خدا جانے اسے مجھ پر شک ہو گیا تھا یا میرے پہلو میں بیٹھی بانو پر اس کی نظر تھی۔

''کلاس پور سے''..... میرے بجائے بانو نے جواب دیا شاید اسے میری بے بسی پر ترس آ گیا تھا۔

''تم کون ہو اس کی؟'' پھاڑ کھانے والے لہجے میں اس پولیس والے نے بانو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''گھر والی''..... اور میرے ساتھ ذرا تمیز سے بات کرنا ورنہ ابھی آٹے دال کا بھاؤ بتا دوں گی.....

بانو کے جواب نے کم از کم مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ ایسی جرأت اور بے باکی میں نے کم ہی دیکھی تھی۔

''دھمکی دے رہی ہو..... کیا سمجھتی ہو خود کو؟'' پولیس والے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری دکھا رہا تھا لیکن میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اندر سے وہ گھبرا رہا ہے۔ بانو کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی ضرور جس نے اسے شاید کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میرے منہ نہ لگنا..... ملاؤں رستوگی جی کا نمبر.....'' اس نے اچانک اپنے پرس سے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

موبائل نکال کر کہا۔

''کیا ہوا میڈم..... کیا بات ہے؟'' اس مرتبہ اس کے انچارج نے مداخلت کی..... شاید وہ معاملے کی نوعیت کو جان گیا تھا۔

''اسی سے پوچھ لو ناں.....'' بانو کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔

''سر جی! میں نے تو.....'' پولیس والے نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی لیکن اس کے انچارج نے شاید بانو کو پہچانتے یا پھر اپنے لئے کوئی مصیبت مانتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

''سوری میڈم..... وہ آپ کو علم ہے ناں..... آج کل یہاں کیسے معاملات چل رہے ہیں..... ہم تو مجبور ہیں میڈم۔ ہمیں بھی اس طرح سواریوں کو پریشان کرنا اچھا نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے..... کیا کریں'' ..... اس نے اپنی دانست میں صفائی پیش کی۔

اب چپ چاپ بس سے اتر جاؤ اور آئندہ سے اپنے ماتحتوں کو سمجھا دو کہ گدھے اور گھوڑے کی تمیز کرنا سیکھیں۔ بانو ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھی۔

''سوری میڈم..... کہہ کر پولیس والے نیچے اتر گئے۔

بس کی تمام سواریاں باری باری بانو کو دھنوا دھینوا کہہ رہی تھیں۔ ان کے نزدیک بانو بڑی ہی معتبر شخصیت بن چکی تھی۔ ہمارے سفر کا اختتام علی الصبح جس جگہ پر ہوا اس کا نام شاید ''بلاس پور'' تھا۔ بس یہاں پہنچنے تک قریباً خالی ہو چکی تھی اور بمشکل پانچ چھ ہمارے علاوہ اور ایسے مسافر تھے جن کی منزل ''بلاس پور'' تھی۔

بلاس پور پر ایک جیپ ہماری منتظر تھی.....!

اس میں دو ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ دونوں اپنے اطوار اور انداز سے ہندو دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بالکل مقامی ہندوؤں کے انداز میں ہمیں ''ویل کم'' کیا مجھے پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا۔ کہ یہ بڑا خطرناک پہاڑی اور جنگلی علاقہ ہے جس کی سرحدیں نیپال سے ملتی ہیں۔ اس علاقے میں میلوں تک خطرناک پہاڑی سلسلے یا پھر گھنے جنگلات تھے۔ جہاں ڈاکوؤں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہاں بدمعاشوں، لیٹروں اور ڈاکوؤں کے درجنوں گروہ سرگرم عمل تھے اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ یہ سب ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ اس علاقے میں پولیس کے ساتھ تو شاید ہی کبھی کوئی ڈاکو مقابلے میں پولیس کے ساتھ تو شاید کبھی کوئی ڈاکو مقابلے میں مارا گیا ہو۔ البتہ آپس کے مقابلوں میں ضرور ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ مجھے دوران سفر بانو نے بتا کر یہاں محتاط رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ ''اس خطرناک علاقے میں ہمارا کیا کام؟''

میرے اس سوال کے جواب میں بانو نے بتایا کہ یہاں ہمارے تربیتی مرکز اور اہم ٹھکانے موجود ہیں۔ سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے خطرے کی صورت میں ہمارے ساتھی جنگلوں اور پہاڑی سلسلوں میں روپوش بھی ہو جاتے ہیں اور سرحد بھی عبور کر جاتے ہیں۔

جیپ ہمیں ایک قدرے پہاڑی علاقے میں لے گئی۔ ہمارے سفر کا اختتام بمشکل پچیس منٹ بعد ہو گیا۔ جب ہم دونوں اپنے نئے ساتھیوں کے ساتھ اس مرکز میں داخل ہوئے جو کچے پکے ٹیڑھے میڑھے راستوں کے اختتام پر ایک حویلی اور کچھ مکانات کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس گاؤں کا نام ''ہمالیہ'' تھا جہاں ہمارے ساتھیوں نے اپنا مرکز قائم کیا ہوا تھا۔

''ہمالیہ'' پر بانو نے میرے ساتھ سارا دن اور رات گزاری اور اگلے روز مجھے مقامی کمانڈر ''مرزا بھائی'' کے سپرد کر کے رخصت ہو گئی۔ دم رخصت اس نے معمول سے بہت زیادہ جذباتی پن کا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے زندگی کے اس تلخ تجربے سے گزرنا پڑا جو بظاہر بڑا سحر انگیز، دلکش لیکن اصل میں بڑا ہی تباہ کن اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ مجھے کافی دیر تک خود پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں وہی افضل خان ہوں جس نے افغانستان میں امریکی اور روسی فوجوں کے ساتھ جہاد کیا تھا یا میرے بدن میں کوئی اور خبیث روح گھس آئی تھی۔ افضل..... میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ لیکن یہ میرے بس میں کچھ نہیں رہا۔ تمہیں اپنے نزدیک پا کر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا..... خدارا مجھے غلط نہ سمجھنا افضل!''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اس طرح آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا کہ میں کٹ کر رہ گیا اور جذباتی انداز میں اس سے بغل گیر ہو گیا۔

''ہم جلدی دوبارہ ملیں گے..... پھر ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔'' اس نے آہستگی سے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

بانو چلی گئی!

مرزا بھائی نے اگلے ہی روز مجھے دو ساتھیوں کے ساتھ ''ریکی'' کروائی۔

ہم بلاس پور کی ڈسٹرکٹ کورٹس میں گئے۔ جہاں اس نے سیشن جج مظفر خان کی عدالت دکھائی۔ ہم نے مظفر خان کو دیکھا۔ ڈھلتی عمر کے اس بزرگ نما نوجوان نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوئی تھیں اور شکل ہی سے کوئی پرلے درجے کا عیاش دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار روز تک میں اور مرزا بھائی اس کے معمولات کا جائزہ لیتے رہے۔

''نام تو اس کا مسلمانوں والا ہے لیکن کوئی بدترین ہندو بھی اس جیسا ظالم اور عیاش نہیں ہو گا۔ یہاں کی پولیس مقامی مسلمانوں میں سے جسے چاہے، 'آتنک وادی' قرار دے کر مظفر خان سے دس بیس سال کی سزا دلا دیتی ہے۔ اسے شاید اسی لئے رکھا ہوا ہے''..... مرزا بھائی نے اس کے متعلق بتایا۔

بھارت میں میرے جہادی مشن کا آغاز مظفر خان کے قتل سے ہونا تھا۔ ہم نے اسے بلاس پور کے ''جم خانہ کلب'' کے باہر اس وقت مارنا تھا جب وہ ہفتے کی رات کو شراب و شباب کے نشے میں جھومتا اپنے گھر واپس جاتا تھا.....!

ساتویں دن میں اور مرزا بھائی مشن پر جا رہے تھے۔ ہمارے دو ساتھی پہلے ہی سے موقع پر مقامی ملازمین کے روپ میں موجود تھے۔ مظفر خان چونکہ ''آتنک واد'' کے خلاف فیصلے دینے میں خصوصی شہرت کا حامل تھا اور اسے دھمکیاں بھی ملتی رہتی تھیں۔ اس لئے سرکار نے بھی اس کی حفاظت کے لئے خصوصی گارد اسے دے رکھے تھی۔ ہمیں امید تھی کہ ہفتے کی رات کو جم خانہ کلب میں ممکن ہے اس کی سیکورٹی معمول کے مطابق نہ ہو لیکن ایسا نہیں تھا.....!!

میں اور مرزا بھائی مقامی ہندو نوجوان کے انداز میں ایک موٹر بائیک پر وہاں پہنچے تھے جہاں مقامی ساتھی پہلے سے ڈیوٹی دے رہے تھے۔

انہوں نے موبائل پر ہمیں بتا دیا کہ مظفر خان کلب میں اپنی معمول کی حرامکاری میں مصروف ہے اور پولیس کی ایک گاڑی بھی اس کی حفاظت کے لئے باہر کھڑی ہے۔

یہ ہمارے لئے کوئی غیر معمولی صورتحال نہیں تھی۔ ہم ذہنی اور جسمانی طور پر تمام معاملات سے نمٹنے کے لئے تیار تھے..... بلاس پور کی آبادی بمشکل ڈیڑھ دو لاکھ پر مشتمل ہو گی۔ انگریزوں کے زمانے کا یہ ''جم خانہ کلب'' شہر سے باہر جنگل کے درمیان سے گزرتی سڑک کے اختتام پر ایک نہایت سرسبز اور خوبصورت جھیل کے کنارے بنا ہوا تھا جہاں عام آدمی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مرزا بھائی نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق موٹر سائیکل راستے میں ایک جگہ اس طرح جھاڑیوں میں چھپا دی کہ رات کے اندھیرے میں اس کے دکھائی دینے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا..... اب ہم پیدل بڑے محتاط انداز میں کلب کی طرف جا رہے تھے۔ ہم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ یہاں کے مقامی دیہاتی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے کسی کو ہم پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے کپڑے بھی دیہاتیوں والے پہن رکھے تھے اور سردی سے بچنے کے لئے بڑے بڑے دُھسے اوڑھ رکھے تھے۔ جن میں اپنا اسلحہ چھپایا ہوا تھا۔

جم خانہ کلب کی پارکنگ کے سامنے ہم پہلے سے طے شدہ پھولدار بیلوں کے پیچھے اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے کہ ہم ان پھول دار جھاڑیوں کا حصہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ پارکنگ میں مظفر خان کی گاڑی اور کچھ فاصلے پر پولیس کی جیپ بھی دکھائی دے رہی تھی جس میں سردی سے ٹھٹھرتے تین سپاہی اونگھ رہے تھے۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں اسے گالیاں بھی دے رہے ہوں گے۔

رات قریباً ڈیڑھ بجے خدا خدا کر کے وہ جیسے ہی کلب سے باہر نکلا۔ مرزا بھائی کے موبائل پر میسج آ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی پوزیشن لے لی۔ یہاں سے مظفر خان صاف دکھائی دے رہا تھا وہ ایک فاحشہ عورت کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گیٹ سے باہر نکلا اور اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ گاڑی کا دروازہ ایک مودب گارڈ نے کھولا۔ پولیس کے جوان چوکنے ہو کر اس کی گاڑی کے گرد کھڑے ہو گئے۔ فاحشہ عورت سے مقامی رسوم و رواج کے مطابق مظفر خان نے رخصت لی اور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ مسلح گارڈ اور ڈرائیور نے سنبھال لی۔ گاڑی بل کھاتے راستے سے نیچے ہماری طرف آنے لگی۔ مظفر خان کی کار کے آگے پولیس کی گاڑی تھی جس کے بعد اس کی کار طے شدہ منصوبے کے مطابق جیسے ہی دونوں گاڑیاں ہماری رینج میں آئیں۔ ہمارے دونوں ساتھیوں نے پولیس کی گاڑی پر یکے بعد دیگرے تین چار گرینڈ پھینک دیئے۔ اچانک حملے سے وہ حواس باختہ ہو گئے۔ پولیس کی جیپ درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی اور مظفر خان کی گاڑی کے ڈرائیور نے اپنی کار اس میں دے ماری۔

اب ہمارا کام شروع ہو گیا تھا۔ میں اور مرزا بھائی بھاگ کر اپنی پوزیشن سے نکلے اور ہم نے کار پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ میری گن کی گولیوں نے اگلے چند سیکنڈ ہی میں مظفر خان کو چاٹ لیا۔ اس کا ڈرائیور اور گارڈ بھی مارا گیا..... سب کچھ ہماری توقعات کے مطابق ہو رہا تھا لیکن اچانک ایک بپتا ہم پر آن پڑی۔

یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ آج یہاں مقامی فوجی یونٹ کے افسران نے بھی آنا ہے اور جب یہ لوگ جم خانہ میں آئے تو دس بارہ مسلح فوجی ان کی حفاظت کے لئے پہلے سے

Uploaded By Muhammad Nadeem

یہاں موجود ہوتے تھے۔ فوجیوں نے گاڑیاں جم خانہ کے دوسری طرف پارک کی تھیں۔ اس لئے شاید ہمارے ساتھیوں نے بھی اس کا نوٹس نہیں لیا۔

یہ شاید ایس ایس جی کی کوئی یونٹ تھی۔ جیسے ہی فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں گونجیں وہ چوکس ہو گئے۔ یہاں ڈاکوؤں اور پولیس کی آنکھ مچولی تو معمول کی بات تھی لیکن اب دہشت گردی کی کارروائیاں بھی ہونے لگیں تھیں۔ کمانڈروز نے اپنی تربیت کے مطابق ہمیں منٹوں میں گھیر لیا اور ہم پر خودکار اور جدید اسلحہ سے گولیاں برسانے لگے۔ میں نے خود سے چند فٹ کے فاصلے پر مرزا بھائی کو دس بارہ گولیاں لگ کر گرتے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اگر میں جھاڑیوں کی طرف چھلانگ نہ لگاتا تو شاید آج آپ کو اپنی کہانی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

جھاڑیوں میں پہنچ کر میں نے چند لمحوں کے لئے صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے ساتھی بالکل اناڑی یا پھر کم از کم فوج کے مقابلے میں تو بالکل تربیت یافتہ نہیں تھے۔ وہ گاجر مولیوں کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے میرے لئے سوائے فرار کے اور کوئی راہ باقی نہیں بچی تھی۔ اس مرحلے پر افغانستان کے تربیتی کیمپوں میں حاصل کی گئی تربیت کام آ گئی۔ میں ایک ڈھلان پر لڑھکتا ہوا گہرائی میں چلا گیا اور اب میں دیوانہ وار اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ مجھے ایک اطمینان ضرور تھا کہ ایک مرتبہ ان کے شکنجے سے نکلنے کے بعد میں انشاءاللہ ان کے ہاتھ نہیں لگوں گا۔

لیکن..... میں جاؤں گا کہاں؟ اس سوال نے میرے جسم پر چند لمحوں کے لئے تو کپکپی ہی طاری کر دی.....

میرے بدن پر ایک گرم چادر نما کھیس اور ہاتھ میں ایک گن تھی جو میں نے قدرے محفوظ ہوتے ہی ضائع کر کے پھینک دی تھی۔ ایک پستول اور دو ہینڈ گرنیڈ پہلے ہی افراتفری میں گر گئے تھے۔ خدا جانے وہ کون سا راستہ تھا جس پر میں چلتا چلا جا رہا تھا۔

جنگل ختم ہونے کے بعد میں تین چار دیہاتوں سے گزرنے کے بعد ایک سڑک عبور کر کے اب جھاڑیوں اور سرکنڈوں سے اٹی ایک کچی سڑک پر جا رہا تھا جب اچانک ہی زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ بائیں طرف کی جھاڑیوں سے کوئی اچھل کر سامنے آ گیا۔ صبح کاذب کا وقت تھا اس لئے سب کچھ مجھے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ کہ میرے سامنے پولیس کا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

"اس سے کہاں سے آئے ہو؟" کانسٹیبل نے کتے کی سی آواز میں پوچھا۔

"ارے گاؤں سے آ رہے ہیں اور کہاں سے آئیں گے۔" میں نے گھبرانے کی اداکاری کی۔

"کون سے گاؤں سے؟" اس کی مکروہ آواز پھر گونجی۔

میں ایک دم سٹپٹا گیا۔ میں نے اس گاؤں میں کئی گھنٹے گزارے تھے مگر مجھے وہاں کا نام معلوم نہیں تھا۔ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ "ارے ہمرا رستہ کا ہے کھوٹا کرت ہو بھیا! ہم ٹھاکر صاحب کے گاؤں سے آ رہے ہیں۔" پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "مگر بھیا! ای لفڑا کا ہے؟ ادھر گاؤں میں بھی بہوت پولیس تھی کوئی واردات ہوئے گئی ہے کا؟" یہ زبان جو میں بول رہا تھا گزشتہ بیس دنوں میں سیکھی تھی۔

کانسٹیبل نے ایک دم مجھ پر رائفل تان لی اور کرخت لہجے میں بولا۔ "اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور آگے آگے چلو۔"

"مگر کا ہے؟" میں نے جھلا کر دیہاتی انداز میں ہی جواب دیا۔

"ابھی جان جاؤ گے سب کچھ"۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم موہن ہیں اور....."

"بکواس بند کرو"۔ کانسٹیبل نے چیخنے کی کوشش کی تو اسے کھانسی آ گئی۔ "چلو اس طرف!" اس نے رائفل سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ نئی افتاد گلے پڑ گئی تھی۔ کانسٹیبل نہ جانے مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔ ممکن ہے وہاں اس کے اور ساتھی بھی موجود ہوں۔ میں اس وقت تنہا آدمی سے تو نمٹ بھی سکتا تھا مگر یہاں سے باہر نکل کر نہ جانے کیا صورت حال پیش آتی۔ میں نے اس کانسٹیبل سے وہیں نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں چلتے چلتے بُری طرح لڑکھڑایا۔ کانسٹیبل مجھ سے چند قدم پیچھے تھا۔ میں رکا تو وہ ایک دم میرے نزدیک پہنچ گیا اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ میں نہتا ہو کر اس پر حملہ کرنے کی جرأت کروں گا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور رائفل کی نال دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر کانسٹیبل کو زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے رائفل ایک طرف اچھالی اور اس سے پہلے کہ وہ حلق سے کوئی آواز نکالتا، میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ یہ ساری کارروائی ایک منٹ سے بھی کم

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

وقت میں ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ میں کانسٹیبل کی جان لینا نہیں چاہتا اور اسے یونہی چھوڑنے میں بھی خطرہ تھا۔ وہ ہوش میں آتے ہی چیخ چیخ کر سب کو میرے بارے میں بتا دیتا اور پولیس مجھے دھر لیتی۔ میں اس علاقے سے واقف نہیں تھا ورنہ مین روڈ پر جانے کی بجائے کسی گاؤں میں چھپنے کی کوشش کرتا۔ میں نے کانسٹیبل کی رائفل اٹھا لی جو اس کی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ میں زنجیر سے منسلک تھی گولیوں کی بیلٹ بھی قبضے میں کی اور وہاں سے نکلنا چاہا مگر پھر وہی سوال آ گیا کہ کہاں جاؤں؟ میں رائفل ہاتھ میں لے کر آزادانہ گھوم بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں نے چند لمحے غور کیا۔ پھر اسی جھنڈ کی طرف بڑھ گیا اور پھرتی سے ایک گھنے درخت پر چڑھ گیا اوپر پہنچ کر اطمینان سے شاخوں میں پھنس کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد جب پولیس میری تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلی جائے گی تو میں بھی اتر کے الہ آباد کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میں شاخوں میں کچھ یوں پھنس کر بیٹھا کہ اگر بیٹھے بیٹھے مجھے نیند بھی آ جاتی تو میں نیچے نہیں گرتا۔

وہ درخت خاصا گھنا اور اونچا تھا اس لئے میں دور تک دیکھ سکتا تھا۔ جس جگہ وہ کانسٹیبل پڑا تھا اس کے دونوں طرف گھنی اور قدم آدم جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف کچھ فاصلے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ تین پولیس والے جیپ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور اسی طرف دیکھ رہے تھے جہاں ان کا ایک ساتھی بے ہوش پڑا تھا۔ پھر انہوں نے زور زور سے اپنے ساتھی کو آوازیں دیں۔ ان کی آواز تو مجھ تک پہنچ رہی تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اس طرف بڑھنے لگا جہاں بے ہوش کانسٹیبل پڑا تھا۔ میں نے خود کو اچھی طرح پتوں میں چھپا لیا۔

وہ کانسٹیبل جونہی جھاڑیاں عبور کر کے آگے آیا۔ اس کی نظر اپنے بے ہوش ساتھی پر پڑی۔ وہ حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا اور چند لمحے یونہی اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا، پھر جیسے وہ ایک دم ہوش میں آ گیا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ جیپ کے پاس کھڑے ہونے والوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا، پھر جلدی سے اپنی رائفلیں شانوں سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیں اور آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اسی وقت بے ہوش کانسٹیبل بھی ہوش میں آ گیا اور چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہنے لگا۔ اس کی بات سن کر وہ سب عجلت میں جیپ کی طرف بھاگے، پھر دو آدمی وہیں رہ گئے، دو جیپ

میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ وہ لوگ یقیناً میری تلاش میں گئے ہوں گے۔ جانے والوں میں وہ بھی شامل تھا جو میرے ہاتھوں بے ہوش ہوا تھا۔

میں درخت کی شاخوں میں پھنسا ہوا ان کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔ رہ جانے والے دونوں کانسٹیبل شدید بوریت کا شکار تھے اور اکتائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جیپ واپس آ گئی۔ وہ لوگ آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے، پھر مختلف سمتوں میں جا کر مجھے نئے سرے سے تلاش کرنے لگے۔ ان کی یہ تلاش کافی دیر تک جاری رہی۔ میرا اندازہ تھا کہ انہوں نے کم از کم ڈیڑھ پونے دو گھنٹے تک مجھے تلاش کیا ہے۔ اس وقت سورج خاصا چڑھ آیا تھا اور ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اگر میں نامساعد حالات کا شکار نہ ہوتا تو جی بھر کے انجوائے کرتا۔ وہ منظر بہت دلکش تھا۔ دور دور تک ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان تھے اور مٹی سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی مہک تھی مگر میں اس منظر سے لطف نہیں اٹھا سکتا تھا۔

وہ سب ایک ایک کر کے جیپ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر غصے، جھنجلاہٹ اور مایوسی کے تاثرات تھے، پھر وہ سب جیپ میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گاؤں کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی پولیس والا باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ لوگ اب تک وہاں کیا کر رہے تھے؟ پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ وہ لوگ کسی دوسرے راستے سے نکل گئے ہوں اس خیال کو میں نے خود ہی رد کر دیا۔ انہیں اب تک ٹھاکر کی لاش مل چکی ہوگی۔ رنبیر سنگھ نے بھی ٹھاکر کے قتل کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہوگا۔

اچانک گاؤں کی طرف سے گرد کا ایک بادل سا اٹھتا دکھائی دیا، پھر ایک ایک کر کے پولیس کی کچھ جیپیں وہاں سے گزریں تو کھیتوں میں کام کرنے والے سر اٹھا اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے۔

میں اس کے بعد مزید آدھے گھنٹے تک وہاں دیکا بیٹھا رہا، پھر ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد درخت سے نیچے اتر آیا۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر اور ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ نیچے اترنے کے بعد فوری طور پر مجھ سے سیدھا نہ کھڑا ہوا گیا اور میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا مگر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ کھیتوں میں لوگ کام کر رہے تھے اور وہاں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ اترنے سے پہلے میں نے کانسٹیبل کی رائفل اور گولیوں کی بیلٹ درخت کے اوپر شاخوں میں پھنسی ہوئی چھوڑ دی تھی۔ درخت پر چڑھنے سے پہلے میں نے اپنے جوتے اتار کر کہیں ایک کونے میں باندھ لئے تھے۔ اترنے کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

بعد میں نے جوتے پہنے رائفل کو کندھے پہ ڈالا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ میرا رُخ ایک مرتبہ پھر مین روڈ کی طرف تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ میرے کپڑے دھول میں اَٹ گئے تھی، بالوں پر بھی گرد کی تہہ ہوگی اور میرا اندازہ تھا کہ میرا چہرہ بھی گرد میں چھپ گیا ہوگا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ اب وہ لوگ بھی پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچان سکتے تھے۔ جنہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میں بغیر کسی رکاوٹ کے مین روڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر میں پھر الجھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائیں سمت میں جانے والی گاڑی کو روکوں یا بائیں طرف جانے والی کو۔ میں اگر مخالف سمت میں جانے والی گاڑی کو روکتا اور ڈرائیور سے کہتا کہ مجھے الٰہ آباد جانا ہے تو وہ فوراً میری طرف سے شک و شبے میں مبتلا ہو جاتے۔

پھر اس الجھن کا حل بھی میں نے ڈھونڈ لیا۔ اس سڑک پر یقیناً سنگ میل پتھر بھی موجود ہوں گے۔ ان کے ذریعے مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ الٰہ آباد کس طرف ہے۔ تقریباً چار پانچ فرلانگ چلنے کے بعد مجھے سنگ میل دکھائی دیا۔ اس پہ ایک طرف ہندی اور انگلش میں لکھا ہوا تھا کہ الٰہ آباد 200 کلومیٹر! میں اسی سمت میں روانہ ہوگیا۔ سڑک پہ گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ سمت کا تعین ہونے کے بعد میں گاڑی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں سے دو تین پرائیویٹ کاریں گزریں۔ میں نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا مگر وہ دھول اڑاتی گزر گئیں۔ پھر مجھے ایک بس دکھائی دی وہ کچھا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اسے بھی رکنے کا اشارہ کیا مگر وہ بھی نہ رکی۔ پھر دو تین ٹرک آئے، وہ بھی بغیر رکے گزر گئے۔

ایک منی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ اس کے پچھلے حصے میں سامان لدا ہوا تھا جسے ترپال سے ڈھک دیا گیا تھا۔ میں نے بے دلی سے اسے بھی رکنے کا اشارہ کیا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ یہ بھی نہیں رکے گا لیکن خلاف امید ٹرک ڈرائیور نے بریک لگا دیا اور ٹرک مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ پھر پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک کلینر ٹائپ آدمی نے گردن کھڑکی سے باہر نکالی اور اکھڑ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''ہم الٰہ آباد جائیں گے بھیا!'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اگر تم وہاں تک چھوڑ دو تو تمہیں دعائیں دیں گے''۔

اس نے گردن موڑ کے ڈرائیور سے کچھ کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آ جاؤ''۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں لپک کر بیٹھ گیا۔ سکھ ڈرائیور نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر ٹرک کو گیئر میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اوئے تو کہیں مٹی میں لوٹ لگا کے آیا ہے؟''

''وہ کیا ہے کہ ہم ابھی سائیکل سے گر پڑے تھے۔'' میں نے حتی الامکان خود کو احمق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''اسی لئے آپ کو بھوت لگ رہے ہیں۔''

میری بات پر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میں بھی احمقانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر ڈرائیور کا ساتھی اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ وہ ہندی کا کوئی اخبار تھا۔ میں نے یونہی سرسری سے انداز میں اخبار دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے ڈرائیور کا ساتھی بولا۔ ''یار ہرنام! یہ پاکستانی دہشت گرد ہمارے ہاتھ لگ جائے تو جیون سپھل ہو جائے۔ سرکار نے اس کی گرفتاری پر دو لاکھ کا پشکار (انعام) رکھا ہے، پورے دو لاکھ کا!''

''اوئے سپنے دیکھنا چھوڑ دے دیبو!'' ڈرائیور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ کہیں کا نہیں رہے گا''۔

''اس پر دو لاکھ روپے کا پرشکار ہے؟'' میں نے تصویر پر انگلی رکھی۔

''یہ آتنک وادی کل رات رنگ پور میں تھا۔ وہاں اس نے رنگ پور کے ٹھاکر سمیت چھ آدمیوں کا خون کیا ہے۔''

''باپ رے باپ، چھ آدمیوں کا خون!'' میں نے چہرے پر خوف طاری کر لیا، پھر دیبو سے بولا۔ ''مجھے یہ خبر پوری پڑھ کر سناؤ نا!''

''ابے تو تو بالکل ہی ان پڑھ ہے۔'' دیبو نے مجھ سے کہا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''چل تو بھی سن لے۔ شاید یہ ''آتنک وادی'' تیرے ہی ہاتھ لگ جائے۔'' یہ کہہ کر وہ خبر پڑھنے لگا۔ پاکستانی دہشت گرد خان نے رنگ پور میں چھ آدمیوں کا خون کر دیا۔ معلوم ہوا ہے کہ خان پاکستان ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور کسی خاص مشن پر بھارت آیا ہے۔ اسے یہاں بھی چند بااثر لوگوں کی امداد ملی ہوئی ہے۔ پولیس اور دوسری ایجنسیوں کو چوکس کر دیا گیا ہے۔ سرکار نے خان کی گرفتاری پر دو لاکھ روپے کا انعام کا اعلان کیا ہے۔

خبر سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ گویا بھارتی حکومت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میرا تعلق پاکستانی ملٹری انٹیلی جنس سے ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یوں بھی پاکستان کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے وطن کی سلامتی کی خاطر وہاں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

دھکے کھا رہا تھا مگر اس کا تعلق حکومت پاکستان سے نہیں تھا۔ اس خبر سے یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا کہ ہمارا کوئی ساتھی زندہ گرفتار ہو گیا ہے جس نے انہیں میرے متعلق بتا دیا تھا مجھے وہ سب ''خان بھائی'' ہی کہتے تھے۔

الہ آباد میں ایک مہینے بعد ہندوؤں کا زبردست میلا لگنے والا تھا۔ پورے بھارت سے دس لاکھ پنڈت، پجاری اور جوگی اس میلے میں شرکت کرتے تھے۔ یہ میلا الہ آباد میں عین اس جگہ لگتا تھا جہاں تینوں دریا یعنی گنگا، جمنا اور سرسوتی کا سنگھ تھا۔ تینوں دریاؤں کے دھارے یہیں آ کر ملتے تھے۔ یہ میلا ''کمبھ'' کے نام سے مشہور تھا۔ مجھے اس میلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس طرح کے تماشے دنیا بھر میں لگتے رہتے ہیں مجھے تو اپنی جان بچانا اور بانو تک پہنچنا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی اور ٹرک اپنی مخصوص رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہو مہاراج؟''

دیبو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا، ہم الہ آباد کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔

''تمہیں کہاں جانا ہے پہلوان؟'' دیبو نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں پوچھا۔

''بس مجھے یہیں اتار دو'' میں نے اچانک کہا۔

ڈرائیور نے ٹرک روک دیا۔ میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔ وہ الہ آباد کا پُر رونق علاقہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں گھما کر دوکانوں کے بورڈ دیکھنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر بورڈ ہندی میں تھے، کچھ دوری پر ایک بورڈ نظر آیا جس پر نیچے کی جانب انگلش میں بھی لکھا تھا۔ میں ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا، کچھ دن یہاں گزار چکا تھا، مجھے یاد آ گیا کہ یہاں سے اسٹیشن زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ سائیکل رکشا والے دو روپے لیتے تھے مگر میرے پاس تو دو روپے بھی نہیں تھے۔ میں پیدل ہی اندازے سے فوارہ چوک کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت غالباً شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ میں تیز قدم رکھتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر میں فوارہ چوک پر پہنچ گیا مگر اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ ساتھی پولیس کی تحویل میں تھا۔ پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا کہ پولیس نے صرف ایک ساتھی کو گرفتار کیا تھا، دوسرے تو ابھی تک آزاد ہوں گے۔ وہ بنگلہ بھی اپنی جگہ پر ہو گا۔ میں نے سوچا کہ مجھے وہاں جانا چاہئے، پھر خود ہی میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ پولیس کے علم میں بھی تھا کہ اسی بنگلے میں مقیم تھا۔ یا تو پولیس نے وہ بنگلہ سیل کر دیا ہو گا

یا پھر وہاں کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ وہاں جانے کا مطلب، خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا تھا۔

چلتے چلتے میری نظر ایک اسٹال پر پڑی۔ وہاں بھارت سے شائع ہونے والے مختلف اخبارات اور رسائل سجے ہوئے تھے، بیشتر اخبارات ہندی کے تھے مگر چند اخبارات انگلش، بنگلہ اور دوسری زبانوں کے بھی تھے۔ مجھے ان میں اردو کا بھی ایک اخبار نظر آیا۔ میں نے اردو اخبار کی طرف دوبارہ دیکھا بھی نہیں کہ مبادا اس وجہ سے اسٹال والے کو کچھ شبہ ہو جائے۔ حالانکہ وہاں اردو پڑھنے والے بہت کم تعداد میں ہیں۔ میں نے انگلش کا ایک اخبار اٹھانا چاہا مگر پھر اپنے حلیے کا خیال آ گیا۔ وہاں مزید رکنا بھی غیر مناسب تھا جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنی کسی بھی حرکت سے دوسروں کو شبے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے ضرورت سے زیادہ ہی محتاط تھا۔

مجھے ان گلی کوچوں میں ٹہلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ رات ہونے سے پہلے پہلے مجھے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔ ورنہ پولیس آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیتی۔ یوں بھی سوائے ایک کھیس کے میرے پاس کچھ نہیں تھا اور اس کھیس میں سردی نہیں رک سکتی تھی۔ میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں اطمینان سے رات گزر جائے اور میں سردی سے بھی محفوظ رہوں۔ چلتے ہوئے میں مختلف دوکانوں کے تھڑوں پر بھی نظر ڈال لیتا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ رات کو وہ جگہ مجھے خالی ہی ملے گی۔ ممکن ہے وہاں رات کو کسی فقیر، کسی مزدور یا بے گھر انسان کا ڈیرہ ہو۔ میں چھوٹے سے ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرا تو میرے قدم سست پڑ گئے۔ روٹی کی سوندھی سوندھی انتہا انگیز مہک میری ناک سے ٹکرائی تو میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل کا مالک ادھیڑ عمر اور فربہ جسم کا ایک مسکین سا آدمی تھا۔ خدا جانے میں کیسے اس سے ٹکرا گیا اور وہ میرے گلے لگ گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ میں نے سوچا تھا کہ ڈانٹ ڈپٹ کر ہوٹل والے کو پیسے دلا دوں گا جو کسی غنڈے سے گاہک سے پیسوں کے لئے الجھ رہا تھا۔ ہوٹل مالک کی ہمدردی کے لئے میں آگے بڑھا، یوں ہوٹل والا میرا احسان مند ہو جاتا اور میں نہ صرف کھانا کھاتا بلکہ رات بھی وہیں کہیں گزار دیتا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔ وہ معمولی اچکے میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے مگر بات اس حد تک بڑھ جائے تو پولیس کی مداخلت یقینی ہوتی ہے اور میں یہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ غنڈہ جسے ہوٹل والا راجو کہہ رہا تھا سمجھا میں جان بچا کے بھاگنے کے چکر میں ہوں۔ میں ایک دم شیر ہو گیا اور اس نے مجھ پر چھلانگ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

لگا دی۔ وہ آدمی خاصا پھرتیلا تھا۔ میں نے اسے جھکائی دینے کی کوشش کی مگر بچتے بچتے بھی میرا دائیں بازو پہ چاقو کی ایک لکیر کھنچ گئے۔ راجو واقعی مجھے جان سے مارنے کے درپے تھا۔ وہ جان سے نہ بھی مارتا تو بھی میرا ایسا حشر کر دیتا کہ دیکھنے والے عبرت پکڑتے اور اس کی داد گیری کی دھاک بیٹھ جاتی۔

اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا، بازو پہ شاید کچھ گہرا زخم آ گیا تھا کیوں کہ ذرا سی دیر میں میرے کرتے کی پوری آستین خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ راجو ایک مرتبہ پھر حملہ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے جونہی ہاتھ گھمایا، میں نے جوڑ کے پاس سے اس کی کلائی پکڑ لی اور تپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا مگر تو نے مجھے مجبور کر دیا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا، چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کا جوڑ نکل گیا۔ وہ بری طرح ڈکرایا۔ اس کا دایاں ہاتھ درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے پہلو میں جھول رہا تھا اور چاقو فرش پر گر چکا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک جھانپڑ رسید کیا اور جھک کے چاقو اٹھایا۔ راجو نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے کچھ نوٹ نکالے۔ میں نے نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لئے۔ ''اور نکال!'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''جیب میں جو کچھ ہے نکال دے۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سارے نوٹ نکال لے۔

ہوٹل کے باہر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ راجو کو گرتے دیکھا تو سب حیرت سے مجھے گھورنے لگے۔ راجو اٹھا اور کسی طرف دیکھے بغیر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

ہوٹل والے کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم نے خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈال لی۔ راجو اب تمہیں چھوڑے گا نہیں لگتا ہے مجھے بھی اب یہ ہوٹل بند کرنا پڑے گا''۔

''چنتا مت کرو، راجو اب ادھر نہیں آئے گا''۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''ارے بھیا، تم شاید نئے آئے ہو یہاں، اسی لئے راجو کو نہیں جانتے۔ وہ دو خون کر چکا ہے مگر پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا، کسی نے اس کے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کی۔ یہاں کے ہر دوکاندار سے بھتا لیتا ہے وہ۔ اس کی پیٹھ پر بٹھل کا ہاتھ ہے''۔

''کون بٹھل؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

ہوٹل والے نے مشتبہ انداز میں مجھے گھورا، پھر ہنس کر بولا۔ ''تم کیا کسی اور دنیا سے آ رہے

ہو! بٹھل کو نہیں جانتے؟''

''میں اصل میں بمبئی سے پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اصل بدمعاش تو بٹھل ہے۔'' ہوٹل والے نے کہا۔ ''اس شہر میں جوئے خانے اور شراب کی بھٹی اسی نے لگا ہے۔ پولیس کے بڑے افسروں اور بڑے بڑے نیتاؤں سے اس کا یارانہ ہے۔ راجو اس کا خاص آدمی ہے۔ تم تو چلے جاؤ گے۔ مجھے تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''ارے تم فکر مت کرو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا: ''اب ذرا جلدی سے مجھے کھانا کھلاؤ، بہت بھوک لگی ہے۔ ٹرین میں چور میرے کپڑوں کا بکس لے گئے۔ اسی میں میرے پیسے بھی تھے۔'' میں نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑ لی۔ ''میں جس دوست کے آسرے پر یہاں آیا تھا، وہ بھی یہاں سے دلی چلا گیا ہے، دو دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

''ارے تو بیٹھو نا!'' ہوٹل والے نے جلدی سے کہا۔ ''کھانے کی یہاں کیا کمی ہے۔''

ہنگامہ شروع ہونے کے بعد اکا دکا گاہکوں کے ساتھ ساتھ ہوٹل کا بیرا بھی بھاگ کھسک گیا تھا۔ خطرہ ٹلتے ہی وہ دوبارہ ہوٹل میں آ گیا تھا۔ ہوٹل والے نے اسی سے کھانا لانے کو کہا۔ وہیں ایک کونے میں پانی کی بالٹی رکھی تھی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ امید تھی کہ الہ آباد میں بانو سے رابطہ ہو جائے گا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں چائے پی رہا تھا کہ ہوٹل کے سامنے پرانی سی ایک گاڑی آ کر رکی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ گاڑی میں راجو کے ساتھ پانچ آدمی اور اترے۔ وہ سب شکلوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں لمبی نالوں والے ہینڈ میڈ ریوالور تھے۔ بقیہ تین آدمیوں کے ہاتھوں میں ہاکیاں اور سوڈے کی بوتلیں تھیں۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے۔ میں کرسی کھسکا کی آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت پرانی سی ایک گاڑی مزید وہاں پہنچ گئی۔ اس میں سے بھی ہاکی بردار غنڈے اترنے لگے۔ ایک غنڈے نے سوڈے کی بوتلوں کا کریٹ اٹھا رکھا تھا۔

ہوٹل والا سہم کر کاؤنٹر کے پیچھے دبک گیا۔ ہوٹل کا بیرا نہ جانے کہاں چھپ گیا۔ وہ سب ایک لائن بنا کر کے اندر آ گئے۔ سب سے آگے راجو تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دونوں ریوالور والے تھے، پھر

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بقیہ لوگ تھے۔ ایک بدمعاش نے اندر گھستے ہی ہوٹل والے کو کاؤنٹر سے باہر گھسیٹ لیا اور پاکی سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔

ریوالور والے نے حیرانی سے کہا۔ ''یہاں سوائے اس بھک منگے کے اور کون ہے؟ لگتا ہے نکل گیا۔''

''یہی تو ہے وہ بدمعاش!'' راجو نے کہا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ باندھ کر گلے میں لٹکا لیا تھا۔

ریوالور والے نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ..... یہ ہے وہ بدمعاش جس نے تمہارا ہاتھ توڑ دیا؟'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں بے! کون ہے تو؟''

''مطلب کی بات کرو۔'' میں نے اسی لہجے میں جواب دیا اور اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو۔ میں ان کھلونوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔

''بہت بھونکتا ہے بے!'' ریوالور والے نے کرخت لہجے میں کہا۔ اس دوران میں ہوٹل والا زخموں سے نڈھال ہو کے زمین پر گر پڑا تھا۔ ''اس کا حشر دیکھ لے۔'' اس نے ہوٹل والے کی طرف اشارہ کیا۔

''ایک آدمی کے لیے اتنا بڑا لاؤ لشکر لے کے آئے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اتنے لوگوں کے ساتھ تو کوئی بچہ بھی آنکھیں دکھا سکتا ہے۔''

''بکواس بند کر!'' اس نے اچانک ریوالور کی نال میرے منہ پر دے ماری۔ میرے منہ سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی سخت چیز ماری تو میرا سر بری طرح چکرایا، آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے اور فرش تیزی سے میرے نزدیک آنے لگا۔ پھر دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ اس کے بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے میرے بیڈ کو کوئی بری طرح جھنجھوڑ رہا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میرے ذہن سے دھند چھٹنے لگی۔ یاد آ گیا کہ میں نے ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ پھر میں چائے پی رہا تھا کہ وہاں راجو اور اس کے ساتھی آ گئے تھے، پھر..... انہوں نے شاید میرے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔ میں نے سر پہ ہاتھ لگانا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ میرے دونوں ہاتھ پہلوؤں کے ساتھ بندھے ہوئے

تھے اور میں کسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ پاؤں ہلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میرے دونوں پیر بھی بندھے ہوئے ہیں۔ کیا میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ آہستہ آہستہ میری کھوئی ہوئی توانائی واپس آ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور تن بہ تقدیر ہو کر لیٹا رہا۔ وہ شاید مجھے کسی وین میں لے جا رہے تھے۔ بدبختوں نے مجھے وین میں ٹھنڈے فرش پہ ڈال رکھا تھا۔ سردی میری ہڈیوں میں اترتی جا رہی تھی۔

اچانک کچھ فاصلے پر ایک شعلہ سا چمکا۔ لمحے بھر کو وہاں روشنی ہوئی تو معلوم ہوا کہ میں وین میں تنہا نہیں ہوں بلکہ مزید دو آدمی وہاں موجود ہیں انہی میں سے ایک نے سگریٹ سلگائی تھی پھر اس اندھیرے میں سگریٹ کا سرا روشن نکتے کی طرح حرکت کرنے لگا۔

شاید سگریٹ پینے والا ہی بولا تھا۔ ''اس الو کے پٹھے کو ابھی تک ہوش نہیں آیا، کہیں مر تو نہیں گیا!''

''اتنا نازک نہیں ہے!'' دوسرے نے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''مگر سیٹھ اس کا کرے گا کیا؟'' پہلے نے پوچھا۔

''یہ تو وہ خود ہی جانتا ہوگا۔'' دوسرے نے بیزاری سے جواب دیا۔

پھر وین میں خاموشی چھا گئی، صرف انجن کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔ سردی کے مارے میری حالت خراب تھی۔ ان منحوسوں نے مجھے ٹھنڈے فرش پہ ڈال رکھا تھا۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی سردی لگ رہی تھی۔ یوں بھی آدمی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں تو سردی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن سے سردی کی احساس کو جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش میں شاید مجھے نیند آ گئی تھی یا پھر سر کی چوٹ کے سبب دوبارہ غشی طاری ہو گئی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وین ایک جھٹکے سے رُکی تو میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ پھر وین کا پچھلا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کھلے ہوئے دروازے سے اتنی روشنی اندر آ رہی تھی کہ میں وین سے اترنے والوں کے ہیولے دیکھ سکتا تھا۔

باہر سے کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''زیادہ گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''گڑبڑ کیا ہوتی۔'' کسی نے جواب دیا۔ ''وہ سور ماتو ابھی تک بے سدھ پڑا ہے۔''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''اندر لے چلو اسے۔'' کسی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

پھر کوئی بڑبڑاتا ہوا وین میں داخل ہوا۔ ''ڈھائی من کی یہ لاش مجھے پھر ڈھونا پڑے گی۔'' پھر وہ کسی اور سے مخاطب ہوا۔ ''یار ذرا یہ مرداڈھونے میں میرا ہاتھ تو بٹاؤ۔''

پھر کسی نے مجھے گیہوں کی بوری کی طرح گھسیٹ لیا۔ گاڑی کا فرش اگر چکنا نہ ہوتا تو میری کھال ادھڑ جاتی۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے بوری کی طرح کندھے پر لاد لیا۔ میں اٹھانے والے کی جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گیا۔ اتنا وزن یوں آسانی سے اٹھا لینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہوتا۔ اٹھانے والے کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی نہ اس کا سانس پھولا تھا۔ میں آنکھیں موندے اس کے کندھے پر پڑا رہا۔

مجھے اٹھانے والا ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں تیز روشنی ہو رہی تھی لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں مگر جلدی سے بند کر لی تھیں۔ پھر میں سوچنے لگا کہ ابھی مزید کچھ دیر یونہی پڑا رہا ہوں آنکھیں کھول کر ہوش میں آ جاؤں؟ میں ابھی اس پہ غور ہی کر رہا تھا کہ اٹھا کر لانے والے نے مجھے دھپ سے فرش پر پھینک دیا۔ میری کمر میں شدید چوٹ آئی مگر میں ضبط کر گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا ورنہ مجھے اچھی خاصی چوٹ لگ جاتی۔

کمرے کے باہر قدموں کی آواز ابھری، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی، پھر کسی نے بھاری لہجے میں کہا۔ ''یہ ابھی تک بے ہوش ہے کہیں مار تو نہیں دیا اسے؟''

''میں تو سمجھا تھا کہ آدمی جاندار ہے اس لئے ہاتھ ذرا سخت رکھا تھا۔'' ایک اور آواز سنائی دی۔

''اچھا ہوش میں لاؤ اسے، پانی کے چھینٹے مارو اس کے منہ پر!'' بھاری آواز پھر سنائی دی۔

سردی سے پہلے ہی میرا برا حال تھا۔ پانی کا تذکرہ سن کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے فوری طور پر ہوش میں آنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسرے ہی لمحے میں کراہ کر آہستہ آہستہ پلکیں جھپکانے لگا۔ پھر میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے صوفے پر ادھیڑ عمر کا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر تھری پیس سوٹ تھا اور چہرے پر سنہری فریم کا چشمہ! اس کے سامنے تپائی پر شراب کی ایک بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ وہ یقیناً مے نوشی میں مصروف تھا۔ اس کے صوفے کی پشت پر کرخت چہرے اور پھولی ہوئی ناک والا ایک شخص مودب کھڑا تھا۔ اس کا جسم سانڈ کی طرح پلا ہوا تھا۔ اس نے چمڑے کی جیکٹ اور چست جینز پہن رکھی تھی۔ کمرہ ہر طرح سے

آراستہ تھا۔ وہاں شاید ہیٹر بھی آن تھا کیونکہ مجھے خوش گوار حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔ گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا، وہاں تین آدمی کھڑے تھے۔ وہ تینوں راجو کے ساتھ ہوٹل آنے والوں میں شامل تھے۔ شاید انہی میں سے کسی نے میرے سر پہ ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا تھا۔

صوفے پر بیٹھا ہوا شخص بہت غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس کی بھاری آواز گونجی۔ ''کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میں ایک بے سہارا آدمی ہوں سرکار!'' میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''دلی سے آیا ہوں میرا نام ونود ہے۔'' فوری طور پر میرے ذہن میں وہی نام آیا۔ ''یہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ میں اس کے پاس آیا تھا یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ دلی چلا گیا ہے۔''

''اس ملچھ نے تمہیں کتنے پیسے دیئے تھے؟'' چشمے والے نے پوچھا۔

''کون ملچھ سرکار؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''وہی ہوٹل والا مسلا۔'' پھر وہ اپنے ایک آدمی سے مخاطب ہوا، کیا نام ہے اس کا؟''

''اس کا نام جاوید ہے سرکار!'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

''ہاں اس نے تمہیں کتنے پیسے دیئے تھے؟'' چشمے والے نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں سرکار!'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ بوڑھا آدمی ہے۔ راجو اسے مار رہا تھا تو مجھے ترس آ گیا۔ میں نے راجو کو منع کیا تو وہ اسے چھوڑ کر مجھ سے بھڑ گیا۔'' پھر میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ''بڑی بھول ہو گئی سرکار!'' میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

چشمے والا چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا، پھر نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔ ''میرے لئے کام کرو گے؟''

''ضرور کروں گا سرکار!'' میں نے خوشی کا مظاہرہ کیا۔

''میں تو کئی مہینے سے کام کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔''

''کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟'' چشمے والے نے پوچھا۔

میں اثبات میں جواب دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے ہندی کی سدھ بدھ بالکل نہیں تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ ''سب یہی پوچھتے ہیں۔ جب انہیں پتا چلتا ہے کہ میں ان پڑھ ہوں تو وہ مجھے دھتکار دیتے ہیں۔ آپ بھی وہی پوچھ رہے ہیں۔''

''مگر ہم تمہیں دھتکاریں گے نہیں۔'' چشمے والے کے چہرے پر پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوئی۔ ''تم کیا کام کر سکتے ہو؟''

''میں مزدوری کر سکتا ہوں، سامان ڈھو سکتا ہوں۔ کچھ دن میں نے ایک ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ اس نے مجھے گاڑی چلانا بھی سکھا دی تھی۔''

''تم گاڑی چلا لیتے ہو؟'' چشمے والے نے پوچھا۔

''جی سرکار! میں ٹرک چلا سکتا ہوں۔ گاڑی کبھی چلائی نہیں مگر چلا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' چشمے والے نے کہا۔ آج سے تم میرے ملازم ہو۔ ابھی تم آرام کرو۔ بعد میں کام بھی بتا دیا جائے گا۔'' پھر وہ اپنے ایک آدمی سے مخاطب ہوا۔ ''گنیش! اس کے ہاتھ پاؤں کھول دو اور اسے کپڑوں کا ایک جوڑا بھی دے دو۔''

گنیش اس شخص کا نام تھا جو مجھے کندھے پر لاد کر یہاں تک لایا تھا۔ وہ غیر معمولی تن و توش اور بڑے بڑے مضبوط ہاتھ پیروں کا مالک تھا۔ اس نے چیک کا میلا سا کوٹ اور **مٹلگجی** سی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف تھا۔ وہ آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔

ہاتھ پاؤں کھلنے کے بعد ہی کھڑا ہو گیا اور ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرنے لگا تا کہ جسم کا دوران خون صحیح ہو جائے۔ بندھے بندھے پیر بھی میرے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔ پھر گنیش نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ وہ شاید گنیش ہی کا کمرہ تھا۔ گنیش نے الماری کھول کر ایک تولیہ نکالا اور مجھ سے بولا۔ ''تم نہا لو، میں تمہارے لئے کپڑے لے کر آتا ہوں، میرے کپڑے تو تمہیں آئیں گے نہیں۔''

باتھ روم میں شیو کا سامان بھی تھا۔ میں نے سب سے پہلے شیو کیا۔ پھر نیم گرم پانی سے نہایا ایسا لگا جیسے دھول اور مٹی کے ساتھ میری تھکن بھی پانی میں بہہ گئی ہو۔ اس دوران میں گنیش نے دروازے پر دستک دے کر مجھے کپڑے بھی دے دیئے تھے۔

میں نہا دھو کر باہر نکلا تو گنیش مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ شیو کرنے اور نہانے کے بعد میں تر و تازہ ہو گیا تھا اور میرا اصل روپ لوٹ آیا تھا۔ گنیش نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ان پڑھ ہو۔''

''بہت سے لوگوں کو میرے ان پڑھ ہونے پر حیرت ہوتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تم اگر تھری پیس سوٹ پہن لو تو بالکل ہیرو لگو گے فلموں کے!'' گنیش بے ڈھنگے پن سے ہنسا، پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''راجو سے ہوشیار رہنا۔ وہ بات دل میں رکھنے والا آدمی ہے۔ کبھی نہ کبھی تم سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گا۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں ہمیشہ یہاں رہوں گا۔ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔ ''یہ سیٹھ صاحب کیا کام کرتے ہیں؟''

''میں کیا بتاؤں، تم خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ تمہاری ڈیوٹی آسان نہیں ہوگی۔'' پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''میں کھانا بھجواتا ہوں۔''

''نہیں، کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔ ہو سکے تو ڈسپرین کی دو گولیاں لا دو۔ نہاتے وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ میرا سر پھٹ گیا ہے، سر میں ابھی تک تکلیف ہو رہی ہے۔'' میں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا دوست!'' گنیش نے کہا۔ ''میرا ہاتھ کچھ زیادہ زور سے چل گیا تھا۔ اچھا، میں تمہارے لئے گرم گرم کافی لے کر آتا ہوں۔ ہاں، الماری میں سے گرم چادر نکال کر اوڑھ لو۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

چادر نکالنے کی بجائے میں بستر میں گھس گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تک تو مجھے یاد ہی نہ آیا کہ میں کہاں ہوں، پھر آہستہ آہستہ مجھے یاد آنے لگا۔ میں بٹھل کے ٹھکانے پر تھا۔ گنیش میرے لئے ڈسپرین اور کافی لے کر آیا تھا۔ کافی پیتے ہی مجھ پر نیند کا زبردست حملہ ہوا تھا۔ تو کیا..... گنیش نے نیند میں خواب آور دوا ملائی تھی۔ میں جھپٹ کر اٹھ بیٹھا۔

اسی وقت گنیش کمرے میں داخل ہوا۔ ''اٹھ گئے ونود!'' نیند تو اچھی طرح آ گئی'' میں تلخی سے بولا۔

پھر اچانک اس سے پوچھا۔ ''میری کافی میں بے ہوشی کی دوا کیوں ملائی تھی؟''

''میں نے سوچا کہ تمہیں سکون کی ضرورت ہے، رات آرام سے گزر جائے گی۔'' پھر وہ اچانک بولا۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ، سیٹھ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

O

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مجھے وہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا مگر ابھی تک بٹھل نے مجھ سے کوئی کام نہیں لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر بٹھل مجھ سے چاہتا کیا ہے؟ میں وہاں بے کار پڑے پڑے بور ہو گیا تھا۔ بظاہر تو میں آزاد تھا لیکن ان کی مرضی کے بغیر ایک سے دوسرے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے صرف ایک امید حوصلہ دلاتی تھی کہ جب بانو کو علم ہو کہ میں زندہ ہوں تو وہ مجھے ہر صورت تلاش کر لے گی کیونکہ خطرے کی صورت مجھے الہ آباد ہی آنا تھا۔

انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ گنیش آیا اور بولا ''چلو تمہیں سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ بٹھل اپنی مخصوص نشست پر موجود تھا اور حسب معمول شراب سے شغل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہنس کر بولا۔ ''آؤ، آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' پھر بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ پیو گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی یہی امید تھی کہ تم نہیں پیو گے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔'' پھر وہ خاموش ہو کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کو گھمانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر کسی کشمکش میں مبتلا ہو۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم نے بہت دن آرام کر لیا، اب تمہیں کام کرنا ہوگا۔''

''میں تو خود بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

'اب تمہاری ساری بوریت دور ہو جائے گی۔'' بٹھل کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''مگر کام ذرا مشکل ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے خاکی کاغذ کا ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

میں نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ پولیس کے کسی اعلیٰ افسر کی تصویر تھی۔

''یہ رستوگی ہے۔'' بٹھل نے کہا۔ ''یہ میرے خون کا پیاسا ہے۔'' میں غور سے بٹھل کی شکل

دیکھ رہا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اسے قتل کر دو۔'' اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ بانو نے پولیس والوں پر رعب ڈالنے کے لئے یہی نام لیا تھا۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''نہیں، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔'' بٹھل کا لہجہ بدل گیا۔''

''میں تمہاری مردانہ وجاہت سے متاثر ہو کر یہاں نہیں لایا تھا۔''

''تمہارا اندازہ بہت غلط ہے سیٹھ!'' میں نے بدک کر کہا۔ ''دو چار دن روٹی کھلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے اتنا گھٹیا کام لو گے۔''

''میں کبھی غلط اندازہ نہیں لگاتا۔'' بٹھل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ کسی کو قتل کرنا تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ کام تمہیں کرنا ہوگا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں انکار کر دوں تو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر تم اسی رستوگی کے ہاتھوں پھانسی گھاٹ تک پہنچو گے۔''

''میں نے تو تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب میرے آدمی تمہیں یہاں لے کر آئے تھے تم ضرور کوئی مفرور ہو۔'' بٹھل کی مکروہ آواز گونجی۔ ''پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں مگر اس میں مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا پھر میں نے تم سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔''

''مگر یہ کام میں ہی کیوں کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ رستوگی کسی چھوٹے موٹے آدمی کے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں اپنے کسی کام کے آدمی کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔''

''میں بھی تو ناکام ہو سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری ناکامی کے چانسز بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تم ٹرینڈ دہشت گرد ہو۔'' پھر وہ بولتے بولتے رکا، اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کیا اور بولا۔ ''میں ذرا کھرا آدمی ہوں، صاف صاف بات کرتا ہوں اور اگر تم اس کے ہاتھوں مارے بھی گئے تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔''

''اور اگر میں نے تمہارا یہ کام کر دیا تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم آئندہ مجھ سے اس قسم کا کوئی کام نہیں لو گے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''کوئی گارنٹی نہیں ہے۔'' وہ خباثت سے مسکرایا۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ میں کھرا آدمی ہوں، کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتا، میں تمہیں سوچنے سمجھنے کے لئے ایک گھنٹہ دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو تم نے انکار کیا تو میں سیدھا سیدھا تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا، پھر تم جانو اور پولیس جانے۔ تمہارا جواب ہاں میں ہوا تو اس کی شرطیں بعد میں طے کر لیں گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''ایک گھنٹے بعد پھر ملاقات ہوگی۔''

میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ گنیش میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے انداز میں اب وہ پہلے والی بے تکلفی نہیں تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ ''تم چھپے رستم نکلے۔ مجھے بھی جل دے دیا۔''

''ایک بات بتاؤ گنیش!'' میں نے اچانک اس سے پوچھا۔ سیٹھ رستوگی کو قتل کیوں کرانا چاہتا ہے؟

''ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے جب سے وہ ٹرانسفر ہو کے اس شہر میں آیا ہے، اس نے ہمیں لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارے کئی بہترین آدمی بھی ان کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔''

''مگر کیا بٹھل اتنا طاقت ور بھی نہیں کہ ایک معمولی پولیس کمشنر کو اپنے راستے سے ہٹا سکے؟'' میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

گنیش طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''اسے راستے سے ہٹانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ وہ ایک بڑے سیاسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔''

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر میں انکار کرتا تو بٹھل مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا پھر پھانسی کا پھندا میرا مقدر ہوتا۔ وہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے خود بھی گولی مار سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ فوری طور پر بٹھل کی بات مان لوں۔ ظاہر ہے رستوگی کو قتل کرنے کے لئے مجھے یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ اس وقت بھی فرار ہو سکتا ہوں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اور آیا۔ میں بٹھل کی مدد سے ممکن ہے اپنے ساتھیوں تک پہنچ جاؤں۔ انڈیا میں یوں بھی میں تنہا تھا۔ بٹھل اور اس کے آدمی میرے کام آ سکتے تھے۔ جتنا میں اس پر غور کرتا گیا، اتنا ہی قائل ہوتا گیا۔ اس دوران میں گنیش نے دو دفعہ مجھے کافی پلائی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں بٹھل کے سامنے بیٹھا تھا۔ بٹھل پہلے کی طرح پُرسکون تھا۔ اس نے

مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کو.....''

''گڈ۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے بھی یہی امید تھی۔''

''مگر میری ایک شرط ہے۔'' میں نے کہا۔

بٹھل نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''اچھا کوئی شرط بھی ہے؟ چلو وہ بھی بتا دو۔''

''مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔ اگر تم اس سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کرو تو میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔''

''یہ بھی کوئی شرط ہے۔'' بٹھل ہنس کر بولا۔ ''وہ آدمی اگر زمین کی تہ میں ہوا تو وہاں سے بھی کھود کر نکال لوں گا۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ آدمی بٹھل نہ ہو۔''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ آدمی بٹھل نہیں ہے۔''

''بس تو پھر سمجھو کہ وہ تمہارے قبضے میں ہے۔'' بٹھل خوش دلی سے بولا۔ ''تم آرام کرو۔ دو چار دن میں تمہیں رستوگی کے بارے میں تفصیل مل جائے گی۔''

میرے ساتھ وی آئی پی سلوک ہونے لگا۔ بٹھل نے میرے لئے کئی ریڈی میڈ سوٹ منگوا لئے۔ مجھے یہاں اخبارات بھی ملنے لگے، بس مجھے وہاں سے باہر نکلنے کی اجازت ابھی تک نہیں ملی تھی جبکہ میں جلد از جلد اپنے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

اگلے روز سے میں نے رستوگی کی ''ریکی'' شروع کر دی۔ بظاہر اسے گھیرنے کا پلان بنا رہا تھا۔ ہفتے والے دن صبح میں نے بٹھل کو اطلاع دی کہ میرا پلان مکمل ہے۔

''ایک بات کا دھیان رہے۔'' بٹھل نے کہا۔ ''اگر تمہارا پلان فیل ہو گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''جانتا ہوں میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کھیل میں غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ یا تو میں زندہ رہوں گا یا وہ مجھے فوری طور پر ایک لوڈنگ ٹرک اور ایک تیز رفتار کار کی ضرورت ہے۔ کار کا انجن بہت مضبوط ہونا چاہئے۔ امپورٹڈ ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''مجھے تین ہوشیار اور حاضر دماغ قسم کے آدمیوں کی ضرورت بھی ہوگی۔''

''سب کچھ مل جائے گا۔'' بٹھل نے کہا۔ ''مگر ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم میرے کسی آدمی کو گولی کا نشانہ بنو گے۔ اگر تمہارے ذہن میں فرار ہونے کا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کوئی پروگرام ہے تو اسے نکال دو''۔

''ارے یار!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''بے اعتباری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر تم صاف گو ہو تو میں بھی کھرا آدمی ہوں۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو کینسل کرو یہ ڈیل اور مجھے پولیس کے حوالے کر دو''۔

''او ہو تم تو بُرا مان گئے''۔ بٹھل کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ ''میں تو تمہیں صرف یاد دلا رہا تھا کہ.....''

''ختم کرو''۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''فون کرو اور پولیس کو اطلاع دے دو۔ اس وقت میں تمہارے قبضے میں ہوں''۔

بٹھل غصے میں ہونٹ چبانے لگا۔ اسے اس قسم کے لہجے کی توقع کب ہوگی۔ وہ بھی ایک ایسے آدمی سے جو اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا، پھر بہت مشکل سے اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور زبردستی مسکرا کر بولا۔ ''اس وقت تو تم بالکل کسی خوبصورت اور نک چڑھی لڑکی کی طرح نخرے دکھا رہے ہو۔ چلو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں''۔

میں نے طویل سانس لیا اور مسکرانے لگا۔ میرا مقصد بٹھل کو ذہنی دھچکا پہنچانے کا تھا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''آئندہ مجھ پر شبہ مت کرنا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں نفاذ کر کرتا ہوں''۔ پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شام سے پہلے ٹرک اور کار چاہئے''۔

''شام تو دور ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے میں سب بندوبست ہو جائے گا''۔ بٹھل نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اپنے کمرے میں خیر آباد اور اس کے مضافات کا نقشہ پھیلا کر بیٹھ گیا۔ یہ نقشہ بھی مجھے بٹھل نے منگوا کر دیا تھا۔ اس میں چھوٹی سے چھوٹی جگہ کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نقشے کو میں نے اتنی دفعہ دیکھا تھا کہ اب الہ آباد کی گلیاں اور سڑکیں میرے لئے اجنبی نہیں رہی تھیں۔ اس نقشے کو دیکھ کر اپنے طور پر میں ایک اور نقشہ بنا رہا تھا، صرف ان مقامات کا نقشہ جہاں سے کمشنر کا گزر ہوتا تھا۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر ہائی کورٹ والی سڑک سے ہوتا ہوا سول لائنز میں اپنے گھر آتا تھا۔ سول لائنز میں دن کے وقت بھی ہو کا عالم رہتا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں گزرتی تھیں پھر وہاں کے بنگلے انگریزوں کے دور کی یادگار تھے۔ کافی فاصلے اور بڑے رقبے پر بنے ہوئے۔ وہاں

گھیر لینا آسان تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مقررہ وقت پر میں اسٹیشن والے اوور برج سے ہوتا ہوا دوسری جانب اتروں گا اور ٹہلتے ہوئے نارتھ رن ریلوے کے آفس کے سامنے سے ہوتا ہوا سول لائن چوک پر پہنچوں گا اور پھر اپنا داؤ آزمالوں گا۔ بٹھل کے آدمی پہلے سے تیار رہیں گے اور فوراً ہی مدد کے لئے پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ جانیں اور رستوگی میں جل دے کر نکل جاؤں گا۔

شام کو میں ہر طرح سے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم پر جینز، چمڑے کی جیکٹ اور کریپ سول والے لانگ شوز تھے۔ جیکٹ کے نیچے میں نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ صرف ہتھیاروں کی کمی تھی۔ اچانک گنیش کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات تھے۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیا ہوا، یہ تمہاری شکل پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''بات ہی ایسی ہے''۔ گنیش نے جواب دیا۔ ''تم سنو گے تو تمہاری شکل پہ بارہ بج جائیں گے۔ وہ کمشنر کسی سرکاری کام سے الہ آباد سے کراری گاؤں چلا گیا ہے۔ اب اس کی واپسی کل کسی وقت ہوگی۔ اب پورے ہفتے بھر انتظار کرو''۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

''وہ گیا کیسے ہے، سرکاری جیپ میں یا اپنی گاڑی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے''۔ گنیش نے کہا۔ ''وہ اگر گدھا گاڑی میں بھی گیا ہے تو ہمارا پلان تو چوپٹ ہو گیا نا! ویسے وہ اپنی ذاتی کار میں گیا ہے''۔

''ٹھیک ہے، ہم یہ آپریشن آج کی بجائے کل بھی تو کر سکتے ہیں۔ بس جگہ بدل جائے''۔

''تمہارا مطلب ہے کہ کل.....''

''ہاں''۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم ذرا جلدی سے معلوم کرو کہ وہ اس گاؤں میں کس راستے سے گیا ہے اور کس راستے سے واپس آئے گا؟''

''معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' گنیش نے یہ کہتے ہوئے نقشہ اپنی طرف کھسکا لیا، پھر پنسل اٹھا کر اس پہ نشان لگاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے وہ گاؤں جہاں وہ گیا ہے''۔ اس نے اس کے گرد پنسل پر دائرہ بنا دیا۔ ''یہ وہ سڑک ہے جہاں سے وہ واپس آئے گا۔'' اس نے نقشے پر نشان لگاتے ہوئے کہا۔

یہ وہی سڑک تھے جس پہ میں نے ٹرک میں لفٹ لی تھی۔ میں نے چند لمحے غور کیا، پھر فیصلہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کن لہجے میں بولا۔ ''بس، میں اسی سڑک پہ اب اس کو گھیروں گا اور یہ سفر اس کی زندگی کا آخری سفر ہوگا''۔ پھر میں چونک کر بولا۔ ''سیٹھ صاحب کو بتادو کہ آج کا آپریشن اب کل ہوگا۔''

''یہ انفارمیشن سیٹھ صاحب کی ہے۔ خبر میں انہیں بتادوں گا۔ ویسے ہر چیز تیار ہے۔'' گنیش نے جواب دیا۔

''ابھی تک مجھے ریوالورز اور رائفل نہیں ملی ہے''۔ مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ بٹھل اب بھی مجھ پہ اعتبار نہیں کر رہا تھا ورنہ اب تک مجھے اسلحہ مل گیا ہوتا۔

''ریوالور، ایکسٹرا راؤنڈز، رائفل سب کچھ میرے پاس ہے۔ دونوں گاڑیاں بھی تیار ہیں۔ تمہاری مرضی کے مطابق ٹرک پہ درختوں کے بھاری بھرکم تنے لوڈ کر دیئے گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے''۔ میں نے جواب دیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہتھیار ابھی مجھے دے دو، میں انہیں چیک تو کرلوں۔''

تھوڑی دیر بعد گنیش سارا اسلحہ میرے کمرے میں اٹھا لایا۔ ان میں بہت اعلیٰ قسم کا ایک جرمن پستول تھا۔ ایک آٹومیٹک ماؤزر تھا۔ وہ ماؤزر بھی خاصا قیمتی تھا۔ وہ نہ صرف ٹریگر دباتے ہی برسٹ مارتا تھا جبکہ ریوالور کی طرح ایک ایک فائر بھی کرتا تھا۔ سیون ایم ایم کی ایک انگلش رائفل تھی۔ اس کے علاوہ ایک درجن کے قریب دستی بم تھے۔

کافی عرصے بعد مجھے ہتھیار ملے تھے۔ میرا کھویا ہوا اعتماد اسلحہ ملتے ہی بحال ہوگیا تھا۔ بغلی ہولسٹر میں ریوالور رکھنے کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ مجھے ریوالور کے بغیر ایسا لگتا تھا جیسے میرے جسم پہ جیکٹ نہ ہو۔

''آج رات کام تو کوئی ہے نہیں۔'' گنیش ہنس کر بولا۔ ''چلو آج تمہیں الہ آباد کی سیر کرا دوں۔''

''لیکن میں کھلے عام باہر کیسے نکل سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پرابلم ہے؟'' گنیش نے بے نیازی سے کہا۔ ''تم گاڑی سے نیچے مت اترنا''۔

گنیش سب سے پہلے مجھے الہ آباد کے چوک میں لے گیا۔ وہاں کبابوں کی انتہا انگیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ''یہ یہاں کا مشہور کبابی ہے۔'' گنیش نے بتایا۔ ''اس سے پہلے اس کا باپ کباب لگاتا تھا، اس سے پہلے اس کا باپ، لگ بھگ سو سال ہوگئے ہیں۔ کباب کی اس دوکان کو دور دور سے لوگ اس کے کباب کھانے آتے ہیں''۔

''او بھائی، اس کا قصیدہ ہی پڑھتے رہو گے یا کچھ کھلاؤ گے بھی۔'' میں نے کہا۔ کبابوں کی مہک اتنی انتہا انگیز تھی کہ میری بھوک چمک اٹھی تھی۔

گنیش ہنستا ہوا اتر گیا اور بولا۔ ''میں کباب لے کر آتا ہوں۔ بوریت محسوس کرو تو ٹیپ آن کر لینا۔ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی کیوں کہ وہاں اس وقت بہت رش ہوگا۔''

''ارے بابا، جاؤ گے تو واپس ہوگی نا؟'' میں نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

گنیش جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔

میں نے ایک دفعہ پھر گھوم کے گنیش کو دیکھا، وہ ٹہلتا ہوا گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''تم کیا سو گئے تھے؟ گنیش نے پوچھا۔

''یار بھوک لگی ہو تو نیند کب آتی ہے؟ میں نے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔''

''وہاں رش بہت تھا۔'' گنیش نے بتایا۔ ''میں خود وہاں کھڑے کھڑے بور ہوگیا۔ اس لئے میں کباب بندھوا لایا ہوں۔ اب گھر جا کر اطمینان سے کھائیں گے۔ افراتفری میں مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ نیند وہاں یوں بھی مجھے کم آتی تھی۔ دن میں بھی میں آرام ہی کرتا تھا۔ اسی آرام کی وجہ سے میں شدید بیزار تھا۔ زندگی میں کبھی اتنا آرام نہیں کیا تھا۔ رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ پھر علی الصبح میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں ہی ہلکی پھلکی ایکسر سائز کی، پھر دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتا رہا، باتھ روم سے نکلا تو گنیش میرے بیڈ پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے اخبار رکھ دیا اور بولا۔ ''سیٹھ صاحب ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نارمل انداز میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

لیکن مجھے علم نہیں تھا یہاں ایک نئی مصیبت منتظر ہے۔ اچانک ہی کسی نے دو تین ہوائی فائر کیے۔ پھر کوئی میگافون پر چیخ کر بولا۔ پولیس نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، تمہارا بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔'' اوہ میرے خدایا، یہ پولیس کہاں سے آ گئی۔ میں گھبرایا لیکن سنبھل گیا۔ غالباً مخبری ہونے پر پولیس یہاں آئی تھی، میں کمرے کے ایک محفوظ کونے میں دبک گیا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ باہر فائرنگ ہو رہی تھی پھر اچانک سناٹا چھا گیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ باہر بھی سناٹا چھایا رہا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ ممکن ہے پولیس والے بنگلے میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہاں مزاحمت کرنے والا کون تھا۔ جب تک بٹھل حکم نہ دیتا، اس کے آدمی حرکت میں نہیں آ سکتے تھے اور بٹھل میرے قبضے میں تھا۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ پھر فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ اذیت بھری انسانی چیخیں گونجیں اور ذرا سی دیر میں سناٹا دو طرفہ فائرنگ سے پھر مجروح ہو گیا۔ عمارت کے اندر سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی اور باہر سے بھی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

میں جھپٹ کر بنگلے کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھا تو بٹھل نے ایک مرتبہ پھر میرا راستہ روک لیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ”باہر مت نکلنا! باہر شدید خطرہ ہے۔ پولیس والے ہر طرف موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔“

”بکو مت!“ میں نے گھوم کر ریوالور کا دستہ خاصی قوت سے بٹھل کے سر پہ دے مارا۔ میں چاہتا تو فائر کر کے اسے ٹھنڈا کر دیتا مگر نہ جانے کیوں میں نے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر میں فرش پر لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ لیٹے ہی لیٹے میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھلتا چلا گیا۔

میں نے کرالنگ کر کے دہلیز کو عبور کرنا چاہا، اسی وقت بائیں طرف کے کوریڈور سے کوئی سایہ سا مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بے اختیار لات چلائی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا دائیں طرف کوریڈور میں جا گرا۔ میں نے اٹھ کر ایک دم اسے دبوچ لیا۔ اس کا چہرہ فرش کی طرف تھا۔ اس کی گردن پشت سے میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اس کا چہرہ بُری طرح فرش پر رگڑ دیا۔ حملہ آور کے منہ سے اذیت ناک کراہیں بلند ہوئیں، پھر اس نے کہنی سے میرے سینے پر وار کیا۔ میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو وہ تڑپ کر نکل گیا۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے ادھڑ گیا تھا۔ چہرے کی کھال ادھڑنے کی وجہ سے اس کا چہرہ خون میں تر ہو گیا تھا اور بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے اس کے چہرے پر بھرپور لات ماری۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے یہ دیکھنے میں بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں ایک مرتبہ پھر زبردست فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ بنگلے کے اندرونی حصے سے فائرنگ ہونے لگی میں ایک مرتبہ پھر زمین پر لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں نیم اور آم کے گھنے درخت تھے، زمین پر گھاس تھی۔

میں رینگتا ہوا جونہی باہر نکلا، درختوں کی آڑ سے چار فائر ایک ساتھ ہوئے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئیں، ایک گولی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر زمین میں دھنس گئی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں رائفل لے کر کیوں نہیں آیا۔ درخت باؤنڈری وال کے بالکل ساتھ لگے ہوئے تھے اور باؤنڈری وال مجھ سے اتنے فاصلے پر تھی کہ ریوالور کی گولی وہاں تک شاید ہی پہنچتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جرمن لیوگر کے علاوہ میرے پاس ایک ماؤزر بھی ہے۔ میں نے لیوگر بائیں ہاتھ میں پکڑا اور پھرتی سے ریوالور نکال لیا۔ اس وقت سامنے سے گویا گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ کوئی گولی اب تک مجھے لگی نہیں تھی، حالانکہ اس وقت بالکل کھلے میدان میں تھا۔ سوائے ان درختوں کے دور دور تک کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی آڑ میں مجھے پناہ مل سکتی۔ میں نے بھی جوابی طور پر فائرنگ کا ارادہ کیا، پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ خواہ مخواہ گولیاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟

اچانک مجھے اپنے پیچھے سرسراہٹ سی سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی رینگتا ہوا میرے پیچھے آ رہا ہو۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے پولیس والے داخلی دروازے سے اندر آ گئے ہوں اور اب ان کے آدمی میرا پیچھا کر رہے ہوں، بنگلے کے عقبی حصے میں زوردار فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ لوگ شاید اسی لئے کرالنگ کرنے پر مجبور تھے کہ اپنے ہی ساتھیوں کی چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔

اچانک کوئی بہت تیز رفتاری سے کرالنگ کرتا ہوا میرے نزدیک آ گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے ماؤزر سے آنے والے کا نشانہ لیا اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والا تیز سرگوشی میں بولا۔ ”فائر مت کرنا“۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ گنیش تھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں!“ گنیش پھر سرگوشی میں بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کرنے کے لئے سیٹھ صاحب نے بھیجا ہے۔“

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

"بٹھل نے خود ہی پولیس کو انفارم کیا، اب خود ہی میری مدد کر رہا ہے"۔ میں نے غصے میں کہا۔

اچانک سامنے سے کئی فائر ہوئے۔ اس دفعہ گولیاں خطرناک حد تک ہمارے نزدیک سے گزریں۔ شاید پولیس والوں نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ بھلا اس کھلے میدان میں نکلنے کی کیا تک تھی۔ اب نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا، نہ آگے جا سکتا تھا۔ اگر سب پولیس والے ایک ساتھ ہلہ بول دیتے تو میں زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ میں اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا سامنے والے درختوں تک پہنچنے کی کوشش کروں۔

گنیش رینگتا ہوا میرے بالکل نزدیک آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ اس پشت پر کینوس کا ایک بیگ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں فاضل راؤنڈز بھی ہوں گے۔ اس مطلب یہ تھا کہ اگر ہمیں پوزیشن لینے کے لئے مناسب جگہ مل جائے تو ہم گھنٹوں تک پولیس کا راستہ روک سکتے تھے۔ سامنے سے پھر ایک ساتھ کئی فائر ہوئے۔ اس دفعہ کچھ گولیاں ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر زمین میں دھنس گئیں۔ گنیش نے جھنجلا کر بیگ میں ہاتھ ڈالا، پھرتی سے ایک دستی بم نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ "ہم ایک ساتھ ان پہ دو بم پھینکیں گے۔ پھر فوراً ہی میں دھوئیں کا بم پھینکوں گا، اسی کی آڑ میں ہم باؤنڈری وال تک پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے دھماکے سے دیوار بھی گر جائے۔" اس دوران میں وہ دوسرا بم بھی نکال چکا تھا، پھر اس نے دھوئیں کا بم نکالا۔ دستی بم کے برعکس اس بم کی بناوٹ گیند کی طرح تھی سطح بھی خاصی چکنی تھی۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا ہم نے ایک ساتھ پن نکال کر اور پوری قوت سے بم سامنے کی طرف اچھال دیئے۔ فوراً ہی کان پھاڑ دینے والے دو دھماکے ہوئے۔ گنیش نے بجلی کی سی تیزی سے دھوئیں کا بم بھی اچھال دیا۔ اس کے پھٹتے ہی دھوئیں کی ایک دیوار سی بن گئی۔ لوگوں کی چیخ پکار بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں، فائرنگ کا شور ایک افراتفری سی مچ گئی وہاں۔ کوئی میگا فون پر مسلسل کچھ کہہ رہا تھا مگر اس شور شرابے اور ہنگامے میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

میں اور گنیش اٹھے اور دیوانہ وار سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ چشم زدن میں ہم باؤنڈری وال تک پہنچ گئے۔ شاید دونوں بم دیوار سے کچھ پہلے ہی پھٹ گئے تھے کیونکہ دیوار بالکل صحیح سلامت تھی۔ گنیش نے پن کھینچ کے ایک بم دائیں طرف بھی اچھال دیا۔ دھماکہ ہوتے ہی اذیت بھری چیخیں بلند ہوئیں۔ گنیش اچھل کر دیوار پر چڑھا اور پلک جھپکتے ہی دوسری طرف اتر گیا۔ دوسرے ہی

لمحے میں بھی اچھل کر باہر آ گیا۔ پھر ہم دونوں رکے بغیر ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

اسی وقت سائرن بجاتی ہوئی ایک ایمبولینس گلی کے نکڑ پر نمودار ہوئی اور تیزی سے بٹھل کے بنگلے کی طرف چلی گئی۔ اچانک سفید رنگ کی ایک کار گلی میں داخل ہوئی۔ گنیش نے مجھے اشارہ کیا اور خود گلی کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت کار کی طرف تھی۔ اسے دیکھ کر کار والے نے بریک لگا دیئے اور ہارن دینے لگا۔

میں جھپٹ کر گاڑی کے نزدیک پہنچا اور ریوالور کی نال کار والے کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"خاموشی سے باہر آ جاؤ"۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں پولیس نہ آ جائے۔ وہ لوگ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کار والا سہما ہوا نیچے اتر آیا۔ میں جھپٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ دوسری طرف سے گنیش بھی بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی ریورس گیئر میں ڈالی اور ایکسی لیٹر دبا دیا۔ گلی کے نکڑ تک پہنچا تو میں نے پولیس کی ایک جیپ کو حرکت میں آتے دیکھا۔ میں نے پھرتی سے گاڑی مین روڈ پر ڈالی اور برق رفتاری سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ گنیش نے بھی پولیس کی جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ اب وہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے پیچھے پولیس کی گاڑی کے علاوہ دو گاڑیاں اور ہیں۔ دونوں پرائیویٹ کاریں ہیں مگر مجھے شبہ ہے کہ ان دونوں میں پولیس والے سوار ہیں۔

میں کار کو برق رفتاری سے دوڑاتا ہوا الہ آباد سے باہر نکل آیا۔ آگے سڑک دور دور تک سنسان تھی۔ میں نے ایکسی لیٹر کو گاڑی کے فرش سے بالکل چپکا دیا۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی ایک سو تیس اور چالیس کے درمیان تھرکنے لگی۔

گنیش نے مجھے ٹوکا۔ "اتنی جلدی مت کرو! گاڑی تمہارے قابو میں نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ گاڑی میری کنٹرول میں ہے"۔ میں نے جواب دیا اور گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی۔

ایک موڑ مڑتے ہی مجھے ایک ٹرک دکھائی دیا۔ وہ چاروں طرف سے کھلا ہوا ٹرک تھا۔ اس پہ لکڑی کے موٹے گٹھے اور بلیاں لدی ہوئی تھیں۔ وہ سست رفتاری سے جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو اسپیڈ دے کر ٹرک کو اوورٹیک کرنا چاہا۔

اچانک میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹرک میں سے لکڑی کے گٹھے نیچے گرنے لگے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

تھے۔ان سے راستہ بلاک ہوگیا۔میں نے گاڑی روکنے کی کوشش کی مگر وہ کنٹرول سے باہر ہوگئی۔ لکڑی کی بلیاں مسلسل گر رہی تھیں۔گاڑی ایک بلی پر چڑھی، دوسری بلی سے ٹکرائی اور ترچھی ہو کر بائیں طرف کھیتوں میں گھس گئی۔

میرا سر بُری طرح اسٹیرنگ اور ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔

گنیش بھی ڈیش بورڈ سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا تھا مگر ہم دونوں ہوش وحواس میں تھے۔میں نے دروازہ کھول کر پھرتی سے باہر چھلانگ لگادی۔گنیش بھی باہر کود گیا۔

اس وقت تک پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ان لوگوں نے آتے ہی زبردست فائرنگ شروع کردی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے ہر قیمت پر گرفتار کرنا چاہتے ہوں۔ اس افراتفری میں گنیش کی رائفل اور بیگ دونوں چیزیں گاڑی ہی میں رہ گئی تھیں۔اب میرے پاس صرف ایک ماؤزر اور ایک جرمن لیوگر تھا پھر پولیس کی کئی اور گاڑیاں آگئیں اور اس میں سے پولیس کے جوان کود کود کر باہر نکلنے لگے۔وہ لوگ چاروں طرف پھیل کر گھیرا تنگ کررہے تھے۔ گنیش میرا ہاتھ پکڑ کر ایک سمت بھاگا مگر کھیتوں سے باہر نکلتے ہی ٹھٹک کر رُک گیا۔وہاں ایک انسپکٹر اور تین پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ان کی رائفلوں کا رُخ ہماری طرف تھا۔انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔"بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔"

اچانک کہیں سے زبردست فائرنگ ہوئی اور انسپکٹر سمیت سب پولیس والے زمین پر ڈھیر ہوگئے اور گنیش گھبرا کر زمین پر لیٹ گیا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمیں خراش تک نہ آئی تھی۔کسی نے چیخ کر کہا۔خاں! اس طرف آجاؤ۔

وہ آواز سن کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کیوں کہ وہ آواز بانو کی تھی۔میں اور گنیش جلدی سے اٹھے اور اس لڑکی کی طرف بڑھے۔اسی وقت کئی فائر ہوئے اور میرے جسم میں آگ سی بھر گئی۔ میں نے بے یقینی سے اپنا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر مجھ سے اپنے پیروں پہ کھڑا رہنا دوبھر ہوگیا۔ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے اور میں دھم سے زمین پر گر گیا۔میں نے جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ گنیش زمین پر پڑا بُری طرح تڑپ رہا تھا۔میں نے اسے آواز دینا چاہی مگر حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے ہوش آیا تو سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے، جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور میں شدید اذیت سے دوچار تھا۔مجھ پر نقاہت اور غنودگی سی طاری تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں

کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر مجھ پر غنودگی کا زبردست حملہ ہوا اور میں ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد میں دوبارہ ہوش میں آیا۔ اس مرتبہ تکلیف کی شدت بھی نہیں تھی اور آنکھیں بھی پوری طرح کھل گئی تھیں، سر میں البتہ اب بھی دھماکے سے ہو رہے تھے۔جس سے درد کی ٹیسیں نہیں اٹھ رہی تھیں مگر اب بھی پورا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔

میری کراہ سن کر کوئی تیزی سے میرے نزدیک آگیا۔لباس سے وہ مجھے نرس لگ رہی تھی۔ اس نے جھک کر میرا جائزہ لیا، پھر اسی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اس نرس کو کہاں دیکھا ہے مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ وہ یقینی طور پر کسی ہسپتال کا کمرہ تھا مگر مجھے کیا ہوا تھا۔میں ہسپتال کیوں آیا تھا؟ میں نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی تو سر بُری طرح چکرانے لگا۔میں نے تھک کر کوشش ترک کردی اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں قدموں کی آہٹ گونجی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔اس مرتبہ مجھے ایک مرد پیرو دکھائی دیا۔وہ خاصا وجیہہ اور سمارٹ شخص تھا، کنپٹیوں سے اس کے بال سفید ہو چلے تھے جن کی وجہ سے اس کی شخصیت میں وقار پیدا ہوگیا تھا۔اس کے گلے میں اسٹیتھواسکوپ جھول رہا تھا۔گویا وہ ڈاکٹر تھا۔اس نے جھک کر میری نبض دیکھی اور بہت نرم لہجے میں بولا۔"کیسے ہیں آپ؟"

میرا دماغ اتنا مفلوج تھا کہ مجھے اپنا نام تک یاد نہیں آرہا تھا۔میں نے نحیف آواز میں جواب دیا"ٹھیک ہوں۔مگر مجھے ہوا کیا ہے؟" ایسا محسوس ہوا جیسے میری بجائے کوئی اور بولا ہو۔ اپنی آواز بھی مجھے اجنبی لگ رہی تھی۔

"آپ ذہن پر زیادہ زور مت دیں، آپ زخمی ہوگئے تھے اور اس وقت ہسپتال میں ہیں۔"

"میں زخمی ہوگیا تھا مگر کیسے؟" میں خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے، زیادہ بات چیت بھی مت کریں۔" پھر وہ نرس سے مخاطب ہوا۔"سسٹر! انہیں انجکشن دے دو۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا۔"مجھے یہ تو بتائیں کہ مجھے ہوا کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔"معمولی سے زخم ہیں بس، اب آپ ریسٹ کریں۔"

اس دوران میں نرس انجکشن تیار کرچکی تھی۔وہ جھک کر میرے بازو میں انجکشن لگانے لگی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اس وقت میں نے غور سے نرس کا چہرہ دیکھا۔ وہ انتہائی پُرکشش لڑکی تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا، کیا یہ لڑکی ہندو ہے؟ پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں اس وقت بھارت میں ہوں پھر مجھے مزید کچھ سوچنے کی مہلت نہ ملی اور میری پلکیں بوجھل ہوگئیں۔ نرس نے یقینی طور پر مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دیا تھا چند لمحوں میں مجھے گہری نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے مجھے آسمان بھی دکھائے دے رہا تھا اور میری حالت بھی پہلے کی نسبت بہت بہتر تھی۔ اس مرتبہ بھی وہی پُرکشش نرس کمرے میں تھی اور میری بائیں جانب کھڑی اسٹینڈ پر لگی ہوئی ڈرپ کی اسپیڈ چیک کر رہی تھے، دائیں طرف بھی ایک اسٹینڈ تھا۔ اس میں بلڈ کی بوتل لٹک رہی تھی۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ''پانی''۔

نرس نے چونک کر مجھے دیکھا اور گلاس میں پانی ڈال کر چمچے کے ذریعے پلانے لگی۔ چھوٹے سے ایک چمچ اسپون سے میرا حلق بھی پوری طرح تر نہ ہو سکا۔ میں نے مزید پانی مانگا مگر نرس نے مسکرا کر مخملی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر ابھی آنے والے ہیں۔ وہ اجازت دیں گے تو میں پانی کے دو گلاس بھر کے آپ کو پلاؤں گی۔''

میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے، زبان اینٹھ رہی تھی اور مجھے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے جھلا کر آنکھیں موند لیں اور سوچنے کی کوشش کی کہ میں ہسپتال کیسے پہنچا؟ مجھے یاد آ گیا کہ میں اور گنیش پولیس کا گھیرا توڑ کر ٹھل کے بنگلے سے نکلے تھے، پھر، پھر گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہاں پولیس نے ہمیں گھیر لیا تھا، فائرنگ ہوئی تھی اور۔ میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا اور مجھے بانو کی آواز سنائی دی تھی۔ میں اور گنیش آواز کی طرف لپکے تھے۔ پھر..... پھر میرے جسم میں آگ سی بھر گئی تھی اور میں نے گنیش کو بری طرح تڑپتے دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ یاد آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھے بھی گولیاں لگی تھیں۔ نہ جانے مجھے کتنی گولیاں لگی تھیں اور میں زندہ کیسے تھا؟ ڈاکٹر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ معمولی زخمی ہیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو پورے جسم میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی اور مجھ سے اٹھا نہ گیا۔ میں نے سوچا، کیا میں ہمیشہ کے لئے معذور ہو چکا ہوں؟ میں نے پاؤں ہلانے کی کوشش کی مگر مجھے ایسا لگا جیسے پاؤں موجود نہ ہوں۔ میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''نہیں..... نہیں، اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں گا۔

میرے دونوں ہاتھ بھی سلامت تھے۔ پھر مجھے بانو کا خیال آیا۔ وہ کمبخت مجھے ہسپتال میں ڈال کر خود نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ابھی تک مجھے ایک دفعہ بھی اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔''

میں نے جسم کا پورا زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔

نرس اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جھپٹ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ ''مسٹر خان پلیز، آپ اٹھنے کی کوشش نہ کریں، تکلیف بڑھ جائے گی۔'' میں چونکا، اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا پھر یقین ہو گیا کہ یہ اپنے ہیں۔

میں نے طویل سانس لیا۔ میں واقعی مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''تھینک یو ڈاکٹر! اب واقعی میری تسلی ہو گئی ہے۔'' پھر اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ''بانو کہاں ہے؟''

''بانو؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے دہرایا۔ ''کون بانو؟''

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' میں نے پوچھا، میں نے سوچا شاید بانو کسی وجہ سے خود سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نے کسی اور کے ذریعے مجھے وہاں بھیجا تھا۔

''آپ کو پولیس یہاں لے کر آئی ہے؟'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''آپ پولیس ہی کی گولی سے تو زخمی ہوئے تھے۔ آپ کا ساتھی تو مر گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اب میں انڈر اریسٹ ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یس!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔ پولیس انسپکٹر اسی وقت آپ کا بیان لینا چاہتا تھا مگر میں نے پرمشن نہیں دی۔''

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے واضح طور پر بانو کی آواز سنی تھی۔ کیا مجھے دھوکا ہوا تھا؟ لیکن میرے ساتھ گنیش بھی تو تھا۔ کیا اس کے کان بھی بج رہے تھے؟ اس نے بھی چونک کر آواز کی طرف دیکھا تھا اور میرے ساتھ ہی ادھر لپکا تھا۔

ڈاکٹر نہ جانے کس وقت چلا گیا تھا۔ میں اپنے خیالات میں اتنا گم تھا کہ مجھے اس کے جانے کا احساس بھی نہ ہوا۔ میں اب تک اس خوش فہمی میں تھا کہ بانو مجھے یہاں لائی تھی اور یہی سوچ کر اسے برا بھلا کہتا رہا تھا کہ وہ مجھے یہاں ڈال کر بھول گئی تھی۔ مجھے اس بات کا تو احساس تھا کہ انیلی جنس کے کسی نہ کسی جال میں ضرور پھنس چکا ہوں، چونکہ پاکستان میں ایجنسیوں کی مختلف جہتیں میں نے دیکھ لی تھیں اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ یہاں بھی معاملہ مختلف نہیں، بعد کے واقعات نے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ثابت کیا کہ یہاں بھی ایک ہی وقت میں مختلف ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ عین ممکن ہے جس ایجنسی کے ساتھ میرے ساتھی تھرو throw تھے اس کی متحارب کوئی ایجنسی میرے ساتھیوں کو محض معاصرانہ چشمک میں موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی تھی۔ یہاں بھی شاید کوئی ایسا ہی معاملہ چل رہا تھا اور میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ میں غلطی سے بانو کی کسی مخالف ایجنسی کے ہتھے چڑھ گیا ہوں جو اب میرے ذریعے باقی معاملات بھی اپنے حق میں سیدھے کرنا چاہتے تھے۔ بانو اس سے بے خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہاں سے نکال لے جائے گی کیونکہ ابھی انہیں مجھ سے کوئی بڑا کام لینا تھا۔

اگلے روز نرس میرے لئے کھانا لائی تو ایک پھولوں کا بکے اور لفافہ بھی ساتھ تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر لفافہ میرے سرہانے کے نیچے رکھا اور چلی گئی۔

میں نے کھانا لگاتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے لفافہ نکالا۔ جس میں ایک مختصر تحریر تھی!

''افضل! اس ساری صورتحال پر میری دلی معذرت قبول کرو۔ رات کو تیار رہنا۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' تمہاری بانو!

میں چونکا اس لئے نہیں کہ یہ کچھ میرے لئے خلاف توقع تھا۔ اب مجھے بے چینی سے رات کا انتظار تھا۔ معمول کے مطابق میرے بڑے سے کمرے کی لائٹس آف ہونے لگیں۔ صرف دو تین لائٹس جل رہی تھیں۔ میں چوکنا ہو کر اپنے بستر پر کروٹ لئے لیٹا تھا۔ جب میں نے کسی کو دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ یہ بانو تھی۔ وہ اطمینان سے چلتی میرے نزدیک پہنچی۔ نرس کے لباس میں اسے دیکھ کر میں مسکرایا۔ بانو نے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ میری آنکھوں میں جھانکا اور وہاں سے چلی گئی۔

چند لمحوں بعد وہ ایک اسٹریچر سمیت کمرے میں داخل ہوئی۔ بانو نے مجھے اسٹریچر پر منتقل کیا اور سر سے پاؤں تک مجھ پہ چادر ڈال دی۔

پھر وہ اسٹریچر لے کر پھرتی سے باہر نکل گئی۔ میں نے چادر کا کونہ تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا، کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا۔ بانو کا رخ آپریشن تھیٹر کی طرف تھا تاکہ کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ مریض کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا ہے۔ کچھ آگے جا کر وہ اچانک بائیں طرف کے کوریڈور میں مڑ گئی۔

اسی وقت مجھے وہ ایمبولینس دکھائی دی جو سست رفتاری سے کوریڈور کی طرف آ رہی تھی۔

ڈرائیور نے بہت پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بانو کے اشارے پر پہلے ہی وہ ایمبولینس لے کر آ گیا تھا۔

بانو نے لپک کر ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھولا، پھر اس اسٹریچر کا اوپر کا حصہ ایمبولینس میں دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی ایمبولینس میں سوار ہو گئی۔

ہسپتال کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد میں نے سکھ کا لمبا سانس لیا لیکن اچانک ڈرائیور نے بانو کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا تھا۔

''حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہاری یہ خوبصورت کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی۔'' وہ غرا کر رواں انگلش میں بولا مگر لب و لہجہ سے وہ مقامی ہی لگ رہا تھا۔ ''اپنے ہاتھ سر پر رکھو۔'' اس نے دوسرا حکم دیا۔

''کون ہو تم؟'' بانو ابتدائی دھچکے سے سنبھل کر بولی۔ ''اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اسے اب احساس ہوا تھا کہ یہ اس کا ساتھی نہیں دھوکہ ہوا ہے۔

''اتنی بھولی مت بنو سیڈم!'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

''اگر میں جانتی ہوتی تو تم سے کبھی نہ پوچھتی۔'' بانو نے کہا: ''یہ گن تو ہٹاؤ ایک کمزور عورت اور معذور مرد سے تمہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی کمزور ہو، رہا سوال اس معذور مرد کا تو یہ بیچارہ تو واقعی معذور ہے۔'' پھر اس نے سخت لہجے میں کہا: ''اب اپنی زبان بند رکھنا، بعد میں تم سے تفصیلی بات ہو گی۔''

گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی، پھر اس کی رفتار خاصی کم ہو گئی۔ میں سمجھا کہ اب رکنے والا ہے۔ مگر ڈرائیور نے اسے دائیں طرف موڑ کر کچے راستے پہ ڈال دیا اور گاڑی کو بری طرح جھٹکے لگنے لگے۔ تقریباً دس منٹ تک اسی طرح اونچے نیچے راستوں پر چلنے کے بعد وہ ہموار راستے پر چلنے لگی مگر وہ بھی پختہ سڑک نہیں تھی، کچا ہی راستہ تھا۔ پھر شاید مجھے نیم بے ہوشی سے اونگھ آ گئی تھی۔ کیونکہ میری نیند تو اس وقت ٹوٹی جب ایمبولینس دھچکے سے رکی تھی۔

ایمبولینس کے رکتے ہی اس کا عقبی دروازہ کھولا۔ ریوالور بردار نے بانو کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ نیچے اترتے ہی دو آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ بانو کے ہاتھ اب بھی سر پہ رکھے تھے۔ ممکن ہے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اس کے لباس میں کوئی ہتھیار یا بم وغیرہ پوشیدہ ہو۔ میری طرح شاید یہ خیال اس ریوالور والے کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ یہاں اس کے آدمی ہمارے منتظر تھے۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ اس لڑکی کی تلاشی لو۔ ان میں سے ایک نے اس مہارت سے بانو کی تلاشی لی کہ اسے کچھ بھی کرنے کا موقع نہ مل سکا، ورنہ میرا خیال تھا کہ بانو اس موقع پر ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔

''ٹھیک ہے انہیں اندر لے کے چلو، مگر اس لڑکی سے ہوشیار رہنا، بہت خطرناک ہے۔'' اس نے بانو کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ خطرناک ہے؟'' ان میں سے ایک نے مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔ بانو اس کے سامنے بظاہر گڑیا ہی نظر رہی تھی اسی لئے وہ اتنی حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ ہیرو مت بنو۔'' ریوالور والے نے اسے جھڑک دیا۔ ''اسے بھی اتارو۔'' میری طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے آدمی سے کہا۔

''یہ کیا کسی کی لاش ہے؟'' وہ تمسخر سے بولا۔

''ہاں، اس وقت تو اسے ڈیڈ ہی سمجھو۔'' ریوالور والے نے کہا۔

اسٹریچر اتارا گیا اور وہ لوگ مجھے لے کر روانہ ہو گئے۔ میرے چہرے سے چادر سرک گئی تھی اس لئے میں آنکھیں موندے پڑا تھا۔ میں نے ایک آنکھ ذرا سی کھول کر دیکھا، وہ لوگ مجھے لئے ہوئے ایک بڑے سے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے بہت احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

''اس کی طرف سے تو کوئی خطرہ نہیں ہے، لڑکی کو باندھ دو۔'' ریوالور والے نے کہا۔

ان دونوں نے فوراً بانو کو جکڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس موقع پر بچاؤ کی کوئی کوشش کرے گی مگر وہ دونوں بہت محتاط تھے۔ کمرے میں بیڈ کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ، دو آرام کرسیاں اور بڑی سی ایک الماری بھی تھی۔ ان لوگوں نے باندھ کر بانو کو صوفے پر ڈال دیا اور سر جھکا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

''ٹونی!'' اس نے اپنے آدمی کو مخاطب کیا۔ ''تم ایمبولینس لے کر جاؤ۔ اسے چھوڑ کر میری گاڑی لے آؤ۔''

''او کے''۔ وہ دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔ ''تم باہر گیٹ پر جاؤ، ابھی باس کے آنے میں

ایک گھنٹہ ہے، اس وقت تک میں ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔''

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ زیادہ دیر بے ہوش بنے رہنے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے نحیف آواز میں کہا۔ ''پانی''۔

ریوالور والے نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر مکروہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''پانی تو نہیں ہے، پھر بھی پلوائے دیتا ہوں۔'' وہ بوتل لے کر میرے نزدیک آیا اور میرا منہ کھول کر بوتل میرے منہ میں ٹھونس دی۔

بیڈ پر لٹتے ہوئے ان لوگوں نے چادر اچھی طرح میرے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ چادر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس وقت اس پر قابو پانے کا اچھا موقع تھا مگر جب تک میں ہاتھ چادر سے باہر نکالتا۔ وہ چوکنا ہو جاتا۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ صحت مند اور مضبوط ہیں ورنہ پھر دھوکے سے بھی میرے نزدیک نہ آتا۔ میں نے سر جھٹک کر مزاحمت کی کوشش کی مگر اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑ لئے اور بوتل میرے حلق میں انڈیل دی۔ اسی کوشش میں دو تین بڑے بڑے گھونٹ میرے حلق سے نیچے اتر گئے مجھے ایسا لگا جیسے حلق سے لے کر معدے تک آگ سی بھر گئی ہو۔ میں اس وقت بُری طرح جھنجھلا گیا تھا اور شاید اس بات کی پرواہ ہی نہ کرتا کہ ہاتھ باہر نکالنے پر وہ چوکنا ہو جائے گا مگر وہ کم بخت میرے سرہانے کھڑا تھا۔

اس نے بوتل ہٹائی تو میں بھنا کر بولا۔ ''اس وقت میرے ہاتھ پیر ناکارہ ہیں تو تم اپنی من مانی کر رہے ہو۔ یہ کہاں کی مردانگی ہے؟''

''مردانگی تو تو ابھی دیکھو گے۔'' وہ ہنس کر بولا مگر پہلے کام کی بات ہو جائے۔ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟''

''کون سی مائیکرو فلم؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''ابھی یاد آ جائے گا کہ کون سی مائیکرو فلم!'' اس نے غرا کر کہا اور میرے جسم پر پڑی ہوئی چادر کھینچ لی۔ میں نے اس وقت مریضوں والا لباس پہن رکھا تھا اور دونوں ٹانگوں پر پٹیاں باندھی تھی۔ یہ ظاہر میری حالت رحم قابل تھی۔ ہسپتال کے کپڑوں میں تو یوں بھی اچھا بھلا آدمی مریض لگتا ہے۔

''بتاؤں کہاں ہے وہ مائیکرو فلم؟'' وہ چیخ کے بولا۔

''میں تمہاری زبان سے پہلی دفعہ کسی مائیکرو فلم کے بارے میں سن رہا ہوں۔''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''دیکھو!'' وہ غصے میں دھاڑا ''تم پہلے ہی ادھ مرے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے ہاتھوں مارے جاؤ۔ وہ مائیکرو فلم میرے حوالے کردو، میں تمہیں اور تمہاری محبوبہ دونوں کو چھوڑ دوں گا۔ مجھے اس سے مطلب نہیں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو اور کیا کر رہے ہو۔''

''تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اب میری بھی سن لو مجھے نہیں معلوم کہ تم کس مائیکرو فلم کی بات کر رہے ہو اور وہ مجھ تک کیسے پہنچی ہے؟''

اس نے اچانک میرا گریبان پکڑ کے مجھے اٹھایا اور اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں لڑھک کر بیڈ سے نیچے جا گرا۔ درد کی ایک زبردست لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی پھر وہ دانت پیس کر بولا ''تو ایسے نہیں بتائے گا۔'' وہ الماری کی طرف بڑھ گیا اور اس میں سے ایک استرا نکال لیا، پھر سفاک لہجے میں بولا ''اگر تو نے اب بھی زبان نہ کھولی تو میر تیری محبوبہ کا چہرہ بگاڑ دوں گا۔ پہلے اس کے دونوں کان کاٹوں گا، پھر ناک کاٹ کر پھینک دوں گا۔ اس کے بعد بھی تو نے زبان نہ کھولی تو اس استرے سے اس کے جسم کی کھال اتار دوں گا، بول کہاں ہے وہ مائیکرو فلم؟''

''تم اگر اس کے ساتھ ساتھ یہی سلوک میرے ساتھ بھی کرو گے تب بھی تمہیں کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو میں بتاؤں گا کیا؟''

میرا جواب سن کر اس کی آنکھوں میں وحشیانہ سی چمک ابھری اور وہ استرا کھول کر بانو کی طرف مڑتے ہوئے بولا ''میں نے آج تک کسی خوب صورت لڑکی کے کان نہیں کاٹے۔ آج یہ تجربہ بھی سہی۔''

مجھے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک دکھائی دی کہ میں لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اس پر عمل بھی کرے گا۔ بیڈ سے گرنے کے باعث میری ٹانگوں میں ابھی تک شدید تکلیف ہو رہی تھی مگر یہ وقت چوٹیں سہلانے کا نہیں تھا۔

وہ بانو کی طرف بڑھا تو میں نے کروٹ بدلی اور اچانک اپنے جسم کا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میں ہاتھوں کے بل تیزی سے بانو کی طرف دوڑا اور اچانک پشت سے ریوالور والے کی گردن دونوں پیروں سے جکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا وہ الٹ کر گرا تو مارے تکلیف کے میری چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی میں بھی دھپ سے کارپٹ پر جا گرا۔ اس نے استرے سے میرے پیر پر وار کیا۔ اگر میری پیر پہ پلاسٹر کی تہ نہ ہوتی تو شاید میرے پیر کا گوشت ہی اڑ جاتا۔ میں نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر لیٹے ہی لیٹے اس کے چہرے پر زوردار لات

Uploaded By Muhammad Nadeem

ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا مگر مجھے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ ایک مرتبہ پھر میری چیخ نکل گئی۔ ایسا لگا جیسے میرا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔ میں کئی منٹ تک یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس وقت اگر وہ مجھے ذبح بھی کر دیتا تو میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں فرش پر اس زاویے سے پڑا تھا کہ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے آگے رنگ برنگے دائرے ناچ رہے تھے۔ کہیں دور سے بانو کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ ''ہوش میں آؤ خدا کے لئے ہوش میں آؤ ورنہ کبھی ہوش میں نہ آ سکو گے۔ اٹھو خان ورنہ ہم دونوں مارے جائیں گے۔ اٹھو خان بس ذرا سی ہمت اور کر لو۔''

میں نے انتہائی کوشش کے بعد آنکھیں کھولیں تو مجھے ارد گرد کا ماحول دھندلا دھندلا سا نظر آیا ہر چیز یوں تھرک رہی تھی جیسے پانی میں اس کا عکس نظر آ رہا ہو پانی میں جن چیزوں کا عکس نظر آتا ہے تو وہ پانی کے ساتھ تھرکتی رہتی ہے۔ شدید سردی کے باوجود پسینہ، پانی کی طرح میرے جسم سے بہہ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں پڑے پڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔

اپنی بچی کھچی قوت مجتمع کر کے میں بہ مشکل تمام اٹھ بیٹھا۔

''بک اپ خان!'' بانو نے خوش ہو کر کہا۔ ''بک اپ، یو آر گریٹ! ایسے بزدل لوگوں کے ہاتھوں مرنا تمہاری توہین ہے۔'' وہ اپنی دانست میں میری ہمت بڑھا رہی تھی۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ جسے وہ گریٹ سمجھ رہی ہے، وہ خود کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتا ہے، میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں نے گھوم کر پہلے بانو کو دیکھا، پھر اپنے حریف کو دیکھا، وہ فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ میں نے ذرا ٹھہر کر دو چار لمبے لمبے سانس لئے اور آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس کی طرف بڑھا پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس کا گلا دبانے لگا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ پھر وہ بری طرح تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں، اور زبان لمبی ہو کر باہر لٹک رہی تھی۔

میں اسے چھوڑ کر پیچھے کھسک گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کسی جھلستے ہوئے صحرا کو ننگے پاؤں عبور کیا ہو، میری رہی سہی قوت بھی اب جواب دیتی جا رہی تھی اس کے باوجود ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ ابھی میرا کام ادھورا ہے۔ میں نے حریف کا گرا ہوا استرا اٹھایا اور اپاہجوں کی طرح بانو کی طرف بڑھا۔ اسی استرے سے میں نے اس کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ بانو کے آزاد ہوتے ہی مجھے زور کا چکر آیا اور میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ آخری احساس

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

یہ تھا کہ بانو لپک کر حریف کی طرف جا رہی تھی۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں شاید بہت مختصر عرصے کے لئے ہوش و خرد سے بیگانہ ہوا تھا۔ ہوش آیا تو کمرہ وہی تھا اور بانو ریوالور والے کی تلاشی لے رہی تھی۔ میں نے اس سے پانی مانگا، کیونکہ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ ریوالور والے سے فارغ ہو کر اس نے مجھے پانی پلایا اور آرام سے اسی صوفے پر بٹھا دیا جس پر اسے باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ اس وقت وہ میرے اتنے نزدیک تھی کہ اس کے بالوں سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی مہک مجھے مسحور کئے دے رہی تھی۔ میں وقتی طور پر اپنی تکلیف بھول گیا۔

''میں ذرا اس آدمی کی خبر لے لوں، جو باہر گیٹ پر ہے'' بانو نے کہا: ''اس کے بعد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے''۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولی ''نہ جانے کون سی جگہ ہے اور یہاں کوئی گاڑی بھی ہے یا نہیں؟''

میں صوفے پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لیتا رہا، میری حالت اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ پیروں کی تکلیف میں بھی اب وہ شدت نہیں رہی تھی۔ میں پوری طرح ہوش میں تھا اور سوچنے سمجھنے کے قابل تھا مگر میرا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس شخص سے با آسانی نمٹ لے گی۔ فکر تو یہ تھی کہ یہاں سے نکلا کیسے جائے گا؟ اس وقت مجھے شدت سے اپنی بیچارگی اور معذوری کا احساس ہو رہا تھا۔ بانو کے ساتھ پیدل بھی نکل جاتا مگر اس وقت تو یہ مجبوری تھی کہ میں ایک قدم بھی پیدل نہیں چل سکتا تھا۔

اچانک باہر سے یکے بعد دیگرے دو فائر کی آواز گونجی، ایک انسانی چیخ فضا میں ابھری، پھر سناٹا چھا گیا۔ میں صوفے پر بیٹھا ہوا بری طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میری حالت اس شیر کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا جائے اور بچے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہیں۔

تھوڑی دیر بعد بانو کمرے میں داخل ہوئی اور بولی ''میں نے اس آدمی کو ٹھکانے لگا دیا ہے مگر یہاں کوئی گاڑی نہیں ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ یہاں سے نکلا کیسے جائے؟''

اچانک کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ گاڑی ابھی دور تھی مگر سناٹے میں اس کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی۔ بانو جھپٹ کر کھیی ہو گئی اس نے سب سے پہلے اس کمرے کی لائٹ آف کر کے اندھیرا کر دیا، پھر اندازے سے میرے نزدیک آئی اور میرے ہاتھ میں ایک ریوالور تھما دیا۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر گاڑی کے انجن کی آواز نسبتاً بلند ہو گئی۔ کوئی گاڑی شاید اس بنگلے کے باہر آ کر رکی تھی۔ پھر ڈرائیور نے ہارن بجایا تا کہ گیٹ

کھلوا سکے مگر گیٹ کھلنے والا تو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکا تھا۔ ذرا دیر بعد مزید دو فائر ہوئے اور کرب ناک انداز میں کوئی چیخا پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد کوریڈور میں قدموں کی آواز ابھری۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے ایک ہیولا سا نظر آیا۔ میں نے قد و قامت سے اسے پہچان لیا۔ وہ بانو تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا: ''فائر مت کرنا خان!''

''یہ جگہ کسی ویرانے میں ہے۔'' اس نے کہا: ''فائروں کی آواز کسی نے سنی نہیں ہو گی مگر ریوالور والے نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد وہاں کوئی باس آنے والا ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''تم گاڑی تک چل سکو گے افضل؟''

''تم گاڑی تک چلنے کی بات کر رہی ہو، میں تو اس وقت کھڑا نہیں ہو سکتا اپنے پیروں پر'' میں نے جھلا کر کہا۔

''میرا سہارا لے کر بھی نہیں چل سکتے؟'' بانو کے لہجے میں تشویش تھی۔

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''زمین پر پاؤں رکھنے سے بھی مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ کمرے میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر میں بولا۔ ''تم اپنا وقت ضائع مت کرو، خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں تو یوں بھی ناکارہ ہو گیا ہوں۔ کب تک تمہارا ساتھ دے سکوں گا۔'' بانو نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ''مجھے یہیں چھوڑ دو، اور تم نکل جاؤ ورنہ دونوں مارے جائیں گے۔''

''شٹ اپ!'' اس نے مجھے بُری طرح جھڑک دیا۔

''تو کیا مجھے اپنے ان نازک کندھوں پر لاد کر لے جاؤ گی؟'' میں نے کہا۔

''نہ خود کچھ سوچ رہے ہو نہ مجھے کچھ سوچنے دیتے ہو۔'' وہ بھنا کر بولی۔ ''یہ کیا باتیں شروع کر دیں تم نے۔ لگتا ہے تمہارے ذہن پر کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا ہے۔ افضل ہمیں ایسے حالات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ میں نے تو سنجیدگی سے کہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ وہ آزاد رہ کر میرے زیادہ کام آ سکتی تھی مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر بعد اچانک بولی۔ ''خان! تم ہاتھوں کے بل بھی تو چل سکتے ہو نا؟''

برآمدے سے لے کر گیٹ تک پختہ روش تھی اس لئے مجھے گاڑی تک پہنچنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کا سہارا لے کر میں گاڑی تک پہنچ ہی گیا۔ بانو نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ گاڑی کی چابیاں وہ پہلے ہی قبضے میں کر چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہم شہر کے جس حصے میں ہیں۔ وہاں دور دور تک ویرانہ تھا۔ بس ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی جس پر ہم چل رہے تھے۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب خودرو گھنی جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے بانو نے اچانک گاڑی روک دی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔ میں سمجھا گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

''خان، اس نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں باس آنے والا ہے۔''

''ہاں، کہا تھا، پھر؟'' میں الجھ کر بولا۔ ''کیا تم باس سے بھی ملاقات کرنا چاہتی ہو؟''

''تمہارا ذہن واقعی ناکارہ ہو گیا ہے۔'' وہ بُری طرح جھلا گئی۔ ''جس راستے پر ہم چل رہے ہیں، اس کے علاوہ یہاں دور دور تک مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا''۔

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ ''واقعی میرا ذہن اس وقت کام نہیں کر رہا تھا۔ اگر کوئی باس آنے والا تھا تو وہ بھی اسی راستے سے آ رہا ہو گا۔ رستے میں کہیں نہ کہیں اس سے ٹکراؤ بھی ہو سکتا تھا۔ ہاں اگر ہم پختہ سڑک پر نکل جاتے تو بات اور تھی مگر ہمیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ روڈ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے''۔ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ایسا کرو جھاڑیوں میں گنجائش ہو تو گاڑی وہاں چھپا دو اور باس کے گزرنے کا انتظار کرو۔ اس کے گزرنے کے بعد ہم بھی اپنی راہ لیں گے۔''

''یہی مناسب بھی رہے گا۔'' بانو نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرتی ہوں جہاں گاڑی چھپائی جا سکے''۔ یہ کہہ کر وہ سست رفتاری سے گاڑی چلانے لگی۔

اچانک مجھے دائیں طرف ایک ڈھلان دکھائی دی۔ وہاں جھاڑیوں میں اتنی جگہ تھی کہ گاڑی گزر سکتی تھی۔ بانو کی نظر بھی اس ڈھلان پر پڑ چکی تھی۔ میرے کہنے سے پہلے ہی اس نے گاڑی کا رُخ موڑ دیا۔ مجھے بس ایک خوف تھا کہ گاڑی کا کوئی ٹائر پنکچر نہ ہو جائے۔ ڈھلان میں اترنے کے بعد گاڑی بری طرح اچھلتی کودتی آگے کی طرف بڑھی۔ ہر جھٹکے پر مجھے ایسا لگتا تھا کہ گاڑی الٹ جائے گی۔ زمین پر اونچے نیچے گڑھے تھے۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ گاڑی میں کوئی اور ٹوٹ پھوٹ نہ ہو جائے۔ وہ پرانے ماڈل کی کار تھی اس لئے اس کی باڈی بھی مضبوط تھی اور انجن بھی جاندار تھا۔ آگے جا کر وہ ڈھلان بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ بانو نے گاڑی کا رخ بھی ادھر موڑ دیا۔ وہی راستہ آگے جا کر پھر دائیں طرف مڑ کر اوپر والی پگڈنڈی تک جا رہا تھا۔

O

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نیا باب

بانو نے گاڑی وہیں روک دی اور انجن بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ یقیناً طور پر وہ اس بھاگ دوڑ اور مشقت سے تھک گئی ہوگی۔ میرا حال بھی بہت خراب تھا۔ میرے پیروں میں تو تکلیف تھی ہی، اب دونوں بازوؤں میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بازوؤں کے مسلز پل ہو گئے ہوں، ہتھیلیوں کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور ان سے خون رس رہا تھا۔ شاید مشقت کی وجہ سے میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے مگر وہاں پانی کہاں تھا؟ ابھی تک بانو سے تفصیلی گفتگو ہی نہیں ہو سکی تھی۔ میرے اوسان مکمل بحال نہیں ہوئے تھے۔

بانو بھی خاموش بیٹھی رہی۔ ہوا کے شور، جھاڑیوں کی سرسراہٹ اور جھینگروں کی آواز سے عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بھیانک سناٹا میری روح میں اترا جا رہا ہو۔ پھر اس سناٹے کو بانو نے ہی توڑا۔ ''میں اوپر جا کر جائزہ لیتی ہوں، باسٹرڈ ابھی تک آیا کیوں نہیں''۔ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھے۔

''تمہارے اوپر جانے سے کیا وہ آ جائے گا''۔ میں نے ہنس کے کہا۔ ''آرام سے بیٹھی رہو۔ وہ گزرے گا تو انجن کی آواز یہاں بھی سنائی دے گی۔'' ''میں اکیلا بیٹھا بیٹھا بور ہو جاؤں گا۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بانو گاڑی سے اتر گئی اس نے گاڑی کا دروازہ بھی بہت آہستگی سے بند کیا تھا۔ اس کے جسم پر ابھی تک وہی نرسوں والی یونیفارم تھی۔ وہ اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئی۔ ابھی اسے گئے ہوئے مشکل سے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ سناٹا کسی گاڑی کے انجن کی آواز سے پھر ٹوٹ گیا۔ شاید باس آ گیا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں روشنی سی جھلملائی۔ یہ روشنی آنے والی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی تھی۔ پھر کوئی گاڑی تیزی سے گزر گئی۔ کچھ دیر بعد وہاں پھر پہلے کی طرح سناٹا چھا گیا۔ اچانک مجھے کچھ فاصلے پر ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ میں نے جسامت اور چال ڈھال سے اسے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی اور

اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی: ''اب ہمیں بھی نکل جانا چاہئے''۔

''اتنی جلد بازی مت کرو'' میں نے اسے ٹوک دیا ''جب باس کو وہاں اپنے تین آدمیوں کی لاشیں ملیں گی تو وہ اسی برق رفتاری سے پلٹے گا''۔

''تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم ساری رات یہیں بیٹھ کر گزار دیں؟''

''کچھ دیر انتظار کر لو۔ وہ لوگ وہاں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''پھر وہی ہوا۔ مشکل سے انہیں گئے ہوئے بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ان کی واپسی ہو گئی۔ میں نے گاڑی کے انجن سے پہچانا تھا کہ یہ وہی گاڑی ہے جو کچھ دیر پہلے یہاں سے گزری تھی''۔

ان کے جانے کے بعد بانو نے چند منٹ مزید انتظار کیا، پھر گاڑی کا انجن سٹارٹ کرنا چاہا مگر انجن ''گھرر گھرر'' کی آواز نکال کر خاموش ہو گیا۔ بانو نے پھر سیلف لگایا اور کافی دیر تک لگائے رہی مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بیٹری جواب دے گئی ہو۔

''زیادہ سیلف لگاؤ گی تو بیٹری بالکل ہی ڈیک ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''اس کم بخت کو بھی اسی وقت خراب ہونا تھا''۔ بانو نے جھنجھلا کر اسٹیرنگ پر مکا مارا۔

''میرے خیال میں دھکا لگانا پڑے گا''۔ میں نے کہا۔

''اور دھکا لگانے کے لئے فرشتے آئیں گے۔'' بانو جلے کٹے لہجے میں بولی۔

''ایسا کرو مجھے اسٹیرنگ پر بٹھا دو اور تم ذرا ہمت کر کے دھکا لگاؤ۔ ابھی سٹارٹ ہو جائے گی۔''

''او کے''۔ اس نے کہا اور اگلی اطلاع نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میری موت کہیں آس پاس ہی منڈلا رہی ہے ورنہ گاڑی خراب کیوں ہوتی''۔

''تم اتنے ڈپریس اور بزدل کب سے ہو گئے ہو؟'' بانو بھنا کر بولی۔

''میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس پرابلم کا کوئی حل تو سوچ سکتے ہو؟ کیا جسم کے ساتھ ساتھ تمہارا ذہن بھی ناکارہ ہو گیا ہے؟''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس خاموشی سے اندھیرے میں گھورتا رہا''۔

''اس کا ایک ہی حل ہے''۔ بانو نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''میں مین روڈ تک جاؤں اور کوئی گاڑی لے آؤں۔ یہ علاقہ جرائم پیشہ گروہوں کا گڑھ ہے ہم کسی کے بھی قابو آ سکتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں آنے والے ہر اجنبی کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''مگر ٹائم تو دیکھو اس وقت کیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت بھلا کہاں ملے گی گاڑی۔''

''میں یہاں سے مین روڈ تک پیدل جاؤں گی۔'' بانو نے کہا ''ظاہر ہے وہاں پہنچتے پہنچتے صبح ہو جائے گی۔'' اس وقت تک کوئی نہ کوئی گاڑی مل ہی جائے گی۔ پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولی: ''تم آرام سے گاڑی میں بیٹھو بلکہ اسے لاک کر کے سو جاؤ۔ ریوالور ہے نا تمہارے پاس؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''او کے!! میرا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ ''گھبرانا مت، میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گی۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پگڈنڈی کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گاڑی کو اندر سے لاک کیا صرف آگے والی کھڑکیوں کے دونوں شیشے اتنے کھلے چھوڑ دیئے کہ ان سے تازہ ہوا آتی رہے، پھر میں سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بانو کی بات میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ یہاں ہر اجنبی کو دشمن سمجھا جاتا ہے۔

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی یا پھر کمزوری اور نقاہت سے مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ ویسے کچھ بھی رہی ہو مگر اس وقت مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی بات ضرور ہوئی تھی ورنہ میری آنکھ نہ کھلتی۔ میں نے جلدی سے ریوالور نکال لیا اور چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ شاید میری آنکھ بھی کھانسی کی آواز سن کر کھلی تھی۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور آواز کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا پھر وہ دونوں اچانک میرے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں دراز قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ اندھیرے میں اس سے زیادہ میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر ان میں سے کسی ایک کی نظر شاید گاڑی پر پڑ گئی۔ اس نے دوسرے کو آہستہ سے کچھ بتایا، پھر وہ دونوں پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔

اب وہ لوگ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ نہ جانے وہیں کہیں جھاڑیوں میں دبک گئے تھی یا گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ شاید اسی گینگ کے آدمی تھے جو مجھے ہسپتال سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہمارے ہاتھوں ان کے تین آدمی مارے گئے تھے۔ پھر وہ آسانی سے ہمیں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ شاید وہ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس لمحے مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ میرے دشمن سر پر پہنچ گئے اور میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے'' میں خود کلامی کے انداز میں بولا: ''اگر میری موت یونہی لکھی ہے تو یونہی سہی، مر جاؤں گا مگر ہتھیار نہیں ڈالوں گا''۔

''رانا!'' کوئی میرے قریب سے سرگوشی میں بولا۔ ''لگتا ہے موٹر میں کوئی ہے ہی نہیں''۔

گویا وہ چھپ کر گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ وہ صرف دو ہی تھے۔ ابھی تک مجھے ان کا کوئی اور ساتھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے ان کے دوسرے ساتھی مجھے اور بانو کو اردگرد کے علاقے میں تلاش کر رہے ہوں۔

''کہتا تو ٹھیک ہے'' پہلے نے جواب دیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ موٹر میں کوئی نہیں ہے۔'' پھر وہ سوچ کر بولا ''لگتا ہے کسی کی موٹر یہاں خراب ہو گئی اور وہ موٹر چھوڑ کر چلا گیا۔''

ان دونوں کی گفتگو سے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ اس گینگ کے آدمی نہیں تھے ورنہ گاڑی کو فوراً پہچان لیتے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی اور لوگ تھے۔

''چل، اس موٹر کو دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے ہمیں کوئی کام کی چیز مل جائے۔''

میرے اعصاب شل ہو گئے۔ میں سیٹ پر اس انداز سے لیٹ گیا تھا کہ باہر سے کسی کو کچھ نظر نہ آ سکے۔ وہ لوگ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔

''تو ٹھہر میں دیکھتا ہوں''۔ یہ کہہ کر کسی نے جونہی سر اندر ڈالا میں نے جھپٹ کر اس کا گلا پکڑ لیا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ تمہارا دوست میرے قبضے میں ہے۔ اگر تم ہاتھ اٹھا کر میرے سامنے نہیں آئے تو میں تمہارے دوست کو ہلاک کر دوں گا۔ پھر میں نے غرا کر اس سے کہا۔ ''اپنے دوست کو اپنی زبان سے بتاؤ کہ تم میرے قبضے میں ہو''۔ یہ کہتے ہوئے اس کا گلا چھوڑ کر گریبان پکڑ لیا اور ریوالور سیٹ سے اٹھا کر اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔ ''کہو اپنے دوست سے۔'' میں نے اسے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بُری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''میں ادھر گاڑی میں ہوں رانا، اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے آنا ورنہ یہ میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی گولی مار دیں گے۔''

رانا واقعی اس کا دوست تھا۔ وہ شاید نزدیک ہی کہیں موجود تھا۔ اچانک دونوں ہاتھ بلند کئے ہوئے سامنے آ گیا۔ مغلوب کی حالت اس وقت بہت مضحکہ خیز تھی۔ وہ آدھا گاڑی کے اندر اور آدھا باہر اور سیٹ پر اوندھا پڑا تھا۔

رانا گاڑی کے عین سامنے آ کر ٹھہر گیا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں انسپکٹر رام سنگھ ہوں''۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

تم کچھ بھی ہو سکتے ہو صاحب'' رانا نے کہا۔ مگر پولیس والے نہیں ہو سکتے۔ پولیس کا کوئی آدمی اتنا جی دار نہیں ہے کہ اکیلا رانا کے آدمیوں کا راستہ روک سکے۔ پولیس کو تو ہم نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے صاحب اب بتاؤ کہ کون ہو تم اور تم نے کیوں ہمارا راستہ روکا ہے؟''

''میں نے تمہارا راستہ روکا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو خود ہی موٹر کی فکر پڑ گئی تھی۔ میں تو آرام سے یہاں سو رہا تھا''۔

''تمہیں سونے کے لئے بھی یہی جگہ رہ گئی تھی؟'' اس مرتبہ دوسرے نے کہا۔

''تو کیا کرتا؟'' میں نے بے زاری کا مظاہرہ کیا۔ ''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ پولیس تو میری بھی تلاش میں ہے''۔

''ارے تو پھر اس کھلونے کو جیب میں رکھو اور دوستوں کی طرح بات کرو''۔ رانا نے خوش دلی سے کہا۔ ''پولیس سے تو اپنی بھی پرانی دشمنی ہے۔ اس حساب سے تو تم ہمارے دوست ہوئے''۔

میں نے مغلوب کو چھوڑ دیا اور ریوالور جیب میں رکھ لی۔ درحقیقت میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ وہ دونوں نہ جانے کون تھے اور پولیس سے کیوں چھپ رہے تھے؟ ممکن ہے انہوں نے مجھے جھوٹ بولا ہو اور وہ اسی گینگ کے آدمی ہوں جس نے مجھے ہسپتال سے اغوا کیا تھا مگر اس صورت حال میں اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا؟

''یہ ہوئی نہ بات'' رانا ہنس کر بولا۔ ''اب بتاؤ کیا بات ہے؟ تم پولیس سے کیوں چھپ

رہے ہو؟''

''میں ایک ڈکیتی کرتا ہوا پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو گیا تھا۔ پولیس نے اسی حالت میں مجھے گرفتار کیا اور ہسپتال پہنچا دیا۔ وہاں میں ایک مہینے تک رہا، پھر میرے ساتھیوں کو موقع مل گیا اور وہ مجھے ہسپتال سے اٹھا لائے۔ پولیس بھی چوکس تھی۔ انہوں نے ہمارا پیچھا کیا مگر ہم کسی نہ کسی طرح اس سے بچ گئے۔ یہاں آ کر گاڑی خراب ہو گئی۔ میری ساتھی کسی گاڑی کا انتظام کرنے گئی ہے۔'' میں نے مختصراً اسے ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔ ڈکیتی والے واقعہ کے سوا اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔

''تمہاری ساتھی؟'' رانا نے حیرت سے دہرایا۔ ''کیا وہ کوئی لڑکی ہے؟''

''وہ میری پتنی ہے'' میں نے جواب دیا۔

''واہ بھیا واہ تم مرد ہو کر گاڑی میں لیٹ گئے اور اپنی پتنی کو گاڑی کے لئے بھیج دیا کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ڈاکے ڈالتی ہے؟''

''ہاں وہ میرے ساتھ ڈاکے بھی مارتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ میں اسے پنجاب سے بیاہ کر لایا تھا۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے۔'' رانا نے کہا ''مگر اس وقت تم نے اسے کیوں بھیجا؟''

''مجبوری تھی ورنہ کبھی پتی ایسا کر سکتا ہے؟''

''ایسی بھی کیا مجبوری؟'' رانا نے کہا ''پتنی کو موت کے منہ میں دھکیل کر خود آرام سے سو رہے ہو؟''

میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ گولیاں لگی تھیں۔ میں ویسے تو ٹھیک ہو گیا ہوں مگر میرے دونوں پاؤں ابھی تک ناکارہ ہیں۔ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔

''ارے'' رانا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اب سمجھ میں آئی میری مجبوری'' میں نے کہا۔ ''اس وقت تمہاری جگہ پولیس ہوتی تو وہ بڑے اطمینان سے مجھے دھر لیتی اور پھانسی پر لٹکا دیتی۔ ڈکیتی کے وقت میرے ہاتھ سے دو پولیس والے بھی مارے گئے تھے، اگر میں زخمی نہ ہوتا تو شاید اب تک پھانسی کے پھندے سے لٹک چکا ہوتا''۔ پھر میں نے ہنس کر کہا ''میں نے تم لوگوں کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے اب اگر تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے تو میں کیا کر لوں گا۔''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''مجھے پھر کبھی یہ گالی مت دینا۔'' رانا نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جسے زبان سے ایک دفعہ دوست کہہ دیتا ہوں، پھر اسے دوست سمجھتا بھی ہوں۔ تم نے رانا امر سنگھ پر بھروسہ کیا ہے تو وہ اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔''

''گاڑی میں خرابی کیا ہوئی ہے؟'' اس کے ساتھی نے شاید موضوع بدلنا چاہا تھا۔

''اس کی بیٹری کمزور ہوگئی ہے اور تم نے شاید غور نہیں کیا! پیچھے والے دونوں ٹائر پنکچر ہیں۔''

وہ جواب میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر پُرخیال انداز میں بولا ''کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔''

''گاڑی ابھی دور ہے وہ ذرا نزدیک آئے گی تو اس کے انجن کی آواز تم بھی سن لو گے۔''

مشکل سے دو منٹ بعد میں نے بھی اس گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ آواز ابھی خاصی دور تھی مجھے رانا کی قوت سماعت پر رشک آیا۔

پھر آواز لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی۔ کوئی گاڑی تیزی سے اس طرف آ رہی تھی۔

''مین روڈ تو یہاں سے بہت دور ہے، کم از کم دس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

الرحمن روڈ یہاں سے دس کلومیٹر تھی تو بانو پیدل اتنی جلدی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتا تھا؟

گاڑی کے انجن کا شور اب بڑھ گیا تھا۔

''منگل! تم رام سنگھ کو اٹھا کر جھاڑیوں میں لے جاؤ۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔'' رانا نے اپنے ساتھی سے کہا۔

وہ مجھے ابھی تک رام سنگھ ہی سمجھ رہا تھا۔

گاڑی کی آواز اب بالکل نزدیک آ چکی تھی۔ منگل مضبوط تن و توش کا آدمی تھا۔ اس نے مجھے کندھے پر لادا اور تیزی سے جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ گھنی جھاڑیوں میں گھس کر اس نے مجھے بہت احتیاط سے اتار دیا۔

''تمہارا سردار کون ہے؟'' میں نے منگل سے پوچھا۔ ''ہمارا سردار جگ ہے۔ پولیس والوں کے لئے تو اس کا نام بھی دہشت بن کر رہ گیا ہے۔''

پگڈنڈی پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ اس کے ہیڈ لیمپس سے اچھا خاصہ حصہ روشن ہو گیا تھا۔ پھر اچانک فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی، کسی کی کرب ناک چیخ فضا میں ابھری پھر کوئی

ڈھلان سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگا۔ میں نے اضطراری طور پر اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ منگل بھی چیتے کی طرح چوکنا دکھائی دے رہا تھا۔ فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ گرنے والا ایک مرتبہ پھر کرب ناک انداز میں چیخا، پھر خاموش ہو گیا اب مجھے منگل کے ہاتھ میں ریوالور دکھائی دے رہا تھا۔ اب تک میں اسے غیر مسلح سمجھ رہا تھا۔ اوپر فائرنگ جتنی اچانک شروع ہوئی تھی، اتنی ہی جلد ختم بھی ہو گئی تھی اور اب وہاں پھر وہی بھیانا سناٹا چھا گیا تھا۔ فائرنگ اچانک ہی پھر شروع ہو گئی۔ مگر اب اس میں وہ پہلے والی شدت نہیں، اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو طرفہ فائرنگ ہو رہی ہو۔ میں رانا کی طرف سے فکر مند ہو رہا تھا اور رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں گرنے والا رانا ہی تو نہیں تھا؟ ان میں سے ایک فائر کار بائن کا تھا اور دوسرا ریوالور کا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔'' منگل نے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔''

پہلے میں نے اسے روکنا چاہا، پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ممکن ہے رانا کو مدد کی ضرورت ہو۔

ہم اس وقت گھنی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان جھاڑیوں میں کثرت سے کانٹے تھے۔ ان کانٹوں سے نہ صرف میرے کپڑے پھٹ گئے تھے بلکہ جسم پر بھی خراشیں پڑ گئی تھیں، پھر وہاں مچھر اور دوسرے زہریلے کیڑے بھی تھے۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر میرا برا حال کر دیا تھا مگر میں وہاں بیٹھا رہنے پر مجبور تھا منگل آہستگی سے اس طرف چلا گیا تھا۔ جدھر رانا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد فائرنگ میں پھر شدت پیدا ہو گئی۔ اچانک پھر ایک انسانی چیخ فضا میں ابھری، بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی پے در پے کئی فائر ہوئے۔ پھر گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ اچانک وہاں سکوت چھا گیا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

فائر مت کرنا۔ میں منگل ہوں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بالکل مخالف سمت سے ظاہر ہوا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''پتا نہیں کون لوگ تھے۔'' منگل نے سرگوشی میں جواب دیا۔

''رانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی وہیں ہے۔'' منگل نے جواب دیا۔ رانا کا خیال ہے کہ ان کا ایک ساتھی آس پاس

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کی جھاڑیوں چھپا ہوا ہے۔

''ایک آدمی کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایک سے زیادہ بھی تو ہو سکتے ہیں؟''

''نہیں، باقی سب بھاگ گئے ہیں۔ وہ آدمی رانا کی گولیوں سے شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ اتنی بدحواسی میں بھاگے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو بھی یہیں چھوڑ گئے ہیں۔''

''مگر وہ لوگ تھے کون؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اس آدمی کو زندہ پکڑنے کے چکر میں ہے۔ اسی سے کچھ معلوم ہو سکے گا۔'' منگل نے سرگوشی میں بتایا۔

میں جواب میں کہنے ہی والا تھا کہ زخمی تو ابھی زندہ ہوں گے۔ ان سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے مگر ہمارے بہت نزدیک سے جھاڑیاں ہلیں اور ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی ان میں چل رہا ہو۔ منگل سنگھ پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ میں بھی بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں میں پھر حرکت ہوئی اور اچانک مجھے ایک ہیولا سا دکھا دیا۔ میں نے اس کے قد و قامت اور چال ڈھال سے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ وہ رانا نہیں ہے۔ اس نے کسی گہرے رنگ کا پینٹ پہن رکھا تھا، ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ کہیں اس کی نظر ہم پر نہ پڑ جائے مگر وہ اپنی ہی دھن میں مگن آگے بڑھ رہا تھا۔ منگل بھی اسے دیکھ چکا تھا اور اس نے آنے والے کے پیروں کا نشانہ لے لیا تھا۔

پگڈنڈی کی طرف سے اچانک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ وہ بھڑک کر پلٹا۔ اسی وقت منگل کو موقع مل گیا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور پلک جھپکتے میں اپنے شکار کو قابو کر لیا۔ وہ بھی اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے زور لگا کر منگل کی گرفت سے نکلنا چاہا۔ اسی کوشش میں دونوں زمین پر گر پڑے۔ منگل کے شکار نے اس کے باوجود رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ اگر اس کی انگلی ٹریگر پر ہوتی تو وہ بدحواسی میں اب تک فائر بھی کر چکا ہوتا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' پھر میں نے ایک ہوائی فائر بھی کر دیا۔ منگل کا شکار ایک دم ساکت ہو گیا۔ یہی حال منگل کا بھی تھا۔ وہ ابھی شاید میری آواز پہچان نہیں پایا تھا۔ میری یہ حرکت خاصی غیر دانش مندانہ تھی۔ ہم میں سے کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہاں دشمنوں کا یہی ایک آدمی ہے یا جھاڑیوں میں مزید آدمی بھی موجود ہیں۔ فائر کی آواز سے وہ ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں نے گویا یہ اعلان کر دیا تھا کہ

میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔

''رائفل پھینک دو''۔ میں نے سخت لہجے میں کہا ''ورنہ تمہاری گردن توڑ دوں گا''۔

ایک مرتبہ جھاڑیوں میں پھر حرکت ہوئی میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ منگل بھی چونکا مگر شکار کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے رانا کی سرگوشی سنائی دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو منگل؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں اور میں نے ایک شکار بھی پکڑ رکھا ہے۔'' رانا کی آواز سنتے ہی منگل کا اعتماد لوٹ آیا۔

''اب یہاں سے نکل چلو۔'' رانا نے کہا۔ ''یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ فائرنگ کی آواز اور دور تک سنی گئی ہو گی۔ آس پاس کے گاؤں والے جاگ گئے ہوں گے۔ پولیس بھی ادھر آ سکتی ہے اور یہ لوگ بھی جو ابھی میدان چھوڑ کر بھاگے ہیں۔''

''مگر یہ لوگ کون تھے؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''یہ تو ہمارا یہ دوست بتائے گا۔'' اس نے شکار کی طرف اشارہ کیا۔ ''مگر اس سے بعد میں پوچھ گچھ کریں گے۔ ابھی تو یہاں سے نکلو۔''

منگل نے اس آدمی کے ہاتھ باندھنا چاہے تو رانا نے اسے روک دیا۔

''اس کے ہاتھ مت باندھو۔ یہی رام سنگھ کو اٹھائے گا۔ ہمارے جیپ یہاں سے کم از کم تین کلومیٹر کے فاصلے پر تو ہو گی؟'' پھر وہ لہجہ بدل کر بولا۔ ''ہاں، اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے یا کوئی اور حرکت کرے تو اسے گولی مار دینا۔''

''اس کی تو فکر ہی مت کرو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اس نے ذرا بھی آگے پیچھے ہونے کی کوشش کی تو میں خود اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

''چلو اٹھاؤ اسے۔'' منگل نے ڈپٹ کر کہا اور اندھیرے میں ٹٹول کر اس کی پھینکی ہوئی رائفل اٹھا لی۔ پھر وہ جھک کر کچھ ڈھونڈنے لگا۔

''اب کیا ہوا؟'' رانا نے پوچھا۔

''اسے پکڑنے میں میرا ریوالور کہیں گر گیا ہے۔'' منگل متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔

''لعنت بھیجو ریوالور پر!'' اس نے کہا کون سا، اس کا لائسنس تمہارے نام پر ہے۔

اس دوران میں شکار نے مجھے اپنی پیٹھ پر لاد لیا تھا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا مگر میرے جسم کو اٹھا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کرنا ہموار اور کانٹے دار زمین پر چلنا بھی کھیل نہیں تھا۔ کچھ ہی دور چل کے وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ میں نے بائیں بازو سے اس کی گردن کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ہمارے پیچھے منگل ہاتھ میں رائفل اٹھائے چل رہا تھا۔ مجھے اٹھانے والا اب بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اگر اسے میرے ریوالور اور منگل کی رائفل کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک مجھے پھینک چکا ہوتا۔ ایک جگہ وہ بُری طرح لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا، پھر وہ وہیں رُک گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''بس اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔''

''او میاں نازک اندام!'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا ''چلتے رہو ورنہ میں اس گھوڑے کو گولی مار دیتا ہوں جو میری سواری کے قابل نہ رہے۔''

''تو پھر، مار دو گولی۔'' اس نے ہانپتے ہوئے یہ بہ مشکل تمام کہا۔ ''مرنا تو مجھے ویسے بھی ہے، پھر یہ عذاب جھیل کر کیوں مروں؟''

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ تمہیں مرنا ہے؟'' رانا نے اچانک پوچھا۔ وہ ہمارے آگے چل رہا تھا اور اسے رکتا دیکھ کر پلٹ آیا تھا۔

''تو کیا تم لوگ مجھے کسی دعوت میں لے جا رہے ہو؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا ہو ورنہ انسان ایک ریوالور اور ایک رائفل کی زد میں ہو تو سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ مبادا یہ بھی میرے دشمن کو ناگوار گزرے اور وہ گولی مار دے۔

''بس اب زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔'' رانا نے کہا ''اور بے فکر رہو ہم دشمن پر اوچھا وار نہیں کرتے۔ تمہیں جب بھی ماریں گے للکار کر ماریں گے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر منگل سے مخاطب ہوا۔ ''منگل! اس میں اب واقعی چلنے کی سکت نہیں رہی ہوگی۔ اب اسے تم اٹھا لو۔''

اس لمحے میرے عجیب احساسات تھے۔ میں نے آج تک ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی جو دوسروں کے لئے بوجھ بن گیا تھا۔

○

اس دوران منگل نے مجھے پشت پر اٹھایا تو میں خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ رائفل اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی۔ ریوالور نکال کر اپنے شکار پر تان لیا تھا۔ چند منٹ تک ناہموار زمین پر چلنے کے بعد جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے چھوٹا سا ایک میدان تھا۔ اس کے بعد گھنی جھاڑیاں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ یہیں کہیں ان لوگوں کی گاڑی کھڑی ہوگی مگر وہاں مجھے کوئی گاڑی دکھائی نہ

دی۔ رہ رہ کر مجھے بانو کا خیال آ رہا تھا کہ وہ گاڑی کا بندوبست کر کے وہاں پہنچے گی اور مجھے وہاں نہ پائے گی تو کیا سوچے گی۔ ممکن ہے دشمن کا کوئی آدمی اب بھی ان جھاڑیوں میں موجود ہو۔ ممکن ہے وہ لوگ جنہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا، پلٹ آئیں۔ بانو بیچاری تو بے خبری میں ماری جائے گی۔ روانگی سے پہلے مجھے اس کا خیال آیا تھا مگر وہ لوگ اتنی عجلت میں تھے کہ میں ان سے اس سلسلے میں بات نہ کر سکا تھا۔ میرا تو ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ معذوری کے احساس نے میرے ذہن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ میں نے اچانک منگل کو مخاطب کیا۔ ''منگل! ایسا کرو تم لوگ گاڑی میں مجھے وہیں چھوڑ دو جہاں سے لائے ہو۔''

''وہیں چھوڑ دیں۔'' منگل نے حیرت سے کہا، اس کا لہجہ ہموار تھا اور ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ واقعی وہ مضبوط آدمی تھا۔

''ہاں یار''۔ میں نے کہا ''میری پتنی وہاں پہنچے گی تو بہت پریشان ہوگی۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' منگل نے کہا ''ہم پہلے ہی سب کچھ سوچ چکے ہیں۔ تمہیں گاڑی تک پہنچا کے ہم میں سے کوئی دوبارہ وہاں چلا جائے گا اور تمہاری پتنی کو لے آئے گا۔ بس تم اس کی کوئی پہچان بتا دینا۔'' پھر وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔ ''میں بھی کسی پاگل پن کی بات کر رہا ہوں۔ اس سمے بھلا کوئی دوسری عورت اس ویران علاقے میں کیوں آئے گی۔ ظاہر ہے جو عورت بھی وہاں پہنچے گی، تمہاری پتنی ہوگی۔'' منگل نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔

''مگر اچانک اس کے سامنے مت آ جانا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''کیوں بھائی'' منگل مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ ''کیا وہ کانٹے کو دوڑتی ہے؟''

''کانٹے کو دوڑتی نہیں ہے بلکہ آدمی کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔''

پھر ہم نے وہ میدان بھی عبور کر لیا۔ گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔ جھاڑیوں کے دوسری طرف پگڈنڈی سی تھی اور وہیں مجھے قدیم ماڈل کی دیلیز جیپ دکھائی دی۔ جیپ سے چند گز کے فاصلے پر رانا نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ مطمئن ہو کر جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ منگل نے مجھے احتیاط سے جیپ کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ پھر سیٹ کے نیچے سے رسی نکال کر پھرتی سے قیدی کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور اسے بھی پچھلی نشست کے فائدان میں ٹھونس دیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

رانا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ دوبارہ وہاں پیدل جانے کی بجائے جیپ میں جائیں۔''

''جیپ کا راستہ بہت لمبا ہے۔'' منگل نے کہا ''اس میں شاید اتنا پٹرول بھی نہیں ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اتنی دیر میں اس کی پتنی وہاں پہنچ کر واپس چلی جائے یا کسی مصیبت میں پھنس جائے۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔'' رانا نے کہا ''مگر دوبارہ وہاں تک پیدل جانے میں بھی تو اتنا ہی وقت لگے گا۔ ہاں اگر کہیں سے موٹر سائیکل مل جاتی تو بات بن سکتی تھی۔ موٹر سائیکل تو اس راستے پر بھی چل سکتی ہے جہاں سے ہم آئے ہیں۔''

ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس سے راستہ روشن ہوگیا۔ وہ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی تھی اس لئے گاڑی ابھی تک ہمیں دکھائی نہیں دی تھی۔ رانا نے جلدی سے جیپ کا انجن سٹارٹ کیا اور اسے ریورس کر کے جھاڑیوں میں گھسا دیا۔ ایک تو وہ جھاڑیاں خوب گھنی تھیں، پھر جیپ کا رنگ بھی گہرا تھا اس لئے وہ اب آسانی سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ چند لمحے بعد آنے والی گاڑی کے انجن کی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی بالکل ہمارے نزدیک پہنچ گئی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ منگل اور رانا جیپ میں موجود نہیں ہیں۔ وہ لوگ نہ جانے کس وقت اتر گئے تھے مجھے اچانک قیدی کا خیال آیا۔ وہ شور مچا کر گاڑی والوں کو ادھر متوجہ کر سکتا تھا میں نے پھرتی سے ریوالور نکالا اور قیدی کی کنپٹی سے لگا دیا مگر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ منگل نے کچا کام نہیں کیا تھا۔ اس نے باندھتے وقت یا شاید اس وقت جب آنے والی گاڑی کی آواز سنی تھی۔ قیدی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں دوبارہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

گاڑی اچانک سر پر آ پہنچی۔ اس وقت منگل یا رانا میں سے کسی نے اس پر فائر کر دیا۔ میں نے گاڑی کو لڑکھڑاتے دیکھا، پھر شاید فائر کر کے اس کا ٹائر ناکارہ کیا گیا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا تو گاڑی اچانک ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہو کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔

''تم لوگ ایک ایک کر کے گاڑی سے اتر آؤ ورنہ ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' رانا نے چیخ کر کہا۔

دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس گاڑی میں کوئی موجود ہی نہ رہا ہو۔

''میں پانچ تک گنوں گا۔'' رانا نے پھر چیخ کر کہا۔ ''اس کے بعد بھی تم لوگ باہر نہ آئے تو میں گاڑی کو بم سے اڑا دوں گا۔'' ایک...... دو...... تین...... چار......

اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور رانا اذیت ناک انداز میں چیخا۔ میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ گاڑی میں جو کوئی بھی تھا، غضب کا نشانے باز تھا ورنہ اندھیرے میں محض آواز کا نشانہ لینا بچوں کا کھیل نہیں۔

''کیا ہوا؟'' پگڈنڈی کی دوسری جانب سے منگل کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں وحشت تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' منگل چیخا۔

میرا دل چاہا کہ اسے اس حماقت سے روک دوں۔ وہ چیخ چیخ کر خود ہی اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ ''تم بولتے کیوں نہیں......'' اچانک پھر فائر ہوا اور منگل کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ بھی دیدہ ونشانے باز کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے تنہا رہ جانے کا احساس ہوا۔ میرے دونوں ہمدرد یا تو مارے گئے تھے یا شدید زخمی ہو گئے تھے۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ جب اس نادیدہ دشمن نے منگل پر فائر کیا تھا تو میں نے جھاڑیوں میں ایک جگہ شعلہ سا چمکتا دیکھ لیا تھا۔ گویا وہ اس طرف چھپا ہوا تھا۔ وہ جگہ اس کی گاڑی سے خاصے فاصلے پر تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے گاڑی پر پہلا فائر ہوتے ہی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میں نے سوچا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ کچھ کر کے مرا جائے۔ میں نے اندازے سے اس جگہ کا نشانہ لیا جہاں مجھے شعلے کی چمک دکھائی دی تھی، پھر میں نے اللہ کا نام لے کر فائر کر دیا۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ ہی کوئی کرب ناک انداز میں چیخا اور جھاڑیاں بری طرح ہلنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زخمی ہونے والا بری طرح تڑپ رہا ہو۔ میں نے ہلتی ہوئی جھاڑیوں پر دوسرا فائر کیا۔ زخمی ہونے والے کی دوسری چیخ بہت کرب ناک تھی۔ وہ وہ ایک دم ساکت ہو گیا۔ اپنی اس کامیابی سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں گزشتہ کئی گھنٹے سے اندھیرے میں تھا۔ اس لئے اب میری آنکھیں اندھیرے میں بھی خوب کام کر رہی تھیں۔ میں چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ میری زندگی کا آخری معرکہ ہے۔ اس لئے اب مجھے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے جھاڑیوں میں حرکت ہوئی ہو جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے جھاڑیوں کا نشانہ لے کر فائر کرنے کا ارادہ کیا، پھر خود ہی اسے مسترد کر دیا۔ فاصلہ کافی تھا اور وہ جگہ روشنی کی پہنچ سے باہر تھی اس لئے یہ فائر محض ایک گولی ضائع کرنے اور دشمن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ اچانک مجھے اس رائفل کا خیال آیا جو منگل نے قیدی سے چھینی تھی۔ میں نے سوچا ممکن ہے رانا نے وہ رائفل جیپ میں چھوڑ دی ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پکڑ کر آگے کی طرف بڑھا۔ درمیان میں قیدی تھا۔ میں نے جسم کا پورا زور دونوں ہاتھوں پر ڈالا اور جھٹکے سے قیدی کے سینے پر بیٹھ گیا۔ اب میری پشت جیپ کے بونٹ کی طرف تھی۔ دونوں سیٹوں کی درمیانی جگہ میں سے ہاتھ ڈال کر میں نے ٹٹولا تو رائفل کے بٹ سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ گولیوں کی بیلٹ بھی پڑی تھے۔ میں نے دونوں چیزیں اٹھا لیں اور سیٹ کا سہارا لے کر دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ وہاں سے نشانہ لینا بہت آسان تھا۔ رائفل لوڈ تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر جھاڑیوں پر نظریں جما دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں پھر خفیف سی حرکت ہوئی تو میں نے نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دھماکہ ہوتے ہی کوئی ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا پھر اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ گویا میں نے دشمنوں کا ایک اور آدمی کم کر دیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا نشانہ اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ پے در پے کامیابیوں نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس کے بعد پھر وہاں گمبھیر سناٹا طاری ہو گیا۔ ہوا کی سرسراہٹ اور جھینگروں کی مکروہ آوازیں سناٹے کو مزید بوجھل بنا رہی تھیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چوکنے انداز میں بیٹھ گیا۔ اب تک کی صورتحال نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

یونہی بیٹھے بیٹھے کافی دیر گزر گئی۔ جھاڑیوں پر نظریں جمائے جمائے میری آنکھوں میں نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے مگر کہیں سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں یہ جیپ لے کر یہاں سے نکل جاؤں مسئلہ صرف اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھنے کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ٹانگوں کی تکلیف کے باوجود میں جیپ ڈرائیو کر لوں گا۔ میں نے اکتا کر رائفل گود میں رکھ لی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے بالکل نزدیک آہٹ سی ہوئی ہو۔ میں نے پھرتی سے رائفل اٹھا لی اور ہلتی ہوئی جھاڑیوں سے فائر کرنے ہی والا تھا کہ منگل کی آواز سنائی دی۔ ”فائر مت کرنا! یہ میں ہوں منگل۔“ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا جیپ تک آ گیا۔ اس کے زندہ بچ جانے پر مجھے خوشی ہوئی مگر اس سے زیادہ تشویش اس کے زخمی ہونے کی تھی۔ میں نے پوچھا ”کیا تم زیادہ زخمی ہو گئے ہو منگل؟“

”زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے مگر خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔“ اس نے ...

میں کہا۔

”اور رانا.....“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو میرا ساتھ چھوڑ گیا بھیا!“ منگل بلکنے لگا۔ ”وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے روٹھ گیا۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟“

رانا اور منگل دونوں مخالف سمتوں میں تھے۔ میں شروع سے جھاڑیوں پر نظر جمائے رہا تھا۔ منگل اگر حرکت بھی کرتا تو میری نظروں میں آ جاتا۔ اسی لئے میں اس سے رانا کی موت کے بارے میں تصدیق چاہتا تھا ممکن ہے وہ محض اندازے کی بنا پر بات کر رہا ہو۔

”میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بھیا“۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں زخمی ہونے کے بعد ایک لمبا چکر کاٹ کر اس تک پہنچا تھا۔ اسی لئے تم مجھے نہیں دیکھ سکے۔ پھر تمہارا دھیان تو دشمنوں کی طرف تھا۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا ”میں کیسا بدنصیب ہوں کہ اپنے دوست کا کریا کرم بھی نہ کر سکا۔“

”تم خود بھی تو زخمی ہو منگل۔“ میں نے جلدی سے کہا ”چلو گاڑی میں بیٹھو اور کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔“

”میں گاڑی نہیں چلا سکوں گا بھیا“۔ منگل نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”گولی میرے سیدھے پیر پر لگی ہے۔“

”ہڈی تو محفوظ ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ پھر اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ فریکچر ہوا ہے یا نہیں؟

”میرا خیال ہے کہ گولی میری ران میں گھس گئی ہے۔ شاید ہڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ میرا سیدھا پیر بالکل سن ہو کر رہ گیا ہے۔“ اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی جا رہی تھی۔

اس کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا ورنہ وہ اتنا نازک مزاج نہیں تھا کہ گاڑی ڈرائیو نہ کر سکتا۔

”ایسا کرو منگل مجھے کسی طرح اسٹیرنگ سیٹ پر بٹھا دو۔ میں ڈرائیونگ کر لوں گا۔“

اس نے جیپ کی پسنجر سیٹ فولڈ اور سہارا دینے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بری طرح کانپ رہا ہے۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ منگل ایسا شہ زور تو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اطمینان سے پیٹھ پر لادے چل رہا تھا، اب خود سہارے کا محتاج تھا۔ پسنجر سیٹ فولڈ ہو جانے کے بعد اسٹیرنگ پر بیٹھنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کی پشت کا سہارا لیا اور پھر پہلے کی طرح قیدی کے سینے پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے کھسکتا ہوا میں فولڈڈ پسنجر سیٹ پر بیٹھا، پھر اسٹیرنگ تھام کر بوقت تمام سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کوشش میں جیپ کا گیئر میری ٹانگ سے ٹکرایا تو تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پیچھے سے ڈرائیونگ سیٹ تک آنے میں میرا برا حال ہو گیا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور سردی کے باوجود پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں اسٹیرنگ پر سر ٹکا کر بُری طرح ہانپنے لگا۔

اس دوران میں منگل نے قیدی کو پوری طرح جیپ سے باہر گھسیٹ کر پھینک دیا تھا۔ پھر اس نے پسنجر سیٹ کی پشت سیدھی کی اور بہت کوشش کے بعد جیپ میں سوار ہو گیا اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جلدی کرو خان! مجھے لگ رہا ہے کہ میں زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

گنیش میں چابی موجود تھی۔ میں نے جلدی سے انجن اسٹارٹ کی اور منگل سے پوچھا۔ ''کی طرف چلنا ہے۔''

''الٹے ہاتھ کی طرف چلو'' اس نے آہستہ سے کہا۔

جیپ جھٹکے سے آگے بڑھی اور میں نے اسے بائیں طرف موڑ کر پوری قوت سے دوڑا دیا۔ وہ پگڈنڈی تھی تو کچی مگر خاصی ہموار تھی۔ اس لئے مجھے جیپ بھگانے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

منگل ہی مجھے راستہ بتاتا رہا۔ اس کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی اور کسی بھی لمحے وہ بے ہوش ہو سکتا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اب تک ہوش میں ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک کبھی کا مر چکا ہوتا مگر وہ آہنی اعصاب کا جاندار آدمی تھا اس لئے بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باوجود ہوش و حواس میں تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد منگل کے اشارے پر میں نے جیپ درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف موڑ دی۔ پگڈنڈی سے یہاں تک جانے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہاں جیپ جانے کا ایک پیچیدہ راستہ تھا۔ جو درختوں، اور جھاڑیوں میں بل کھاتا درختوں کے اس جھنڈ کے اندر جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے گاڑی کے ہیڈ لائٹس آن کر لیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ راستہ خفیہ طور پر بنایا گیا ہے۔

مزید دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم درختوں کے اس جھنڈ میں داخل ہوئے تو مجھے ایک کٹیا دکھائی دی۔ منگل نے جیپ روکنے کو کہا۔ اب تو اس کی حلق سے آواز بھی سرگوشی میں نکل رہی تھی۔

میں نے جیپ روک کر اس سے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے''۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جب دوبارہ پکارنے پر بھی وہ خاموش رہا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں جھک کر اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ منگل مجھے وہاں کیوں لایا تھا؟ اچانک اس کٹیا کے دروازے پر مجھے ایک ہندو یوگی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور وہ حیرت بھرے انداز میں جیپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً جیپ کی آواز سن کر باہر آیا تھا۔ وہ غالباً اس انتظار میں ہو گا کہ جیپ میں سے کوئی اترے گا مگر ہم دونوں میں سے تو کوئی بھی اترنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ لالٹین لئے چند لمحے کٹیا کے دروازے پر کھڑا رہا، پھر الجھے الجھے انداز میں جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ جیپ کے نزدیک آ کر اس نے لالٹین اونچی کی اور میرا جائزہ لینے لگا، پھر وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا ''تم کون ہو بالکے؟''

''آپ مجھے نہیں جانتے''۔ میں نے جلدی سے کہا ''مگر یہ منگل مجھے یہاں لایا ہے۔''

''منگل!'' بوڑھے نے حیرت سے دہرایا۔ پھر وہ لالٹین لے کر تیزی سے منگل کی طرف بڑھا۔ لالٹین کی روشنی میں پہلی دفعہ میں نے منگل کا چہرہ دیکھا۔ اس کا رنگ کبھی سرخی مائل گندمی رہا ہو گا۔ اس وقت کورے کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کی سیٹ کے گرد خون کا ایک تالاب سا تھا اور خون بہہ بہہ کر میرے پیروں کی طرف آ رہا تھا۔

''ارے، یہ تو بہت بُری طرح گھائل ہے۔'' بوڑھے نے فکرمندی سے کہا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا ''تم اسے اٹھا کر کٹیا میں لے آؤ۔

''میں خود بھی گھائل ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرے پیروں میں بھی گولیاں لگی ہیں۔ بس کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔''

بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا، پھر کٹیا کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولا۔ ''کانتا بیٹی! ذرا پانی گرم کر لے اور بستر بچھا دے۔'' پھر اس نے لالٹین زمین پر رکھی اور منگل کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے باہر کی طرف کھینچا۔

اچانک میری آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ اس دبلے پتلے بوڑھے نے بھاری بھرکم منگل کو کسی بچے کی طرح ہاتھوں پر اٹھا لیا اور کٹیا کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی چال میں ذرا بھی

Uploaded By Muhammad Nadeem

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

Uploaded By Muhammad Nadeem

لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اب لگ رہا تھا جیسے منگل کا جسم بے وزن ہو گیا ہو یا پھر وہ بوڑھا کوئی مافوق الفطرت چیز تھی۔ وہ منگل کو لے کر کٹیا میں غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر برآمد ہوا، زمین سے لالٹین اٹھائی اور میرے پاس پہنچ کر بولا۔ ''کیا تم بھی گھائل ہو؟''

''میں ابھی گھائل نہیں ہوا ہوں۔ میرے گھاؤ تو پرانے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ لالٹین کی رزدروشنی میں وہ مجھے بہت پراسرار نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پہ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس سے نظریں نہیں ملا پایا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی نظریں میری ہڈیوں میں پیوست ہوتی جا رہی ہوں۔ بوڑھے کی چبھتی ہوئی نظروں سے گھبرا کر میں نے کہا۔ ''کافی دن پہلے مجھے گولی لگی تھے۔ ہسپتال میں میرا علاج ہوا ہے اور میں ٹھیک بھی ہو گیا ہوں۔ بس ابھی کچھ دن اور اپنے پیروں پر نہیں چل سکتا۔''

بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر لالٹین زمین پر رکھی اور منگل کی طرح مجھے بھی بچوں کی طرح اٹھا لیا۔ اس کے استخوانی ہاتھوں میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ مجھے اسی طرح اٹھائے ہوئے کٹیا میں لے گیا۔

کٹیا اندر سے کافی کشادہ تھی۔ اس میں ایک طرف خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پہ کسی جانور کی کھال ڈال کر منگل کا بستر بنایا گیا تھا۔ بوڑھے نے مجھے بھی منگل کے پاس ہی بٹھا دیا۔

وہاں بیٹھ کر مجھے خوش گوار سی حرارت کا احساس ہوا۔ کٹیا کے دوسرے کونے میں کوئی لڑکی انگیٹھی پر دیگچی چڑھائے بیٹھی تھی۔ لڑکی کی پشت میری جانب تھی۔

''پانی گرم ہو گیا کا نتا بیٹی؟'' بوڑھے نے کونے میں رکھے ہوئے ایک بکس سے مرتبان اور چھوٹی بڑی بوتلیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی لائی بابا۔'' کٹیا میں ایک مترنم آواز گونجی۔

اس دوران میں بوڑھے نے ایک پیالے میں پانی لے کر اس میں کئی سفوف حل کیے تھے اور اب وہ پیالہ لے کر منگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سہارا دے کر منگل کو اٹھایا مگر اب وہ ہوش و حواس سے بالکل بیگانہ ہو گیا تھا۔ پھر بوڑھا چمچے سے اپنی تیار کی ہوئی دوا کے قطرے منگل کے حلق میں ٹپکانے لگا۔ چند قطرے پیتے ہی منگل کی حالت سنبھلنے لگی اور اس نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ویران نظروں سے بوڑھے کو دیکھا۔ پھر کچھ کہنا چاہا مگر بوڑھے نے اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا ''پہلے یہ پی لو پھر کچھ بولنا۔'' بوڑھے نے منگل کو سہارا دے کر ایک مرتبہ پھر اٹھایا اور پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

منگل نے وہ مشروب ایک ہی سانس میں پی لیا۔ پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند ہی منٹوں میں منگل کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی، چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی اچانک غائب ہو گئی اور وہ پھر پہلے کی طرح تروتازہ دکھائی دینے لگا۔ اب مجھے سمجھ آئی۔ دراصل یہ وہ سنیاسی ہے جس کے قصے ہمارے بزرگ سنایا کرتے تھے۔

اسی وقت وہ لڑکی پانی کی دیگچی لے کر وہاں آ گئی۔ اس کا حسن دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایسا مکمل حسن میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بانو بھی انتہائی خوبصورت تھی مگر اس لڑکے کے سامنے اس کا حسن بھی ماند پڑ جاتا۔ وہ لڑکی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کے گھنے سیاہ ریشمی بال کمر سے نیچے تک تھے۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی ہر بات سے بے نیاز گرم پانی کی دیگچی وہاں رکھ کر کٹیا سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی جیسے میں ہوش میں آ گیا۔

بوڑھے نے منگل کو میلی سی ایک چادر دی اور اس سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ منگل نے چادر لپیٹ کر کپڑے اتار دیئے۔ اس کا پاجامہ خون میں ڈوبا ہوا تھا مگر خون اب رک چکا تھا۔ بوڑھا دوسرے کونے میں جلتی ہوئی انگیٹھی اٹھا لایا اور نہ جانے کہاں سے چوڑے پھل کا ایک خنجر نکال کر انگیٹھی پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد خنجر کا پھل آگ میں تپ کر سرخ ہو گیا۔ اس دوران میں بوڑھا گرم پانی سے منگل کے زخم کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے منگل کے زخم پر کوئی سفوف چھڑکا تو تکلیف کی شدت سے وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ نہ جانے وہ کیسا سفوف تھا۔ اس کے بعد بوڑھے نے تپتا ہوا خنجر انگیٹھی سے نکالا تو منگل نے دانتوں میں اپنا رومال پکڑ لیا۔ بوڑھے نے اچانک ہی تپتے ہوئے خنجر کی نوک منگل کے زخم میں گھسا دی۔ منگل بُری طرح تڑپا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے بوڑھے نے جھٹکے سے گولی ران سے باہر نکال لی۔ تکلیف کی شدت سے منگل دہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر کوئی سفوف زخم پر چھڑکا۔ منگل نے طویل سانس لیا اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک اسے سکون مل گیا ہو۔ پھر وہ بتدریج پُرسکون ہوتا گیا۔ بوڑھے نے چند منٹ انتظار کیا، پھر ایک ڈبے میں سے مرہم کی طرح کوئی چیز نکالی اور منگل کے زخم پر اس کا لیپ کر دیا۔

اس سے فارغ ہو کر بوڑھا میری طرف متوجہ ہوا۔ ''تم بتاؤ بالک شریر پر گھاؤ کہاں ہے؟''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بوڑھے نے ایک ایک کر کے میرے زخموں کا جائزہ لیا، پھر پُرخیال انداز میں بولا۔

''تمہارے گھاؤ تو بہت کاری ہیں مگر تم چنتا مت کرو۔ یہ گھاؤ تین دن کے اندر اندر ٹھیک ہو جائیں گے''۔ پھر اس نے گھوم کر کٹیا میں ادھر اُدھر دیکھا اور بڑبڑایا۔ ''یہ کانتا کہاں گئی؟ کانتا بیٹی!'' اس نے بلند آواز میں اسے پکارا۔

''فوراً ہی کانتا لالٹین اٹھائے ہوئے کٹیا میں داخل ہوئی۔ وہ جونہی اندر آئی، مجھے ایسا لگا جیسے پوری کٹیا جگمگا اٹھی ہو''۔

''بیٹی ذرا مجھے وہ بڑا ڈبہ اٹھا کر دینا''۔ اس نے کٹیا کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ کانتا نے کوئی جواب دیئے بغیر لالٹین ایک کونے میں رکھی اور ڈبہ اٹھا لائی۔

بوڑھے نے ایک بوتل میں سے کوئی محلول نکالا اور اس میں صاف ستھرا کپڑا ڈبو کر میرے زخم صاف کرنے لگا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میرے زخموں پر تیزاب چھڑک دیا گیا ہو۔ میں نے دانت پر دانت جما کے بہت مشکل سے اپنی چیخ کو ضبط کیا۔ اس کوشش میں سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں نہا گیا۔

بوڑھے نے دو تین منٹ تک توقف کیا پھر اس نے ڈبے سے ایک مرہم نکالا اور میرے زخموں پر اس کا لیپ کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے زخموں میں اچانک ٹھنڈک پڑ گئی ہو جیسے کسی نے میرا سارا درد چوس لیا ہو۔ پھر بوڑھے نے بڑے سے تانبے کے ایک گلاس میں مختلف بوتلوں میں سے چند قطرے نکالے اور اس میں پانی ملا کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ''اسے ایک سانس میں پی جاؤ۔ ابھی تمہاری ساری تھکن اتر جائے گی''۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور وہ بدمزہ اور کڑوا مشروب ایک سانس میں پی گیا۔ وہ دوا نما مشروب پیتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے حیرت انگیز طور پر میری کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو رہی ہو، تھکن بھی تیزی سے اتر گئی۔ اب میں پھر خود کو پہلے کی طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔

''تم لوگ بھوکے بھی ہو گے''۔ اچانک بوڑھے کی آواز آئی۔ ''میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں''۔ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''کانتا بیٹی! کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ''۔

''بھاجی اور چٹنی تو ہے بابا''۔ کانتا کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ ''روٹیاں ابھی ڈال دیتی ہوں''۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ زحمت نہ کرے مگر میرے پیٹ میں تو مارے بھوک کے چوہے دوڑ

رہے تھے۔ اسی لئے میں خاموش رہا۔ میں نے منگل کی طرف دیکھا مگر وہ لمبی تان کر سو رہا تھا۔ وہ بیچارہ بھی زخموں سے نڈھال ہو گیا تھا اس ذہنی کشیدگی اور پیدل چلنے کی تھکن الگ تھی۔

تھوڑی دیر بعد کانتا ایک تھالی میں چھوٹی چھوٹی کچھ ٹکیاں، آلو کی بھجیا اور لہسن کی چٹنی لے آئی۔ میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے کہ آخر یہ بوڑھا کون ہے؟ اس جنگل میں کیوں پڑا ہوا ہے؟

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ بوڑھے نے کہا ''پہلے بھوجن کر لو، باقی باتیں بعد میں''۔

ایسا لگتا تھا جیسے بوڑھا میرے خیالات پڑھ رہا ہو۔ میں خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یا تو وہ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا یا پھر مجھے بھوک میں لگ رہا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، میں نے چند منٹ میں سب کچھ چٹ کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو کٹیا میں ملگجا سا اجالا تھا۔ میں نے گھوم کر منگل کی طرف دیکھا، وہ دیوار سے ٹیک لگائے کچھ کھانے میں مصروف تھا۔ اس وقت کٹیا میں نہ کانتا تھی نہ وہ پُراسرار بوڑھا۔

''تم تو خوب سوئے''۔ منگل نے ہنس کر کہا۔ ''جانتے ہو اس وقت کیا بجا ہے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں''۔

''یار، ساری رات بھاگ دوڑ اور ذہنی عذاب میں گزری تھی۔ اتنا سونا تو میرا حق تھا۔''

پھر میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''تمہارے زخم کا کیا حال ہے؟''

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں، ہاں وہ گھاؤ بھرنے میں کچھ دن لگ جائیں گے، تمہاری تکلیف کیسی ہے؟ سنا ہے بابا نے تمہیں کوئی دوا بھی پلائی تھی۔''

''کانتا بتا رہی تھی کہ جو دوا بابا نے تمہیں پلائی ہے، وہ انہوں نے برسوں کی محنت کے بعد تیار کی ہے''۔

''مگر یار، اس دوا میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کا اندازہ بھی تمہیں ہو جائے گا۔''

میرے پیروں میں اب رتی برابر تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے آزمائش کی خاطر اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی ہی تھی کہ بوڑھا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''اتنی جلدی مت کرو کم سے کم تین دن تک آرام کرو۔''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں دوبارہ گھاس پھوس کے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کانتا بھی کٹیا میں آ گئی۔ اس کے بال گیلے تھے اور ان سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ وہ رات کے مقابلے میں زیادہ نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ اس سے نظریں چار ہوتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بھی بے ساختہ مسکرانے لگی پھر گردن جھٹک کر کٹیا سے باہر نکل گئی۔ میں نے اب غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کٹیا کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ وہ تھا جس میں ہم لوگ تھے، دوسرا حصہ پیچھے کی جانب تھا۔ بیچ میں گھاس پھوس اور سرکنڈوں کی دیوار تھی۔ دوسرے حصے میں جانے کے لئے کونے میں چھوٹا سا راستہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد کانتا ہمارے لئے تھالیوں میں کھانا لے آئی۔ آج بھی کھانے میں ساگ کی بھجیا، روٹی اور چٹنی تھی۔ میں نے اور منگل نے کھانا خوب مزے لے لے کر کھایا۔

''یار مجھے ایک بات بتاؤ! یہ بوڑھا آخر ہے کون اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' منگل ہنس کر بولا۔

میں بھی خاموش ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ سوال براہ راست اس بوڑھے یا اس کی بیٹی کانتا سے کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا کٹیا میں داخل ہوا۔ اس نے رات کی طرح اس وقت بھی تانبے کے لمبے سے بدوضع گلاس میں وہی مشروب تیار کیا اور مجھے دے دیا۔

میں نے انکار کرنا چاہا مگر بوڑھے کا خلوص دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور میں وہ بدمزہ مشروب ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ وہ مشروب پی کر مجھے ایسا لگا جیسے میری طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس مشروب میں خاص بات یہ تھی کہ اسے پینے کے تھوڑی دیر بعد نیند کے جھونکے آنے لگتے تھے۔ کل رات بھی یہی ہوا تھا۔ کھانا کھاتے ہی میں بے سدھ ہو گیا تھا۔ آج بھی اسے پیتے ہی میں گہری نیند سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو کٹیا میں تاریکی تھی مگر چڑیوں کی چہچہاہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح ہو چکی ہے۔ منگل گہری نیند سو رہا تھا۔ ہم دونوں کے علاوہ اس وقت کٹیا میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ شاید کانتا اور بوڑھا کٹیا کے دوسرے حصے میں ہوں۔

یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ میرے پیروں میں اب بالکل تکلیف نہیں تھی۔ میں نے سوچا اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں مگر مجھے بوڑھے کی ہدایت یاد آ گئیں۔ مجھے کم از کم تین دن تک آرام کرنا تھا۔ آج تو دوسرا ہی دن شروع ہوا تھا۔

اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ مجھے وہاں نہ پا کر وہ بیچاری کتنی پریشان ہوئی ہو گی۔ پھر مجھے

ان لوگوں کا خیال آیا جنہوں نے مجھے اور بانو کو اغوا کیا تھا۔ نہ جانے وہ لوگ کون تھے اور مجھ سے کس مائیکرو فلم کا پتہ پوچھ رہے تھے؟ پھر درمیان میں منگل اور رانا ٹپک پڑے۔ اوپر سے ان کے دشمن بھی آ گئے۔ مجھے منگل کے ساتھیوں پر بھی حیرت تھی۔ انہوں نے مڑ کر اس کی خبر بھی نہ لی تھی۔ ان لوگوں کو بھی یقیناً اس بوڑھے کی کٹیا کا علم ہو گا اور وہ لوگ اس بوڑھے کو بھی جانتے ہوں گے۔ پھر ابھی تک ان میں سے کوئی بھی یہاں تک کیوں نہیں آیا تھا؟ کیا منگل اور رانا ان کے لئے اتنے ہی غیر اہم تھے؟ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

کٹیا میں آہٹ ہوئی تو میں نے سر گھما کر دیکھا۔ بوڑھا کٹیا میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں یہاں پڑے پڑے بیزار ہو گیا ہوں۔ مجھے کچھ دیر کے لئے باہر ہی لے چلو۔''

بوڑھا میرے قریب آیا، سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا، پھر بولا۔ ''جیون بھر میں پہلی دفعہ میرا اندازہ غلط ہوا ہے میرا خیال تھا کہ تمہیں ٹھیک ہونے میں کم سے کم تین دن لگیں گے مگر تم تو ایک ہی دن میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔ چلو آؤ میرے ساتھ!''

بوڑھے نے یہ کہا تو میں پھرتی سے اٹھ بیٹھا۔ میں ڈرتے ڈرتے پیر زمین پر رکھے اور اپنے جسم کا بوجھ آہستہ آہستہ ان پر ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اپنے پیروں پہ چل کے اس وقت مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کٹیا سے باہر کا منظر بہت سہانا تھا۔ جنگل میں دور دور تک چڑیوں کی چہکار سنائی دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں مگر حیرت انگیز طور پر مجھے سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے دو چار گہرے گہرے سانس لئے اور بوڑھے سے کہا ''میں جوگنگ کرنا چاہتا ہوں''

بوڑھے نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے جلدی سے کہا ''میرا مطلب ہے میں دوڑنا چاہتا ہوں''۔

''دھیرج سے کام لو بالک!'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی تم دوڑنے کے قابل نہیں ہو''۔

میں خاموشی سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اس سے پوچھا: ''بابا! اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟''

اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے علم ہو کہ میں کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔

''تم کون ہو بابا اور اس ویرانے میں کیوں پڑے ہوئے ہو؟''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نے اس سے وہ سوال کرلیا جو گزشتہ دو دن سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

بوڑھے کے چہرے پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ پُر خیال انداز میں بولا "میں بھی ڈاکو تھا اگر برس گزرے میں نے پاپ کے کام چھوڑ دیئے"۔

"مگر اس کے لئے اس جنگل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بوڑھا میری باتیں سن کر پھر مسکرایا اور بولا "میں نے برسوں اسی طرح کے لوگوں پر سرداری کی ہے۔ مجھ سے زیادہ انہیں کون سمجھتا ہوگا۔ میرے اس ٹھکانے کو صرف چار آدمی جانتے ہیں۔ جگو، رانا، منگل اور موتی یہ چاروں آدمی ایسے ہیں کہ اپنی جان دے دیں گے مگر مجھ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ پانچویں آدمی تم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے راز کو راز ہی رکھو گے۔"

"میں نے بھانت بھانت کا آدمی دیکھا ہے میں بس شکل دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کون کیسا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو تم شاید اب تک زندہ بھی نہ ہوتے۔"

"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ سارا دن اس جنگل میں کیا کرتے رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں یوگا میں مہارت رکھتا ہوں، پانی میں دو دو گھنٹے تک غوطہ لگاتا ہوں۔ جڑی بوٹیاں ڈھونڈ کر ان سے دوائیں بناتا ہوں، نشانہ تو میرا پہلے بھی بہت اچھا تھا، اب اور بھی اچھا ہو گیا ہے۔ اڑتے ہوئے پرندے کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔ خالی ہاتھ کم سے کم دس آدمیوں سے لڑ سکتا ہوں۔"

اس کی بات سن کی مجھے بے اختیار ہنسی آئی مگر میں ضبط کر گیا۔ وہ دھان پان سا بوڑھا نہ جانے کس خیالی دنیا میں رہ رہا تھا۔ اگر میں پوری قوت سے اس کے ایک ہاتھ رسید کر دیتا تو وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہتا۔

"تمہارا یہ وچار ٹھیک نہیں ہے بالک۔" بوڑھے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم یہی سمجھ رہے ہو نا کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔ ایک ہاتھ پڑ جائے تو دوبارہ اٹھنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

میں بُری طرح چونک اٹھا۔ تو کیا وہ بوڑھا سوچ پڑھنے پر بھی قادر تھا۔ اس دوران میں پہلی دفعہ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ اس نے مجھے اور منگل کو کس آسانی سے اٹھا لیا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور خجالت آمیز لہجے میں بولا "مجھے معاف کر دو بابا! میں بہت....."

"بس بس....." بوڑھے نے مسکرا کر میری بات کاٹ دی۔ میرے آگے ہاتھ مت جوڑ۔ تو

سچا اور کھرا آدمی ہے۔ میں تجھے پسند کرنے لگا ہوں اور جو شکتی بھی میرے پاس ہے وہ میں تجھے دے دوں گا۔ کیا تو اس جنگل میں میرے ساتھ ٹھہرے گا؟

"میں تو خود بھی یہی چاہ رہا تھا بابا"۔ میں نے جلدی سے کہا "مگر مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔ میری بپتی میری وجہ سے بہت پریشان ہوگی۔ میرا دوست بھی مجھے دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو ان کا کیا بنے گا؟"

میں نے ابھی اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صحت یاب ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا، منگل کو بھی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ پھر بوڑھا کافی دیر تک مجھے یوگا کی ابتدائی مشقیں سکھاتا رہا جو زندگی میں میرے بہت کام آئیں۔ واقعی وہ عجیب و غریب انسان تھا۔

جب سورج نکل آیا تو ہم کٹیا کی طرف چل دیئے۔ چلتے چلتے بوڑھے نے کہا "میں تجھے ایسی شکتی دوں گا کہ تو ہمیشہ مجھے یاد رکھے گا مگر بیٹا! اس شکتی کو ہمیشہ ظالم پہ استعمال کرنا"۔

مجھے منگل کی جیپ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اس سے جیپ کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ جیپ میں نے درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دی ہے۔

منگل ابھی تک لمبی تانے سو رہا تھا۔ کانتا البتہ بیدار ہو گئی تھی اور گرما گرم پوریاں تل رہی تھی۔ اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ میں جان چکا تھا کہ کھانے پینے کا تمام سامان جگو نے یہاں پہنچایا ہے۔

"پوری کھاؤ گے؟" کانتا پہلی دفعہ مجھ سے مخاطب ہوئی، اس کے چہرے پر بہت دلکش مسکراہٹ تھی۔

"تمہارے ہاتھ سے تو آدھی بھی مل جائے تو غنیمت ہے"۔ میں نے دل ہی دل میں کہا پھر مسکرا کر بولا "یہاں تو جو کچھ تم کھلاؤ گی کھانا پڑے گا"۔

"ارے کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔ میں نے آج حلوہ بھی بنایا ہے۔"

"تو پھر جلدی سے لاؤ"۔ منگل چہک کر بولا۔ وہ نہ جانے کس وقت اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"میری تو آنکھ ہی پوریوں کی خوشبو سے کھلی ہے میں سمجھا سپنے میں پوریاں دیکھ رہا ہوں مگر یہاں تو سچ مچ پوریاں تلی جا رہی ہیں"۔ پھر وہ اچانک اچھل پڑا اور بولا "ارے رام سنگھ! تم اپنے..... پیروں پر چل رہے ہو۔ تم ٹھیک ہو گئے؟"

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''ہاں منگل'' میں نے ہنس کر کہا ''بابا کی دوا میں واقعی جادو ہے۔ ایک آدھ دن میں تمہارا زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا''۔

کانتا نے چونک کے بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ اس دن ناشتے میں کانتا بھی ہمارے ساتھ شریک تھی۔ اس کی جھجک ختم ہو گئی تھی اور وہ بات بے بات قہقہے لگا رہی تھی۔ کانتا کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ منگل ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے ہونٹوں میں دبا لیا تھا مگر اسے لگائے بغیر جیب میں ڈال لیا۔ بوڑھا بھی کسی چیتے کی طرح چوکنا نظر آ رہا تھا۔ ان سے مدھم لہجے میں کانتا سے کہا ''کانتا بیٹی! تو درختوں کے اس جھنڈ میں جا کر مچان پر چڑھ جا۔ وہاں رائفل بھی موجود ہے۔ خطرہ دکھائی دے تو فائر کر دینا''۔

''مگر خطرہ کہاں ہے بابا؟'' کانتا جھلا کر بولی۔

''خطرہ ہے''۔ بوڑھا غرا کر بولا۔ ''کوئی گاڑی اسی طرف آ رہی ہے''۔

''یہ جگو یا نادر چاچا ہو گا بابا!'' کانتا نے کہا۔

''جگو یا نادر ہمیشہ گھوڑے پر آتے ہیں۔ جگو کی جیپ یہیں موجود ہے۔ تو جا بیٹی، مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے''۔

کانتا بڑبڑاتی ہوئی کٹیا سے باہر نکل گئی۔ کسی گاڑی کی آواز میں نے بھی سنی تھی مگر کانتا کی طرح میں بھی یہی سمجھا تھا کہ آنے والا جگو یا اس کا کوئی ساتھی ہو گا۔ میں نے منگل سے کہا۔ میں تمہیں بھی کانتا کے ساتھ اسی مچان پر بٹھا دیتا ہوں۔ وہاں رہ کر تم ہمارے زیادہ کام آ سکو گے۔

''نہیں!'' بوڑھے نے مجھے ٹوک دیا ''ابھی تمہیں بوجھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ آج ہی تو تم اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے ہو، میں منگل کو مچان تک پہنچا کر آتا ہوں''۔

وہ پھرتی سے کٹیا کے پچھلے حصے میں چلا گیا، واپس آیا تو اس کے شانوں سے دو رائفلیں جھول رہی تھیں، ایک رائفل اس کے ہاتھ میں بھی تھی۔ رائفلوں کے ساتھ ہی ایک تھیلے میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھے نے اس میں سے کچھ گولیاں ایک کپڑے میں باندھیں اور رائفل کے ساتھ وہ کپڑا بھی منگل کو دے دیا۔ پھر اس نے منگل کو بچوں کی طرح اٹھا لیا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔ ایک رائفل اس نے میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے کینوس کے تھیلے میں سے بہت سی گولیاں نکال کر ایک کپڑے میں باندھیں اور رائفل شانے سے لٹکا کر تیار ہو گیا۔ جیپ کے انجن کی آواز اب بہت واضح ہو گئی تھی۔ میں کٹیا سے نکلنے ہی والا تھا کہ بوڑھا لوٹ آیا۔ میں نے ایک

رائفل اپنے شانے سے لٹکائی، کینوس کا تھیلا دوسرے شانے پر لٹکایا اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پھر ہم بہت پھرتی کے ساتھ ایک گھنے درخت پر چڑھ گئے۔

''اگر وہ دشمن ہوئے تو میں ان کے سامنے چلا جاؤں گا تاکہ انہیں شک نہ ہو، تم اگر گڑبڑ دیکھو تو فائر کر دینا''۔

''مگر بابا، تمہارے سامنے جانا کیا ضروری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آنے والے تو کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے دشمن ہوں منگل کے دشمن ہوں یا پھر کانتا کے دشمن ہوں جو کتوں کی طرح کانتا کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں سامنے نہ ہوا تو وہ کٹیا کی تلاشی لیں گے۔ اس کے بعد تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ کانتا یا تم دونوں یہیں کہیں موجود ہو۔'' یہ کہہ کر بوڑھا پھرتی سے نیچے اتر گیا۔

میں نے گھنے پتوں میں سے دیکھا، وہ پرانے ماڈل کی فیئٹ 1100 تھی۔ گاڑی رکنے سے پہلے ہی بوڑھا چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا کٹیا میں چلا گیا۔

گاڑی میں ڈرائیور سمیت پانچ آدمی تھے وہ چہروں سے اچھے آدمی نہیں لگ رہے تھے۔ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ مجھے وہاں سے کٹیا کا دروازہ اور وہ جگہ صاف نظر آ رہی تھی جہاں فیئٹ رکی تھی۔ فیئٹ سے اترنے والے چند لمحوں تک سن گن لیتے رہے پھر ان میں سے ایک چیخ کر بولا ''کوئی ہے؟ اس کٹیا میں کوئی ہے؟''

اس کی آواز پر بوڑھا بدحواس ہو کے باہر نکلا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی بدحواسی محض اداکاری ہے تاکہ آنے والے اس پر ترس کھا کر چلے جائیں۔ بوڑھے نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی سرکار! حکم کریں کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟''

''یہاں تمہارے علاوہ اور کون رہتا ہے؟'' اسی آدمی نے سوال کیا۔ اس کا جسم دوہرا، قد لمبا اور ہاتھ پاؤں بہت بڑے بڑے تھے۔ اس کا ایک کان شاید کسی لڑائی جھگڑے میں ٹوٹ گیا تھا۔

''اس جنگل میں اور کون رہ سکتا ہے سرکار!'' بوڑھے نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ آپ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ سرکار؟

''ہم اس کٹیا کی تلاشی لیں گے'' ٹوٹے کان والے نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کے دوسرے چاروں ساتھی بھی آگے بڑھ آئے۔ وہ سب شکلوں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ ان کے ارادے بھی نیک نہیں تھے۔ میں نے سوچا فائر کر کے ان سب کو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ڈھیر کردوں مگر اس وقت ایسا کرنا خطرناک تھا۔ کان ٹوٹے کے ہاتھ میں بھی مجھے ریوالور نظر آ رہا تھا۔ میں فائر کرتا تو مرتے مرتے بھی اپنے ریوالور سے فائر کر کے بوڑھے کی جان لے لیتا۔ میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی مگر ریوالور دیکھ کر میں مجبور ہو گیا تھا۔

''مجھ غریب کی کٹیا میں آپ کو کیا ملے گا سرکار؟'' بوڑھے نے جلدی سے کہا۔ میں اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا۔ آنے والوں میں سے ایک جھک کر جیپ کی پہیوں کے نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے نشانات کی طرف متوجہ دیکھ کر بوڑھے نے پینترا بدلا تھا کیونکہ وہ یقینی طور پر دوسرا سوال اس گاڑی کے بارے میں کرتے جس کے پہیوں کے نشانات انہیں نظر آ رہے تھے۔

رات ایک گاڑی میں یہاں ایک ڈاکو آیا تھا۔ وہ بری طرح گھائل بھی تھا۔ اس نے پستول کے زور پر مجھ سے کھانے کو مانگا اور زخموں کی مرہم پٹی کرانے کے بعد چلا گیا۔ بوڑھے نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''اس کا حلیہ بتاؤ۔'' ٹوٹے کان والا چیخ کر بولا۔ بوڑھے نے اطمینان سے منگل کا حلیہ بتا

''پھر ہم اس کٹیا کی تلاشی ضرور لیں گے۔''

''کٹیا کی تلاشی نہیں دوں گا!'' بوڑھے کا لہجہ بدل گیا۔

''ٹوٹے کان والے نے بوڑھے کو دھکا دینے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بوڑھا پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کن ٹوٹا پھر آگے بڑھا اور بوڑھے کی گردن دبوچنا چاہی مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ ٹوٹے کان والا اگویا ہوا میں اڑتا ہوا دور جا گرا۔''

اس کے دوسرے ساتھی بوڑھے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کا بایاں شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے پھرتی سے دوسرے آدمی کا نشانہ لیا مگر وہ سب چشم زدن میں زمین پر لیٹ کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ ٹوٹے کان والا مجھے ایک مرتبہ پھر نظر آیا مگر اب بوڑھے کی بجائے اس کا رخ میری طرف تھا۔ شاید اس نے فائر سے میری موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ اٹھایا اور فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں اس سے بچنے کے لئے اپنی جگہ سے ہٹا۔ پھر دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ میرا پیر بری طرح پھسلا، خود کو سنبھالنے کے لئے میں نے درخت کی ایک شاخ پکڑنا چاہی۔ اس کوشش میں رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں درخت کی اسی لچک دار شاخ میں جھول گیا۔ کن ٹوٹے کی طرف سے

ابھی تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ میں نے ذرا سنبھل کر گردن گھما کر اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بوڑھا اسے دبوچے ہوئے تھا اور وہ کسی بچے کی طرح بوڑھے سے مار کھا رہا تھا۔ مجھے اس کے دوسرے ساتھیوں کا بھی خطرہ تھا اس وقت میری پوزیشن بہت نازک تھی۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے بہت آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ انہیں ریوالور یا رائفل تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میری لوڈڈ رائفل بھی نیچے پڑی ہوئی تھی۔ دوسری رائفل اوپر ایک شاخ میں اٹکی رہ گئی تھی۔

میں نے اپنے جسم کو تولا اور ایک جھکولا دے کر پیروں سے اس کو پکڑ لیا۔ پھر دوسری شاخ پکڑی اور آہستہ آہستہ میں نیچے اتر آیا۔ اس تمام کارروائی میں مجھے مشکل سے ایک منٹ لگا ہو گا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس حالت میں صدیاں گزر گئی ہوں۔ منگل اور کانا نہ جانے وہاں سے کتنی دور تھے انہیں یہاں کا منظر دکھائی بھی دے رہا تھا یا نہیں؟ اس وقت یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے درخت سے اتر کر رائفل اٹھانا چاہی مگر کوئی وزنی چیز میرے سر پہ لگی۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سر جھٹک کر اس چوٹ سے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اس وقت ایسا لگا جیسے آس پاس کا کوئی درخت اکھڑ کر مجھ پر آ گرا ہو۔ وہ کوئی آدمی تھا جس نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ مجھے لئے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے حملہ آور کو دیکھا۔ وہ مجھ سے دگنے وزن اور جسامت کا آدمی تھا۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف تھا اور ہاتھ پیروں پر جھاڑ جھنکار کی طرح بال تھے۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ مجھ سے کیکڑے کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح میری گردن دبوچ لے مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس کی کوشش میں تھا کہ میرے پیروں پر کم سے کم بوجھ پڑے ورنہ اب تک میں اپنے پیروں سے اچھل کر دور پھینک چکا ہوتا۔

ایک موقع پر اس کے کان میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں نے اس کے دونوں کان پوری قوت سے پکڑ لئے اور انہیں کھینچنے لگا۔ اس کے حلق سے جانوروں جیسی غراہٹ برآمد ہوئی اور وہ بلبلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے ان کا کان مضبوطی سے پیچھے کی طرف کھینچا اور دایاں کان اچانک چھوڑ کے اس کی پیشانی پر زبردست پنچ رسید کر دیا۔ اس کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ میرا دوسرا گھونسا بھی اسی جگہ پڑا تو اس نے ہاتھ پیر ڈال دیئے۔ میں نے اس کے بھاری بھرکم وجود کو ایک طرف لڑھکا دیا۔ اس سے زور آزمائی میں مجھے مشکل سے دو

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

منٹ لگے ہوں گے۔ پھر اٹھنے کی بجائے میں تیزی سے ایک درخت کے پیچھے رینگ گیا۔ میں محفوظ جگہ پہنچ کر اٹھا تو مجھے بوڑھا یوگی دکھائی دیا۔ وہ بھی ایک آدمی سے نبرد آزما تھا۔ میں نے دوسرے لوگوں کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا مگر مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ وہ سب درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے بوڑھا اپنے حریف سے مغلوب ہو رہا ہو۔ ایسا ممکن تو نہیں تھا کیونکہ بوڑھے کی جسمانی قوت اور پھرتی سے واقف تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بُری طرح زخمی ہے کیونکہ اس کی دائیں آستین خون میں تر تھی اور اب بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ پھر اس کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ بوڑھے کے حریف کے ہاتھ میں چوڑے پھل کا خنجر تھا اور وہ بہت مہارت سے بوڑھے پر وار کر رہا تھا۔ بوڑھے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک چھلنی ہو چکا ہوتا۔

خنجر بردار کے حملوں میں اچانک شدت آ گئی۔ بوڑھا اب دفاعی جنگ لڑ رہا تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے حریف کا خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو جائے گا۔

O

نیا باب

یہ صورت حال دیکھ کر میں تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر سامنے آ گیا۔ سامنے آتے ہی دیگر لوگوں کے میدان میں نہ آنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ ان میں سے تین زمین پر آڑے ترچھے پڑے تھے، چوتھا میرے ہاتھوں مار کھا کر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے رائفل کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر رائفل فوری طور پر مجھے نظر نہ آئی۔ یوں بھی فائر کرنے میں رسک ہی تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی بوڑھے کو بھی لگ سکتی تھی۔ وہ موقع زیادہ سوچنے کا نہیں تھا۔

میں اچانک حملہ آور کے سر پہ جا پہنچا۔ شاید میری پرچھائیں پر اس کی نظر پڑ گئی تھی۔ وہ بھڑک کے پلٹا اور خنجر تان کر میری طرف بڑھا۔ اس کے ہلتے ہی میں نے بوڑھے یوگی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ وہ اب تک شاید اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر مدافعت کر رہا تھا۔ خنجر بردار کے جسم میں گویا پارہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھ پر تابڑ توڑ چھ سات وار کئے جو میں پھرتی سے بچتا گیا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس کا خنجر والا ہاتھ میری گرفت میں آ جائے مگر وہ تو بجلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ان روایتی بنوٹ بازوں کا خیال آیا جو رائفل یا ریوالور سے چلنے والی گولی کو بھی اپنی لاٹھی سے روکنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس وقت بھی اگر میں اپنے پیروں پر چل بھی سکوں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خنجر بردار کے حملوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے انداز میں بھی جھلاہٹ تھی۔ وہ شاید اتنے طویل مقابلے کا عادی نہیں تھا۔ تقریباً دس منٹ تک مجھ پر پے در پے حملے کرنے کے باوجود وہ میرے جسم پر خراش تک لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

بالآخر مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں نے اس کے منہ پر کک رسید کی اور ایڑی کے بل گھوم کر دوسرے پیر سے اسی جگہ بیک کک رسید کر دی۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ حالانکہ میری یہ کک ایسی تھی کہ مقابل اپنے پیروں پر کھڑا رہنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ اس کے حملوں کی شدت ٹوٹی تو میں نے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

جھپٹ کر اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ چلایا جسے میں نے دوسرے ہاتھ سے جکڑ لیا۔ پھر ہم دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ میرا حریف بلاشبہ نہ صرف پھرتیلا تھا بلکہ غیر معمولی قوت کا مالک بھی تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس کی کلائی کا جوڑ علیحدہ کر دوں مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں میں انسانی کلائیوں کی بجائے اسٹیل کے ہاتھ ہوں۔ میں نے تنگ آ کر گھٹنے سے اس کے پیٹ پر زبردست وار کیا مگر اس پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ اب مجھ پہ بھی جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں جلد از جلد اس کھیل کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس آہنی انسان نے میری خود اعتمادی کو پاش پاش کر دیا تھا۔ میں اپنی گرفت کو آہنی شکنجے سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا مگر شاید اللہ کو میرا یہ غرور پسند نہ آیا تھا۔

مجھ پر بھی جنون سوار ہو گیا میں نے فیصلہ کر لیا کہ یا تو اس خبیث کو ٹھکانے لگاؤں گا یا خود مر جاؤں گا اس کی خنجر والی دائیں کلائی میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ کیا اس کی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ اب تک مجھے بچہ سمجھ کر کھلا رہا ہو کیوں کہ اب اس نے میرا دایاں ہاتھ مروڑنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ کندھے سے علیحدہ ہو جائے گا۔ میں نے اچانک اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کی ناک پر بھرپور ٹکر ماری۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا گیا۔ ٹکر مارنے سے دماغ تو میرا بھی جھنجھنا گیا تھا مگر اس کی پرواہ کیے بغیر میں نے پے در پے اس کی ناک پر مسلسل تین ٹکریں ماریں۔

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ سر جھٹکنے لگا۔ میں نے جھٹکا دے کر خنجر اس کے ہاتھ سے نکال دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی پیشانی پر اتنا زوردار پنچ مارا کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ میرا یہ پنچ کسی عام آدمی کے پڑا ہوتا تو اس کی کھوپڑی چیتھڑے چیتھڑے ہو گئی ہوتی مگر اس کے جسم میں شاید کوئی بدروح حلول کر گئی تھی کہ وہ ایک مرتبہ، پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر میری بھرپور اسٹیٹ کک نے اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اچانک میری نظر اس خنجر پر پڑی جو حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہی خنجر اٹھا لیا اور دشمن کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ ویسے اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے خنجر سے وار کرنے کی بجائے پھل کی طرف سے پکڑ کر پوری قوت سے اس کی طرف پھینک دیا۔ خنجر اس کے سینے کے بالکل وسط میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ اس نے پہلے بے یقینی

سے مجھے دیکھا، پھر سینے میں پیوست خنجر کو دیکھا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

میں نے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا، پھر محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا کہ مبادا ان کا کوئی اور ساتھی وہاں چھپا ہو مگر لگتا تھا اب وہاں کوئی نہیں بچا تھا۔ پھر میں بوڑھے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ ''تم..... جلدی سے..... کانتا کو بلا لو۔''

میں اندازے سے ادھر دوڑ گیا جدھر کانتا گئی تھی۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کانتا کس درخت پر ہے۔ میں نے زور سے اسے پکارا۔ ''کانتا جلدی نیچے آؤ، بابا زخمی ہو گئے ہیں۔''

دوسرے ہی لمحے ایک درخت کے پتوں میں سرسراہٹ سی ہوئی اور کانتا پھرتی سے نیچے اتر آئی اس نے تشویش سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بابا کو؟''

''وہ شدید زخمی ہو گئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔''

''مجھے بھی لے چلو!'' اوپر سے منگل کی آواز آئی۔

''تم ابھی وہیں رہو''۔ میں نے کہا ''میں ابھی آتا ہوں''۔

پھر میں اور کانتا دوڑتے ہوئے کٹیا تک پہنچے۔ اگر ہمیں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ گنجا، بابا کا کام تمام کر دیتا جو سب سے پہلے مجھ سے الجھا تھا۔ اس نے اپنے مردہ ساتھی کے سینے میں پیوست خنجر نکال لیا تھا اور وہی خنجر لئے ہوئے بابا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابا پر نیم غنودگی سی طاری تھی اور وہ اس سے بے خبر تھے کہ موت دبے پاؤں ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا۔ میں جب تک اس کے نزدیک پہنچتا وہ بابا کا کام تمام کر چکا ہوتا۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے کسی بڑے سے پتھر کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر مجھے پتھر اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کانتا نے نہ جانے کہاں سے باریک پھل کا تیز دھار خنجر نکالا اور گنجے کا نشانہ لے کر پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ خنجر سنسناتا ہوا گیا اور گنجے کی گدی میں پیوست ہو کر آر پار ہو گیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے اور حلق سے خراخراہٹ سی خارج ہوئی، پھر وہ سلوموشن میں گرنے لگا۔

میں اور کانتا بھاگ کر بابا کے پاس پہنچے۔ اس کی سانس مزید اکھڑ گئی تھی۔ کانتا نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ ''بابا آنکھیں کھولو بابا!''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اس نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں، پھر اٹک اٹک کر بولا۔ ''مجھے...... دو...... سفوف پانی میں...... ملا کر پلا دو...... جو چھوٹی سی...... ایک شیشی...... میں ہے۔''

میں نے بابا کو ہاتھوں پر اٹھایا تو میری دونوں آستینیں خون میں لتھڑ گئیں۔ اسے کوئی کاری زخم لگا تھا جو خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ وہ لاکھ طاقت ور سہی مگر خون کی کمی سے تو بڑے بڑے پہلوان بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی تو عمر بھی خاصی تھی۔ میں اسے اٹھا کر کٹیا میں لے گیا اور بہت احتیاط سے پیال کے بستر پر لٹا دیا۔ پھر میں نے اس کے زخم کا جائزہ لینے کے لئے قمیض الٹ دی مگر مجھے زخم دکھائی نہیں دیا۔ وہ شاید جسم کے اوپری حصے میں تھا۔ میں جھپٹ کر باہر نکلا اور گنجے سے چوڑے پھل کا وہ خنجر نکال لیا جس سے وہ بابا کو مارنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے اس کی گردن میں پیوست ہونے والا خنجر بھی گھسیٹ لیا، اس گنجے ہی کے کپڑوں سے صاف کیا اور دونوں خنجر لے کر دوبارہ کٹیا میں آ گیا۔ اس وقت تک کانتا وہ سفوف پانی کے گلاس میں گھول چکی تھی۔ میں نے بابا کو سہارا دے کر اٹھایا اور اس نے زور زور سے آوازیں دیں۔ اس نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سارا مشروب پی گیا۔ مشروب پیتے ہی حیرت انگیز اثرات مرتب ہوئے اور بابا نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔

میں نے خنجر سے اس کی قمیض کی آستین چاک کر دی تا کہ زخم کی مرہم پٹی کر سکوں۔

''اب یہ سب کچھ بیکار ہے بیٹا!'' بابا نے کہا اس کی آواز میں اب پہلی سی نقاہت نہ تھی۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے بابا!'' میں نے جلدی سے کہا ''کل تک تو تم مجھے حوصلہ دے رہے تھے'' میں نے اس کے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے دائیں شانے سے لے کر سینے تک بہت گہرا گھاؤ تھا۔

کانتا پانی گرم کر کے لے آئی تھی۔ شاید اسے علم تھا کہ بابا زخم لگنے کی صورت میں کونسا سفوف استعمال کرتا ہے۔ میں نے کپڑا گیلا کر کے اس کا زخم صاف کیا تو کانتا نے ایک سفوف کی شیشی میری طرف بڑھا دی اور بولی ''یہ سفوف زخم پر چھڑک دو۔ پھر کچھ دیر بعد اس دوا کا لیپ کر دینا۔'' اس نے ایک ڈبہ میری طرف بڑھایا جس میں مرہم کی طرح کوئی چیز تھی۔

''اس سے اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا بیٹا!'' بابا نے کہا۔ ''وہ خنجر کسی خطرناک زہر میں بجھا ہوا تھا۔ گھاؤ لگتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ خنجر میں زہر ہے ورنہ یہ گھاؤ میرے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔''

میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے سفوف اس کے زخم پر چھڑک دیا۔ میں جانتا تھا وہ شدید تکلیف سے دوچار ہوگا مگر ماتقی ماس کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ اس کے منہ سے ذرہ برابر آواز نہ نکلی، چہرے سے البتہ اذیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''سب بے کار ہے بیٹا! تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ سب چھوڑو اور میری بات غور سے سنو۔''

''بس بابا! ایک منٹ'' کانتا نے جلدی سے کہا اور مجھ سے بولی۔ ''اب ہاتھ سے زخم پر اس دوا کا لیپ کر دو۔''

میں نے وہ مرہم اچھی طرح اس کے زخم پر لگا دیا۔ بابا ایک دم پرسکون ہو گیا۔ اس دوران میں کانتا نے تانبے کے گلاس میں پانی لے کر ایک اور سفوف گھول لیا تھا۔ اس نے وہ مشروب بوڑھے کو زبردستی پلا دیا۔ پھر تو ایسا لگا جیسے بوڑھے میں نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کانتا سے بولا۔ ''کانتا بیٹا! میری وہ لکڑی والی صندوقچی نکال جس پر ہاتھی دانت کا کام ہے۔''

''مگر بابا! اس میں تو تالا پڑا ہوا ہے۔''

''اس کی چابی نیلے سفوف والی بوتل میں ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔

چند منٹ بعد کانتا وہ صندوقچی اور چابی لے کر آ گئی۔ بابا نے جلدی سے صندوقچی لے لی اور مجھ سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں تم مسلمان ہو مگر بیٹا نہ جانے کیوں تم پر بھروسہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا بابا!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم نے مجھ پر احسان کیا ہے اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔''

بوڑھے یوگی نے وہ صندوقچی کھولی اور اس میں سے چھوٹی چھوٹی کئی شیشیاں نکالیں پھر اس نے کانتا سے کہا ''ایک کڑھائی میں پانی کھولاؤ۔''

کانتا کوئلوں والی انگیٹھی وہیں اٹھا لائی۔ اس نے انگیٹھی میں مزید کوئلے ڈالے اور اس پہ پانی کی کڑھائی رکھ دی۔

اچانک مجھے منگل کا خیال آیا۔ وہ بے چارہ ابھی تک اس مچان پہ بیٹھا تھا، ان لاشوں کا خیال آیا جو کٹیا کے باہر پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بابا سے کہا کہ میں منگل کو یہاں لے آتا ہوں۔

''وقت ضائع مت کرو'' بوڑھے نے کہا ''میرے پاس وقت کم ہے۔ منگل تو کچھ دیر بعد بھی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

آ جائے گا'' پھر اس نے ایک شیشی میں سے تھوڑا سا سفوف نکالا اور کڑھائی میں ڈال دیا۔ ''یہ میری تیس برس کی تپسیا کا نچوڑ ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''اسے استعمال کرنے کے بعد تمہارے ہاتھوں میں ایسی شکتی آ جائے گی کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔''

''تمہیں میری بات پر حیرت ہو رہی ہے نا!'' وہ مسکرایا۔ ''مگر یہ جڑی بوٹیاں مجھے برسوں کی تلاش کے بعد ملی ہیں۔ اگر کوئی مجھے ان کے بدلے میں ایک کروڑ روپے بھی دیتا تو میں قبول نہ کرتا مگر اب آخری وقت میں اپنا یہ خزانہ میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔'' پھر اس نے ایک شیشی سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور پانی کا گلاس لے کر اس میں ملا دیا اور بولا۔ ''یہ سفوف ہے جو میں خود بھی استعمال نہ کر سکا۔ اسے پینے کے بعد تمہارے شریر میں بلا کی طاقت آ جائے گی اور کوئی بھی زہر چاہے وہ کتنا ہی خطرناک ہو تم پر اثر نہیں کرے گا۔''

میں گلاس ہاتھ میں کر ایک لمحے کو جھجکا۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔ اس میں سے عجیب سی بو آ رہی تھی، پھر بوڑھے کے اصرار پر ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ وہ پیتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں کھد بد شروع ہو گئی ہو۔ کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کہ کولڈ ڈرنک کی بوتل چٹکی بھر نمک ڈالنے کے بعد ہوتی ہے۔ مجھے زبردست ابکائی آئی مگر میں برداشت کر گیا، پورے جسم میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میں پُرسکون ہو گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں انجانی قوت حل کر گئی ہو، میں نے پانی پینا چاہا مگر بابا نے روک دیا۔ وہ صندوقچی میں سے ایک اور شیشی نکال رہا تھا۔ اس نے کانتا سے گلاس میں پانی منگوایا اور اس شیشی میں چٹکی بھر سفوف پانی میں ملا دیا۔ پانی میں چھنا کا سا ہوا اور گلاس میں سے دھواں نکلنے لگا۔ میں کہنے والا تھا کہ بابا خدا کے لئے اب مجھے مزید کسی شکتی کی ضرورت نہیں ہے مگر وہ میری کیفیت سے بے نیاز گلاس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سفوف پینے کے بعد کوئی زہریلا کیڑا یا جنگلی جانور تمہارے نزدیک نہیں آئے گا۔''

''شہروں میں شیر اور چیتے کہاں ہوتے ہیں بابا!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یوں تو آدمی سے بڑا کوئی درندہ نہیں ہوتا بیٹا!'' بابا نے سنجیدگی سے کہا ''مگر شہروں میں خونخوار کتے تو ہوتے ہیں اور کبھی کبھی جنگل میں شیر، چیتے دیچھو یا بھیڑیے سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی جانور تمہارے نزدیک بھی نہیں پھٹکے گا۔''

مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے بابا کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ناک بند کر کے اسے

بھی ایک سانس میں پی گیا۔ اسے پینے کے بعد مجھے پھر ابکائی آئی مگر الٹی نہیں آئی۔ میں نے بابا سے کہا ''اور جو کچھ باقی رہ گیا ہو وہ بھی پلا دو۔''

میری جھنجھلاہٹ پر بابا ہنسنے لگا اور بولا۔ ''بس پلانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔'' پھر وہ سوچ کر بولا۔ ''میں یہ سب دوائی تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ پچیس سال بعد تمہیں پھر ان کی ضرورت پڑے گی کیونکہ یہ اتنے ہی وقت کے لئے کارآمد ہیں۔ چاہو تو اپنے بیٹے کو بھی پلا دینا۔''

''میرا بیٹا!'' میں ہنسا ''میرا بیٹا تو ابھی ہے ہی نہیں۔''

''آج نہیں ہے تو کل ہو گا۔'' بابا مسکرایا پھر بولا ''بس اب آخری مرحلہ باقی ہے''۔ وہ کانتا سے مخاطب ہوا۔ ''کانتا! وہ بڑا والا مرتبان اٹھا لاؤ۔ کوئی بڑی سی تھالی اور چمچہ بھی لیتی آنا۔''

کانتا مطلوبہ چیزیں لے آئی تو بابا نے اس جار میں سے مرہم کی طرح کی کوئی چیز اس تھالی میں نکالی اور اپنی صندوقچی میں سے دو تین سفوف چٹکی چٹکی بھر اس میں ملا دیئے۔ پھر اس نے کڑھائی کے کھولتے ہوئے پانی میں مزید کچھ سفوف ڈالے اور چمچے سے اس مرہم کو پھینٹنے لگا۔

''اسے ذرا طاقت سے پھینٹو گے'' بابا نے وہ تھالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے اب ان باتوں سے الجھن سی ہونے لگی تھی مگر بوڑھے کی دل آزاری کی وجہ سے خاموش تھا۔ میں نے وہ تھالی اور چمچہ لے لیا اور مرہم نما آمیزے کو انڈے کی طرح پھینٹنے لگا بوڑھا کہتا جا رہا تھا۔ ''جتنا پھینٹو گے مرہم اتنا ہی فائدہ دے گا۔ میں نے جو دوائیں اس میں ملائیں ہیں وہ اس میں اچھی طرح مل جائیں گی۔

پھر میں نے اس مرہم کو اتنا پھینٹا کہ اس میں جھاگ بننے لگا۔ بابا نے مجھے روک دیا۔ ''بس اتنا کافی ہے۔ اب ذرا آخری مرحلے کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

پھر وہ کانتا سے مخاطب ہوا۔ ''اسے کوئی صاف ستھرا کپڑا دے دو''۔ کانتا جلدی سے ایک کپڑا لے آئی وہ خود الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ سب کچھ اس کے لئے بھی نیا تھا۔ بوڑھے نے مجھ سے کہا۔ ''اس کپڑے کو دانتوں میں پکڑ لو۔''

میں نے حیرت سے بوڑھے کو دیکھا۔ میں سمجھا شاید زہر اس کے دماغ میں سرایت کر گیا ہے۔ مجھ سے زیادہ کانتا حیران تھی۔

''مجھے پاگل مت سمجھو۔'' بوڑھا جھنجھلا گیا۔ ''ابھی تم اس کھولتے ہوئے کڑھائی میں کہنیوں تک ہاتھ ڈالو گے تو تکلیف کی شدت سے تمہاری چیخیں نکل جائیں گی۔''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''کیا؟.....میں.....اس کڑھائی.....میں ہاتھ ڈالوں گا؟'' میں نے ہکلا کر کہا ''مگر کیوں؟ میرے ہاتھ تو ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جائیں گے، چربی نکل آئے گی، پوری کھال اتر جائے گی۔'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔

''نہ کھال اترے گی، نہ چربی نکلے گی''۔ بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا۔ بس تکلیف ہوگی۔ اس پانی میں ایسی جڑی بوٹیوں کا ست شامل ہے کہ اس سے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ بہت انمول چینی نسخہ ہے۔ مجھے بھی تبت کی ترائی میں ایک بھکشو نے دیا تھا۔ جلدی کرو ورنہ اس کا اثر جاتا رہے گا۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس کے بعد تمہارے ہاتھوں میں ایسی شکتی آ جائے گی تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ جلدی کرو، سمے بہت کم ہے۔

''مگر بابا! میرے ہاتھوں کی کھال نہ بھی اتری تو میہ زخم ہی ٹھیک ہونے میں مہینوں لگ جائیں گے۔ اس سے پہلے تو میں پیروں سے معذور تھا، اب کیا ہاتھوں سے معذور ہوں گا؟''

میری بات سن کر بابا مسکرایا۔ ''تمہارے زخم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی کم وقت لگے۔ بس اب جلدی کرو۔''

میں نے بے بسی سے پہلے بابا کو پھر کانتا کی طرف دیکھا، پھر ایک نظر ابلتے ہوئے کڑھائی پر ڈالی اور یکدم اس میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کانتا کا لایا ہوا کپڑا منہ میں دبایا اور قمیض کی آستین چڑھا کر ایک دم دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک ابلتے ہوئے اس کڑھائی میں ڈال دیئے۔ تکلیف کی شدت سے بے اختیار میرے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی مگر کپڑے کے وجہ سے منہ میں گھٹ کر رہ گئی۔ میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اگر کپڑا میرے منہ میں نہ ہوتا تو شاید دانتوں سے میری زبان زخمی ہو جاتی کیونکہ میں نے پوری قوت سے دانت بھینچ لئے تھے۔

''شاباش بیٹا!'' بابا کی خوشی سے لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بس تھوڑی دیر اور ہاتھ پانی میں رکھو۔ جب تک میں نہ کہوں، ہاتھ نکالنا مت ورنہ سب کچھ بیکار ہو جائے گا۔''

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ کہنیوں سے کٹ کر اس کڑھائی میں گر جائیں گے۔ اس لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں کی کھال اتر رہی ہو، چربی پگھل رہی ہو۔ بوڑھا آہستہ آہستہ میری پیٹھ تھپک رہا تھا اور کانتا اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے چہرے کا پسینہ خشک کر رہی تھی۔ پسینہ تو میرے پورے جسم پر تھا اور لمحوں میں میرے کپڑے شرابور ہو گئے تھے۔

پھر شاید اسی حالت میں کئی منٹ گزر گئے تھے مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی

ہوں۔ اب مجھے تکلیف تو تھی مگر وہ شدت نہیں تھی کہ درد کا حد سے گزر نا دوا ہو جانا!

''اب ہاتھ نکال لو'' بابا کی آواز آئی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دونوں ہاتھ نکال لئے۔ میرا خیال تھا کہ ہاتھوں کی کھال اتر چکی ہو گی۔ میں نے پانی سے جلے ہوئے لوگ دیکھتے تھے۔ ان کے جسم کی کھال یوں اتری تھی جیسے ابلے ہوئے آلو کا چھلکا اتار لیا جائے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ البتہ ہاتھوں پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے تھے۔ بوڑھے نے جلدی سے مرہم کی تھالی اٹھائی اور میرے ہاتھوں اور کلائیوں پر اس جادوئی مرہم کا لیپ کر دیا۔ جادوئی اس لئے کہ مرہم لگتے ہی مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا اور منٹوں میں ساری تکلیف ہوا ہو گئی۔

''کانتا بیٹی!'' بوڑھے نے اسے مخاطب کیا۔ ''اس مرہم کا اچھی طرح لیپ کر دے۔''

کانتا کے ساتھ ہی میں نے بھی چونک کر بابا کو دیکھا۔ اس کی آواز میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیا ہوا بابا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''بس اب سمے پورا ہو گیا ہے بیٹا!'' بابا نے نحیف لہجے میں کہا۔ ''خنجر کا زہر شاید میرے دل تک جا پہنچا ہے۔''

کانتا جلدی جلدی اس مرہم کا لیپ کر رہی تھی۔ اس نے بہت مہارت سے میری انگلیوں کے جوڑوں تک میں اس کا لیپ کر دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دونوں ہاتھ برف میں دبا دیئے گئے ہوں۔ عجیب سی کیفیت تھی، تکلیف تو کب کی رفع ہو چکی تھی۔ ہاتھوں کے آبلے بھی آہستہ آہستہ حیرت انگیز طور پر کم ہو رہے تھے۔ البتہ میرے ہاتھوں کی جلد پہلے سرخ و سفید تھی، اب سیاہی مائل نیلی ہو رہی تھی۔

''دو چار دفعہ اس مرہم کا لیپ کر دو گے تو ہاتھوں کا رنگ بھی ٹھیک ہو جائے گا''۔ بابا کی نحیف آواز آئی۔ اس کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ''میرے پاس جو کچھ تھا بیٹا، میں نے تیرے حوالے کر دیا۔ ان سب شیشیوں پر نمبر پڑے ہوئے ہیں اور لکڑی کے ایک بکس میں ایک کاپی ہے جس میں ان دواؤں کا استعمال کا طریقہ لکھا ہے۔ ہاں، ایک آخری بنتی ہے تجھ سے'' بوڑھے نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ''میرے بعد کانتا کا خیال رکھنا۔ مجھے دشواش ہے کہ یہ تیری فولادی پناہ میں سکھ سے رہے گی۔ جب تک اسے اس کا حق نہ مل جائے، اس کا ساتھ مت چھوڑنا۔'' بابا کی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

آواز بہت دھیمی ہوگئی اور اس کا سانس ایک مرتبہ پھر اکھڑ گیا۔ ''مجھے وچن دے بیٹا کہ تو کانتا کی رکھشا کرے گا۔''

بابا نے پرسکون سانس لیا اور بولا۔ ''اب میں شانتی سے مرسکوں گا۔ خنجر کا اتنا خوف تھا کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسی وقت مر گیا ہوتا۔'' بابا کا سانس بُری طرح اکھڑ گیا۔ ''پپ..... پا..... نی۔'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا پھر اس سے پہلے کہ کانتا پانی لے کر آتی، اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ بابا آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

کانتا بلک کر رونے لگی۔ میری بھی آنکھیں نم ہوگئیں۔ مجھے بابا سے ملنے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اتنے کم وقت میں اس نے میرے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ اس نے اپنی زندگی بھی کی محنت، جیون بھر کی تپسیا بغیر مانگے میرے حوالے کر دی تھی۔ مرنے کے بعد وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اس کی طرح کانتا کی حفاظت میں بھی کروں گا۔ میں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ میں یہ وعدہ نبھا بھی سکوں گا؟ میں تو خود حالات کے جبر کا شکار تھا، بہ مشکل تمام خود کو بچائے ہوئے تھا۔ میرے سر پر تو کوئی سائبان تک نہیں تھا۔ میں بھلا کانتا کی حفاظت کیسے کر سکتا تھا مگر میں نے ایک مرتے ہوئے انسان سے جو وعدہ کیا تھا، اسے تو بہر حال نبھانا ہی تھا۔ کانتا ابھی تک بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''بس کرو کانتا۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''ابھی ہمیں بہت سے کام کرنا ہیں اور ہمیں کیا یہ سب تو تمہی کو کرنا ہوگا۔ میں تو فوری طور پر کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔''

کانتا نے آنسو پونچھ کر اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔ ''تم فکر مت کرو، میں سب کچھ کر لوں گی۔''

''کیسے کر لوں گی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''سب سے پہلے تو منگل کو وہاں سے اتارنا ہے، پھر باہر جو لاشیں پڑی ہیں، انہیں ٹھکانے لگانا ہے، بابا کا کریا کرم کرنا ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ سب کچھ ہو جائے گا۔'' کانتا نے کہا۔ ''آؤ پہلے منگل کو اتار لیں۔'' یہ کہہ کر وہ کٹیا سے باہر نکل گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ باہر وہی منظر تھا۔ چھوٹی سی جگہ میں پانچ لاشیں پڑی تھیں۔ ان سب کے سب اکڑ گئے تھے۔ کانتا ان کی طرف توجہ دیئے بغیر درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دی۔

ہم درختوں کے جھنڈ میں پہنچے تو منگل کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ کہاں رہ گئے تھے؟ اگر ابھی اور کچھ دیر نہ آتے تو میں خود ہی اس مچان سے نیچے اتر آتا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''بابا کا کیا حال ہے؟''

''بابا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' کانتا کی آواز بھرا گئی، پھر وہ منگل سے مخاطب ہوئی۔ ''اس ٹوکری میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں نیچے اتار لوں گی۔''

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

زندگی عجب تضادات کا مجموعہ ہے۔اس سچائی کا مجھے ادراک تو تھا ہی لیکن اتنے تجربات سے گزرنے کے بعد اس کا یقین بھی آ گیا کہ انسان کتنا بے اختیار ہے۔ایک حادثے نے مجھے بانو سے الگ کیا۔دوسرے حادثے نے دوبارہ ملایا اور پھر ہم دونوں الگ ہو گئے۔اگر میرے پاؤں زخمی نہ ہوتے اور میں پولیس اور اپنے اغوا کاروں کے درمیان جاری جنگ کا حصہ نہ بنتا تو ہسپتال تک بھی نہ پہنچتا اور وہاں سے بانو کے ساتھ فرار ہونے کے بعد موجودہ صورتحال سے دو چار نہ ہوتا.....!! خدا جانے اس لمحے میں کس کیفیت کا شکار تھا۔انسان سائیکی میں ایسا ایک لمحہ ہی اس کے زندگی بھر کے فیصلوں کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔مجھے اچانک ایک جھرجھری سی آئی۔یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک میرے دونوں کندھے پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا ہو۔

''فضل خان!تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

کسی نادیدہ قوت نے اچانک میرے کانوں میں چیختے ہوئے مجھ سے سوال کیا اور میں لرز کر رہ گیا۔

''اوہ میرے خدایا.....''میں نے سوچا۔واقعی میں تو یہاں جہاد کرنے آیا تھا اور کہاں الجھ کر رہ گیا ہوں۔

''نکل جاؤ...فوراً اس جال سے نکل جاؤ.....ورنہ اس بُری طرح پھنسو گے کہ پھر شاید کبھی نہ نکل پاؤ.....''اسی نادیدہ طاقت نے مجھے چیلنج کے انداز میں کہا اور میں نے اسی لمحے یوں محسوس کیا جیسے اچانک میں کسی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔

''میں اب یہاں نہیں رہوں گا.....''میں نے اپنے آپ سے کہا۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میں کانتا کے باپ کا احسان مند ہوں۔اس بوڑھے سنیاسی نے مجھے دوبارہ پاؤں پر کھڑا کیا تھا لیکن اب وہ دنیا میں نہیں رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے کیا لینا دینا اس سارے گورکھ دھندے سے؟

ایمانداری کی بات تو یہ تھی کہ میں کسی راہ گم کردہ جہاز کی طرح کسی انجانے سیارے پر اترا تھا اور اس میں میری مرضی ہرگز شامل نہیں تھی۔یہ میری منزل نہیں تھی نہ ہی اس دنیا کا باسی تھا۔یہ تو

ڈاکوؤں،غنڈوں اور بدمعاشوں سے بھرا ایک خونی جنگل تھا جہاں حالات نے مجھے لاکر پھینک دیا تھا۔اب مجھے یہاں سے بہرصورت نکل جانا چاہئے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

اس فیصلے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔بالکل ایسے جیسے کسی دہکتی آگ پر اچانک بہت سا پانی گرا کر اسے ٹھنڈا کر دیا جائے۔

منگل نیچے اتر آیا تھا۔اسے کانتا کی مدد سے جنگل کے بیچوں بیچ ایک محفوظ ٹھکانے پر لے آئے تھے۔میں نے ''ٹھکانے'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ یہاں پہلے سے ایک جھونپڑی درختوں کے جھنڈ کے اندر اس طرح بنائی گئی تھی کہ بہت قریب آنے پر بھی اس کا علم نہ ہو پاتا۔ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ''ٹھکانہ'' بابا نے کسی ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر یہاں بنایا ہوا تھا اور کانتا کو بھی پہلے سے اس کا علم تھا۔ہم تینوں جھونپڑی میں داخل ہوئے۔جہاں پہلے سے چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ایک کونے میں لالٹین اور ایک صندوق پڑا تھا۔اس بڑے ٹرنک نما صندوق کو بھی اسی طرح درختوں کی شاخوں سے ڈھانپا گیا تھا کہ پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کانتا نے درختوں کی خشک شاخوں اور پتوں کو ہٹا کر اسے کھولا اور اس بڑے ٹرنک سے تین چار چادریں اور بھوجن کے لئے خشک دالیں اور پہلے سے تیار کردہ چیزیں باہر نکالیں۔ایک ٹین کے ڈبے کو کھول کر اس نے پہلے سے تیار کردہ حلوہ نما ایک مٹھائی کے کچھ ٹکڑے مجھے اور منگل کو کھانے کے لئے دیئے اور خود بھی کھائے۔ان کا ذائقہ تو گڑ سے بنی کسی مٹھائی جیسا تھا لیکن ان ٹکڑوں کے حلق سے معدے میں اترنے کے کچھ ہی منٹ بعد توانائی کا احساس ہوتا تھا اور یوں محسوس ہوا جیسے جسم میں اچانک ایک نئی طاقت عود کر آئی ہو۔یقیناً یہ بھی بابا کی کسی سنیاسی دوا کا اعجاز تھا۔

''ہمارے پاس ایک ہفتے کا راشن موجود ہے۔''کانتا نے ہمیں باور کروایا۔

''ہم یہاں کم از کم ایک ہفتہ اطمینان سے گزار سکتے ہیں.....''

''ہاں،ہاں!یہ تو بہت اچھا ہوا۔اگلے تین چار دنوں میں شاید میں چلنے کے لائق بھی ہو جاؤں گا.....''منگل نے کہا۔

''کیوں نہیں!کیوں نہیں!.....''کانتا نے جواب دیا۔

اس نے یہاں موجود اشیائے خورد و نوش سے چاول کی کھچڑی پکا کر ہمیں کھلائی اور ہم وہیں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

گھاس پھوس کے نرم دہ بستر پر لیٹ گئے۔ جھونپڑے کے ایک کونے میں ترنگ کے دوسری طرف کانتا چادر اوڑھ کر سوگئی جبکہ دوسری طرف میں اور منگل لیٹ گئے۔

"منگل تم آرام کرو..... میں باہر پہرہ دیتا ہوں....." میں نے اچانک ایک منصوبے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"کیا..... کیا بات کر رہے ہو تم؟" منگل نے حیرانگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو ابھی وہ لوگ یہاں سے گئے نہیں..... ممکن ہے وہ ہمیں ڈھونڈتے اس طرف آ جائیں غیر ارادی طور پر ہی سہی ہم ان کے دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں....." میں نے کہا۔

"اس طرف کوئی نہیں آئے گا، مطمئن رہو" کانتا نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"..... میں نے پوچھا۔

"لیکن یہ بھی تو اچھی بات نہیں کہ میں یہاں آرام کروں اور تم....."

"اس کی تم فکر نہ کرو منگل....." میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم میرے محسن ہو۔ اگر تمہاری حفاظت میں میری جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔ بس ایک درخواست تم سے کروں گا۔"

منگل نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"منگل اگر مجھے کچھ ہو بھی جائے تو مجھے وچن دو کہ تم کانتا کی حفاظت کرو گے۔"

"یہ کیسی بات کر رہے ہو تم .....؟" منگل کے بجائے کانتا نے کہا۔

منگل چند لمحے خاموش رہا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"خان! اوّل تو میرے ہوتے تم دونوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اگر بھگوان نہ کرے کچھ بھی ہوا تو میں وچن دیتا ہوں کہ زندگی کے آخری سانسوں تک کانتا کی حفاظت کروں گا۔ بابا صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی محسن ہے اور کانتا اس کی امانت ہے۔ جس کی حفاظت میرا فرض ہے۔"

"او ہو! تم لوگوں نے کیسی باتیں شروع کر دیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں آئے گا یہاں..... اور ہم یہاں زیادہ دیر ٹھہریں گے بھی نہیں..... صبح یہاں سے نکل جائیں گے۔" کانتا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" نجانے یہ لفظ کیوں میرے منہ سے نکل گیا۔

"جنگل سے باہر۔ یہاں سے بڑی سڑک بمشکل دو ڈھائی گھنٹے کے فاصلے پر ہے"۔ کانتا نے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا..... "اور اس راستے پر ہمیں زیادہ خطرہ بھی نہیں کیونکہ سرکاری لوگ بھی اسی راستے سے جنگل کی طرف کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔"

کانتا کے جواب نے مجھے بہت مطمئن کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آ گیا ہے۔ اور میں نے دل ہی دل میں اب تک جو دعائیں مانگی تھیں وہ مقبول ہو گئی ہیں۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ میں باہر بیٹھتا ہوں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک کونے میں دھرا مضبوط سا ڈنڈا اٹھا لیا..... "مطمئن رہو جیسے ہی صبح کی روشنی پھیلے گی میں بھی سو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر ان کا جواب سنے بغیر میں باہر آ گیا۔

جھونپڑے کے باہر میں ایک کونے میں کچھ فاصلے پر موجود ایک پتھریلی چٹان پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اس سمت میں گڑی تھیں جدھر کانتا نے اشارہ کیا تھا اور میں نے اس سمت قسمت آزمائی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ اب میرا ضمیر مجھے ملامت بھی نہیں کر رہا تھا کیونکہ دونوں یہاں محفوظ تھے اور سڑک نزدیک ہونے کی وجہ سے منگل کی رسائی وہاں تک ممکن تھی۔ یوں بھی دونوں ایک دھرم کے ماننے والے تھے اور ان کے درمیان کوئی بھی رشتہ قائم ہو سکتا تھا۔ منگل بدمعاش اور ڈاکو ضرور رہا ہوگا لیکن اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ احسان فراموش اور دغاباز نہیں ہے اور کانتا کو کم از کم کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ مجھے کانتا سے محبت ہو گئی تھی نہ ہی میں کچھ ایسا دل پھینک قسم کا عاشق تھا کہ اس طرح راہ چلتے عورتوں سے عشق لڑاتا پھرتا۔ البتہ مجھے اس لڑکی نے متاثر کیا تھا اور میں اس بات کا اندازہ بھی ایمانداری سے لگا سکتا تھا کہ مجھے ایک مسلمان سمجھنے کے باوجود کانتا میرے لئے ایسے جذبات رکھتی ہے جو کوئی بھی نوجوان لڑکی کسی کے لئے رکھ سکتی ہے۔ البتہ ابھی تک اس کی طرف سے مجھے بانو کی طرح کسی شہوت بھرے سلوک کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی جو میرے لئے چنبھے کی بات تھی۔

میں جانتا تھا میرے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر وہ دونوں کچھ اچھا محسوس نہیں کریں گے لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ منگل جرم و سزا کی دنیا کا باسی ہونے کے ناطے میری مجبوری کو سمجھتا ہے اور نہ صرف مجھے معاف کر دے گا بلکہ کانتا کو بھی مطمئن کر دے گا۔ نجانے میں کانتا کے لئے اتنی ہمدردی کے جذبات کیوں رکھتا تھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میرے لئے راتیں جاگنا کوئی نیا تجربہ نہیں تھا...... نہ ہی میں ایسی صورتحال سے گھبرانے والا تھا۔ میں نے یہاں سے فرار ہونے اور بانو تک پہنچنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اور اب اس پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار کے بعد میں دبے پاؤں جھونپڑی کی طرف گیا۔ اندر جھانکا تو دونوں اطمینان سے سو رہے تھے......!! میں نے دل ہی دل میں ان سے معافی مانگتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا اور دبے قدموں باہر آ گیا۔

کانتا نے جس سمت انگلی اٹھائی تھی۔ اسی سمت کا سفر اختیار کیا......!! افغانستان کا تجربہ میرا رہنما نہ بنتا تو میں کبھی رات کو اس گھنے جنگل میں سفر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جنگل میں شکار کھیلنے والے پیشہ ور شکاری بھی کبھی رات کو جنگل میں سفر کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتے اور اپنی راتیں عموماً درختوں کے درمیان مچان میں گزارتے ہیں لیکن میرے لئے اب یہاں مزید ایک پل بھی ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا تھا گو کہ بانو نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا لیکن ابھی تک میں نے اپنی اصلیت کو فراموش نہیں کیا تھا۔

میرے چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور کہیں کہیں گھنے درختوں کے پتوں میں سے آسمان دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ چڑھتے چاند کی راتیں تھیں۔ درختوں کے پتوں سے چھن کر چاندنی جنگل میں اتر رہی تھی اور سامنے کا منظر قدرے نمایاں تھا۔ بصورت دیگر تو ان اوقات میں جنگل کے مسافر کو اپنے اندھے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مجھے جلد از جلد سڑک تک پہنچنا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو بانو تک بھی پہنچ ہی جاؤں گا کیونکہ اس کا ایک انتہائی محفوظ فون نمبر میرے دماغ پر نقش تھا اور بقول بانو یہ نمبر ایمرجنسی کی صورت میں جب اور کوئی چارہ کار نہ ہو، استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے یہ نمبر ہی میرے لئے رکھا ہوا تھا۔

میرے لئے اس مخصوص سمت میں چلنا جدھر کانتا نے اشارہ کیا تھا، لازم تھا۔ اگر خدانخواستہ میری سمت بدل جاتی جس کا جنگل میں ہر لمحے دھڑکا لگا رہتا ہے تو شاید اگلے کئی دن تک پھر میں یہاں سے نکلنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ سمت کا تعین کرنے میں بھی میرا ماضی کا تجربہ کام آیا۔ افغانستان میں دوران جہاد ہمیں صحرا، پہاڑوں اور جنگلوں میں سفر کا اتفاق ہوتا رہتا تھا کیونکہ ایسی اجاڑ جگہ ہی مجاہدین کا مسکن بنتی ہے۔ اب بھی میں اسی تجربے کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنی دانست میں دس پندرہ منٹ کے سفر کے بعد میں جہاں بھی ممکن ہوتا درختوں کے پتوں میں سے

آسمان پر نظریں دوڑا کر ستاروں کی کچھ شناخت کے بل بوتے پر اپنی سمت کا تعین بھی کر لیتا۔

مجھے اس بات کا تو اندازہ نہیں کہ جھونپڑی سے یہاں تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی تھی لیکن یہ بات میں ضرور جان گیا تھا کہ اب دن نکل آیا ہے کیونکہ جنگل میں اجالا پھیلنے لگا تھا اور محتاط ترین اندازے کے مطابق میں نے ڈھائی تین گھنٹے سے بہرحال زیادہ سفر طے کر لیا تھا لیکن ابھی تک جنگل ختم ہونے یا پھر سڑک کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''کہیں میں راستہ تو نہیں بھٹک گیا؟'' اچانک ہی ایک خیال نے مجھے لرزا دیا۔

اس تصور نے ہی مجھ پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی کہ میں نے اپنی سمت کھو دی ہے لیکن کوئی نادیدہ قوت جس نے مجھے جھنجھوڑ کے میری اصلیت یاد دلائی تھی۔ اب بھی مجھے حوصلہ دلا رہی تھی کہ میں ضرور یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

بابا سنیاسی کے کشتوں اور علاج نے خصوصاً اس کڑوے شربت نما دوائی نے جو اس نے میری حلق میں انڈیلی تھی میری گمشدہ توانائیاں لوٹا دیں تھیں جس کا اندازہ مجھے اس سفر کے دوران ہوا۔ عام حالات اور اس صورت حال میں جس سے میں دوچار تھا شاید میرے لئے اپنی توانائیاں برقرار رکھنا ممکن نہ رہتا اور اب تک تھکن سے چور ہو چکا ہوتا لیکن یقین جانیے مجھے تھکن کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا اور خود کو اب بھی تازہ دم اور تندرست تو انا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی کئی گھنٹے اور بھی میں پیدل چل سکتا ہوں۔ اس دوران رہ رہ کر مجھے نجانے کیوں کانتا کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے احساس ندامت تھا کہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ البتہ یہ اطمینان ضرور تھا کہ منگل سنگھ اسے ضرور سنبھال لے گا اور کانتا بھی میری مجبوری کی وجہ سے مجھے معاف کر دے گی۔

میں کانتا کا اس بات کے لئے بہرحال ساری زندگی مشکور رہوں گا کہ اس نے مجھے جنگل سے متعلق بہت سی کام کی باتیں بتا دی تھیں۔ مجھے علم ہو گیا تھا کہ وہ کون سے درختوں کے پتے ہیں جو میری بھوک اور پیاس بھی مٹا دیں گے اور میرا معدہ بھی ان کے برے اثرات سے محفوظ رہے گا۔ کسی حد تک زخموں کو مندمل کرنے کا مرہم بھی جنگلی جڑی بوٹیوں کی مدد سے مجھے تیار کرنا آ گیا تھا کیونکہ یہی وہ مرہم تھا جو پہلے میں اور اب منگل سنگھ اپنے زخموں پر لگاتے آئے تھے۔

مجھے علم نہیں دن کب نکلا۔ میں نے کتنا فاصلہ طے کیا لیکن پہلی مرتبہ جب میرے کانوں میں کسی بھی بڑی سڑک سے فاصلے پر ہونے کے باوجود محسوس ہونے والی آوازیں ٹکرائیں تو میں خوشی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

سے جھوا اٹھا۔ اگر تھکاوٹ کا معمولی سا احساس بھی تھا تو وہ ختم ہو گیا۔ اب میں سڑک کے بہر حال قریب تھا۔ میں نے اندازے سے اسی سمت میں قدم بڑھائے۔ جدھر سے یہ مانوس سی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ آواز نمایاں ہو رہی تھی جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ان بڑے بڑے ٹرالوں اور ٹرکوں کی آوازیں ہیں جو سڑک سے گزرا کرتے تھے۔ اب مجھے وہ راستہ بھی دکھائی دے رہا تھا جو جنگلات میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کے لئے بنا ہوا تھا جس پر وہ جیپ میں بیٹھ کر سفر کیا کرتے تھے۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں وہ راستہ اختیار کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا کسی سے ٹکراؤ ہو اور کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بانو سے ملاقات سے پہلے کسی اور ایڈونچر کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

O

نیا باب

سڑک کی طرف سے آتی آوازیں اب خاصی نمایاں ہونے لگی تھیں۔ میں نے ایک ندی نما نالے سے جو جنگل کے بیچوں بیچ بہہ رہا تھا غسل کیا اور وہیں درختوں کے نیچے بچھا کر نماز ادا کی۔ اللہ سے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگی اور خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد اب مجھے سڑک کے آثار بڑے واضح دکھائی دینے لگے تھے۔ تھوڑی دیر اور چلنے کے بعد اب سڑک دکھائی بھی دینے لگی تھی۔ میری جیب بالکل خالی تھی اور مجھے کسی نہ کسی طرح کسی ٹیلی فون بوتھ تک پہنچنا تھا۔ سڑک کنارے ایک درخت کے نیچے میں کھڑا ہو کر کسی خدائی مدد کا منتظر ہو رہا۔ میں نے ایک "مائل سٹون" سے اس جگہ کا نامانوس سا نام پڑھا اور اسے ذہن میں نقش کر لیا۔ دور دور تک کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اب تک دو بسیں اور ایک کار وہاں سے گزر رہے تھے جبکہ میں انہیں ہاتھ دے کر رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

ایک ٹرک دور سے آتا دکھائی دیا تو میں نے حوصلہ کر کے اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا لیکن اس نے ٹرک روکنے کی بجائے اس کی رفتار بڑھا لی۔ اس کے بعد آنے والے دو اور ٹرکوں نے بھی میرے ساتھ یہی سلوک کیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں جنگل کے نزدیک ٹرک روکنے میں کیا خطرہ محسوس کر سکتے ہیں کیونکہ اس جنگل میں کچھ دن اور راتیں میں نے بھی گزاری تھیں۔ یہ ڈاکوؤں، لٹیروں کا مسکن تھا اور یہاں کے مکین بھلا ان ٹرک ڈرائیوروں کو کب معاف کرتے ہوں گے۔ اس خوف کی وجہ سے وہ یہاں نہیں ٹھہرتے تھے...... میں نے سڑک کی ایک سمت کا سفر اختیار کیا اور قریباً ایک گھنٹہ مزید پیدل چلتا چلا گیا لیکن سڑک کے دوسرے کنارے جنگل ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس دوران میرے نزدیک ٹریفک رواں رہی۔ اکا دکا لوگوں سے بھی سامنا ہوا جن کو دیکھ کر میں ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ اونچے اٹھا کر انہیں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''رام رام'' کہہ دیتا تھا جواب میں وہ بھی یہی عمل دھراتے اور ہم اپنی اپنی راہ لیتے۔

شاید قدرت کو اب میرے حال پر رحم آ گیا تھا۔ جب میں نے ایک قدرے چھوٹے ٹرک کو جس پر دودھ لدا ہوا تھا ہاتھ دیا تو وہ رک گیا۔ ٹرک ڈرائیور اپنے حلیے سے سکھ دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ کوئی پنجابی نہیں بلکہ مقامی سکھ تھا۔ میں نے اسے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''سردار جی! ابھی آپ یہاں سے نکلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں؟'' اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور ٹرک آگے بڑھا دیا۔

''خیر تو ہے ناں بھائی.....'' اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔

میں نے خوف زدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنے ذہن میں پہلے سے ترتیب دی گئی کہانی اسے سنا دی اور بتایا کہ میرا تعلق پنجاب سے ہے۔ ہم الہ آباد میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہاں کے مقامی زمیندار پنجاب کے کسانوں کی محنت اور ایمانداری کی وجہ سے انہیں ٹھیکے پر زمینیں دے دیا کرتے تھے۔ میں نے سکھ ڈرائیور کو بتایا کہ میرے چاچا نے یہاں ٹھیکہ پر زمین لی ہوئی ہے اور میں اس کے ساتھ کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ (اس کا مجھے دیہاتی ہونے کے ناطے تجربہ تھا) اس علاقے میں تاوان کے لئے اغوا کی وارداتیں معمول سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا علم اس سکھ ڈرائیور کو بھی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ لوگ کسی امیر آدمی کی غلط فہمی میں قریباً ایک ماہ پہلے مجھے اغوا کر کے اس جنگل میں لے آئے تھے۔ جب انہیں علم ہوا کہ میں مطلوبہ شخص نہیں، نہ ہی کوئی موٹی آسامی ہوں تو مجھے مارنے لگے پھر مجھ سے نوکروں کی طرح کام کرواتے رہے۔ مجھے ان کے ٹھکانے کا کچھ علم نہیں ہو سکا۔ دو تین روز پہلے وہ کسی خطرے کے پیش نظر اپنا ٹھکانہ اور مجھے چھوڑ کر گھوڑوں پر فرار ہو گئے۔ میں نے بڑی منت سماجت کی کہ مجھے کم از کم سڑک تک ہی چھوڑ جاؤ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور میں جنگل میں بھٹکتا بالآخر سڑک تک پہنچ گیا۔

گردش حالات نے اب مجھے مجاہد سے ایکٹر بنا دیا تھا اور یہ سکھ بھی کوئی صاحب دل محسوس ہوتا تھا۔ اس کو میری حالت پر بڑا رحم آیا۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا کہ یہاں سے الہ آباد قریباً 90 کلومیٹر دور ہے لیکن وہ مجھے اپنے گھر تک کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچا دے گا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں سردار جی..... ہمارے مالک بڑے اچھے لوگ ہیں۔ میں انہیں فون کروں گا وہ خود ہی میرا بندوبست کروائیں گے۔ آپ مجھے ایک ٹیلی فون کروا دیں۔''

میں نے بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔

''لے یار یہ کون سا مسئلہ ہے''۔ کہتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کی بڑی سی جیب سے موبائل فون نکال کر مجھے تھما دیا۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بانو کا نمبر ملایا۔ دل ہی دل میں اللہ سے التجا کی کہ اس کا فون آف نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ تین طویل گھنٹوں کے بعد فون پر اس کی مانوس آواز سنائی دی۔

''میں بات کر رہا ہوں میڈم جی.....''

میں نے اونچی آواز سے کہا۔ اس انداز میں کہا کہ بانو کو اندازہ ہو جائے صورتحال کیا ہے۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

''کہاں ہو تم..... میں بہت پریشان ہوں، تمہارے لئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میڈم جی بڑی مشکل سے ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلا ہوں۔ ایک سردار صاحب نے بھگوان ان کا بھلا کرے، میری مدد کی ہے۔ ان کے ٹرک میں بیٹھا ہوں.....'' میں نے اسے مختصر بتایا۔

بانو نے مجھے کہا کہ میں فون ڈرائیور کو دوں۔ مجھے حوصلہ دیا اور کہا کہ میں بالکل نہ گھبراؤں وہ جلدی مجھ تک پہنچ جائے گی۔

میں نے فون ڈرائیور کو دیا۔ جس نے بڑی مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے بانو سے باتیں کیں اور گفتگو ختم ہونے کے بعد فون مجھے مسکراتے ہوئے تھما دیا۔

''میں نے اس گدھے کو قابو کر لیا ہے۔ مطمئن رہنا۔ یہ تمہیں کچھ فاصلے پر ایک جگہ اتارے گا جہاں فاروقی تم سے ملے گا۔ خوش قسمتی سے تم اس کے ایک ٹھکانے سے بیس پچیس کلو میٹر دور ہو..... بالکل مطمئن رہنا۔''

اس نے مجھے سمجھایا اور میں نے فون بند کر کے ''دھن باد'' (شکریہ) کہتے ہوئے اسے دے دیا۔

خدا جانے ایک ڈیڑھ منٹ میں بانو نے سردار صاحب پر موبائل کے ذریعے کیا سحر پھونک دیا تھا کہ وہ مجھ پر مٹا جا رہا تھا۔

''کسی بات سے گھبرانا نہیں مہاراج جی۔ تم تو ویسے بھی اپنے پنجاب کے رہنے والے ہو..... میں نے تو کہا تھا تمہاری میڈم جی سے کہ میں دودھ اتار کر تمہیں الہ آباد چھوڑ آتا ہوں لیکن

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

انہوں نے نہیں مانا..... ویسے میں نے ان کا ایڈریس لے لیا ہے۔ ایک دو روز میں تمہیں ملنے ضرور آؤں گا....." اس نے عجیب سی مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔

"ضرور آنا..... ضرور آنا....." چاچے کو تم سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔ میں نے اسے مزید مطمئن کر دیا۔

بانو نے تو مجھ جیسے مجاہد کو انسان سے گدھا بنا دیا تھا۔ اس بے چارے دیہاتی سے کھ ڈرائیور کی اوقات ہی کیا تھی۔ اس کے تو چہرے کی رنگ ہی بانو سے گفتگو کے بعد تبدیل ہوگئی۔

سڑک کنارے ایک ڈھابے پر اس نے میرے "ناں ناں" کرنے کے باوجود ٹرک روکا۔ وہاں سے مجھے گرما گرم پوڑیوں اور حلوے کا بھرپور ناشتہ کروایا۔ جس کے ساتھ بطور خاص میرے لئے لسی بنوائی، غالباً یہ لوگ اسے جانتے تھے انہوں نے مجھے سردار کا مہمان سمجھ کر میری کچھ زیادہ ہی عزت افزائی کر دی۔ طویل عرصے بعد اس طرح کا ناشتہ کرنے سے میں اپنے اندر خاصی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد ہم دوبارہ چل دیئے اور قریباً پندرہ بیس منٹ بعد اس نے ایک قدرے آباد جگہ پر ٹرک روکا۔

"لے بھئی سنگھا!....." اس نے مخصوص لہجے میں بے تکلفی سے کہا۔ "تیری منزل تو آ گئی۔ میڈم جی نے یہی جگہ بتائی تھی۔ یہاں سے ان کا ملازم تجھے لے جائے گا۔ یار بڑی پہنچی ہوئی لگتی ہے تیری میڈم جی....." اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سردار جی! بڑی امیر اور پڑھی لکھی عورت ہے۔ زمین جائیداد والے لوگ ہیں۔ بہت بڑی فیملی ہے الہ آباد کی۔ ضرور ملنے آنا۔"

میں نے اسے مزید پکا کرتے ہوئے کہا۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ کم از کم ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے لیکن یہ بے چارہ سیدھا سادا سکھ ضرور میڈم جی کو ملنے الہ آباد جائے گا اور وہاں سے بے نیل و مرام واپس لوٹے گا۔

ٹرک رُک گیا تھا ہم دونوں سڑک کنارے ایک عام سے ہوٹل کے نزدیک کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جس پر بڑے بڑے الفاظ میں "ریگل ہوٹل" لکھا تھا۔ بانو نے اسے یہی کہا ہوگا کہ مجھے یہاں چھوڑ دے۔ ابھی تک فاروقی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں ٹھہروں! تمہارے بندے کے آنے تک....." سردار نے پیشکش کی۔

"نہیں سردار جی! آپ نے دودھ پہنچانا ہوگا۔ آپ کی بہت مہربانی۔ آپ کا زندگی بھی احسان مند رہوں گا۔ آپ جایئے اب مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

اس کی "ناں ناں" کرنے کے باوجود میں نے اسے جانے پر مجبور کر دیا اور وہ بادل نخواستہ وہاں سے چلا گیا۔ وہ تو اپنی آج کی "دیہاڑی" مجھ پر قربان کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ہم نے گرم جوشی سے معانقہ کیا اور سردار جی چلے گئے۔

اس کی روانگی کے بمشکل پانچ منٹ بعد ایک موٹر سائیکل سوار مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میرے نزدیک موٹر سائیکل روک کر اس نے اپنا ہیلمٹ اتارا۔ یہ فاروقی تھا۔

ہم دونوں گرم جوشی سے بغل گیر ہوگئے۔

آؤ چلیں۔" فاروقی نے مجھ سے بغل گیر ہونے کے فوراً بعد ہی کہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں زیادہ دیر رکنا اس نے مناسب نہیں جانا۔ سردار ٹرک والے کا دور دور تک نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں فاروقی کی بڑی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب جانے تقدیر اگلی کیا چال چلنے والی ہے؟ میں نے خود کو مکمل طور پر اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا اور میرا ایمان اس بات پر پختہ ہوگیا تھا کہ زندگی اور موت کا ایک وقت بہرحال طے شدہ ہے جس کے آگے اور پیچھے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر میں اب تک زندہ ہوں تو اس میں میری چالاکی یا ٹریننگ کا کوئی کمال نہیں اور آئندہ بھی جب تک میری زندگی طے ہے کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ سوچ کر مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔

فاروقی کی آمد پر ہونے والے احساس تحفظ نے مجھے یاد دلا دیا کہ میں تو نجانے گزشتہ کتنے گھنٹوں سے جاگ رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی نیند میری آنکھوں میں اترنے لگی۔ اس کے ساتھ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے مجھے ایک دو جھٹکے بھی لگے لیکن میں سنبھل گیا۔ "کیا کر رہے ہو یار۔ مجھے بھی مرواؤ گے....." فاروقی نے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مطمئن رہو..... اور جلدی کسی ٹھکانے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" میں نے قدرے کھسیانے ہو کر کہا۔

"بس اگلے دس منٹ میں ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے....." فاروقی نے مجھے مطمئن کرنے کے انداز میں تسلی دی۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اگلے دس منٹ تک میں نے بھی خود پر کنٹرول رکھا اور واقعی ہم دس بارہ منٹ بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

یہ ایک مضافاتی علاقہ تھا جہاں زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے درمیان سے گزرتی سڑک پر اکا دُکا سائیکل رکشہ، کاریں، موٹر سائیکلیں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فاروقی کی موٹر سائیکل قصبے کے ایک کونے میں بنے مکان کے سامنے رُکی اور ابھی انجن سٹارٹ ہی تھا جب چھوٹے سے اس بنگلہ نما گھر کا مین گیٹ کھلا اور ہم موٹر سائیکل سمیت اندر داخل ہو گئے۔ جس نوجوان نے دروازہ کھولا تھا اس نے دوبارہ دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا اور ہماری طرف گھوم کر ہمیں سلام کر کے بغیر کچھ کہے سنے ایک طرف موجود چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔

میں فاروقی کی معیت میں گھر کے غالباً ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ جہاں بے چین و بے قرار بانو اپنی بانہیں پھیلائے میری منتظر تھی۔ آج اس نے تمام شرم و حیا بالائے طاق رکھی اور بے اختیار آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میں خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ فاروقی کی موجودگی میں اس سے کسی ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں اس سے الگ ہوا تو فاروقی کمرے سے جا چکا تھا۔ بانو نے بے چینی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آرام دہ صوفے پر میرے ساتھ ہی ڈھیر ہو گئی۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟'' اس نے قریباً رومانسی آواز اور بڑے جذباتی لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''کیا بتاؤں تمہیں بانو.....'' یہ کہہ کر میں نے اسے مختصراً اپنی بپتا سنا دی اور آخر میں کہا۔ ''شاید قدرت نے میرے پاؤں ٹھیک کرنے کے لئے مجھے اس سنیاسی بابا کے ٹھکانے تک پہنچایا تھا۔ دیکھ لو اب میں مکمل بلکہ پہلے سے زیادہ صحت یاب ہوں.....'' میں مسکرایا تو اس نے دوبارہ میرے دونوں ہاتھ جذباتی انداز سے تھام لئے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی کہانی سے کانتا کو غائب کر دیا تھا۔ خدا جانے اس کی وجہ کیا تھی؟ لیکن بانو کے سامنے اس کا ذکر مناسب نہ لگا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''کچھ نہ پوچھو افضل!.....'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا..... ''سڑک تک پہنچنے میں تو مجھے زیادہ وقت نہیں لگا لیکن وہاں سے لفٹ لے کر تم تک آنے میں قریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ایسی جگہ تھی جہاں سے ہمارے اپنے لوگ وہاں تک پہنچنے میں کم از کم ڈھائی گھنٹے لگا دیتے۔ اس طرح بہت

دیر ہو جاتی۔ بہرحال ایک جیپ میں سوار دو نوجوان میری مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ جب ہم کار تک پہنچے تو تم غائب تھی اور وہاں گولیوں کے ایک دو خول موجود تھے۔ پھر مجھے ایک جگہ خون کے دھبے بھی دکھائی دیئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی زیادہ پریشان ہوئی تھی لیکن کوئی طاقت مجھے کہہ رہی تھی کہ تم زندہ ہو اور کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو.....'' بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں چپ کروانا چاہا تو وہ اچانک جذباتی ہو کر مجھ سے لپٹ گئی اور رومانسی آواز میں اس بات کا گلہ کرتی رہی کہ اس کی نالائقی کی وجہ سے مجھے اتنے دن تک مصیبت اٹھانی پڑی۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس لمحے وہ اداکاری کر رہی تھی یا واقعی اس کیفیت کا شکار تھی کیونکہ آج تو مجھ اس کی ہر بات دھوکہ اور ہر حرکت چال ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے الگ کیا۔

''نہیں بانو! زندگی میں دوبارہ کبھی ایسا نہ سوچنا۔ مجھے اس پر تکلیف ہوگی جو بھی ہوا اس میں تمہارا یا میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب آزمائش ہے۔ اگر میں اس حملے سے زندہ بچ کر آ گیا تھا تو اس مصیبت کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔'' میں نے اسے ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔

اتنے میں ایک نوجوان چائے کی ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے اور بانو کو سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

''میں نے ناشتہ کر لیا تھا۔ اللہ بھلا کرے بے چارے سردار صاحب کا..... تم سے گفتگو کے بعد تو وہ مجھ پر بہت زیادہ ہی مہربان ہو گیا تھا.....'' میں نے مسکراتے ہوئے بانو سے کہا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

''افضل کیا کروں کبھی کبھی اپنی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خدا جانے وہ بے چارہ مجھے الہ آباد میں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔ میں نے اسے اپنا نام ٹھکانہ سب غلط بتایا ہے۔''

''اپنی اپنی قسمت ہے بھئی..... اب ہر کوئی تو.....'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ نامکمل چھوڑ کر اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہ سمٹ کر رہ گئی۔

اس وقت میں صرف سونا چاہتا تھا لیکن بانو کے ضد ہونے پر میں نے چائے اور ایک دو بسکٹ زہر مار کئے۔ پھر غسل خانے کا رخ کیا۔ جہاں سے اپنا حلیہ اور کپڑے درست کرنے کے بعد

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں آرام دہ بستر میرے لئے تیار تھا۔ میں بستر پر گرا اور اگلے ہی لمحے نیند کی دیوی کی بانہوں میں جھولنے لگا۔ جہاں کانتا اپنی اداس آنکھوں اور سوگوار چہرے کے ساتھ میری منتظر اور سوالیہ نشان بنی موجود تھی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں اسے چھوڑ کر چوروں کی طرح کیوں بھاگ آیا ہوں۔ وہ تو خواب تھا..... ختم ہو گیا..... سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج بھی کانتا کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ بیدار ہونے پر سب سے پہلے بھوک کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ جہاں ایک کونے میں دھری کرسی پر ایک نوجوان بیٹا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دوسرے کمرے سے ٹی وی اور لوگوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مجھے باہر آتے دیکھ کر اس نوجوان نے مجھے سلام کیا اور کسی کو مطلع کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی بانو اور کمانڈر صاحب میرے سامنے موجود تھے۔ کمانڈر صاحب مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ انہوں نے گزشتہ ایکشن میں میرے زندہ بچنے کو معجزہ اور جنگل سے فرار ہو کر یہاں تک آنے کو اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام قرار دیا۔ میری خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ مجھے اور بانو کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہو گئے جہاں ہم تینوں ہی موجود تھے۔

''میرے خیال سے تم پہلے کھانا کھا لو..... اس کے بعد ایک اہم میٹنگ ہو گی۔'' انہوں نے بانو کو کھانا لگانے کی ہدایت کرتے ہوئے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگ گیا۔ اس گھر کے غالباً سب سے بڑے کمرے میں زمین پر دسترخوان بچھا کر سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ اسی جگہ کمانڈر صاحب نے میرا تعارف ''شیر خان'' سے کروایا۔ ظاہر ہے یہ اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ ہم سب یہاں دوسرے ناموں سے موجود تھے اور شاید ہی کمانڈر صاحب کے علاوہ کسی کو دوسرے کے اصلی نام کا علم ہو؟ نجانے کیوں شیر خان مجھے پسند نہیں آیا۔ اس کی شکل پر ہی لکھا ہوا تھا کہ یہ کوئی دو نمبر قسم کا بندہ ہے۔ بعد کے حالات نے میرے خدشات کو اس طرح سچ ثابت کیا کہ مجھے اپنی چھٹی حس کی صداقت پر پھر کبھی شک نہیں گزرا۔

''حالات ہمارے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں..... جب سے ان لوگوں کو امریکنوں نے جدید آلات دیئے ہیں۔ ان کی کامیابی اور ہماری ناکامی کا تناسب بڑھنے لگا ہے۔ تین روز پہلے ہمارے دو اہم ساتھی گرفتار ہوئے ہیں جن کی رہائی کے لئے ہمیں کوئی بڑا آپریشن کرنا ہو گا۔'' کمانڈر شمشو بھائی نے ہمیں مخاطب کیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

''جو حکم ہو کمانڈر صاحب، ہم انشاء اللہ جان کی بازی لگا کر اس پر عمل کریں گے اور اپنے ساتھیوں کو ان ظالموں کے چنگل سے نجات دلائیں گے۔'' شیر خان نے بظاہر بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے عامر خان؟''

کمانڈر صاحب نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ کا خیال بجا ہے کمانڈر صاحب''۔

میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس ضمن میں ہم نے ایک منصوبہ ترتیب دیا ہے چونکہ اس میں زیادہ اہم کردار تمہارا اور شیر خان کا ہے اس لئے تم دونوں غور سے سن لو۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک بڑا کاغذ نکال کر زمین پر بچھایا اور اپنا منصوبہ بتانے لگے۔ جس کے مطابق میں نے ایک اہم ہوٹل پر قبضہ کر کے وہاں کے لوگوں کو یرغمال بنانا تھا۔ ان یرغمالیوں کے بدلے حکومت سے اپنے دو اہم ساتھیوں کو رہا کروانا تھا.....!!

شمشو بھائی نے بڑی تفصیل اور مکمل جزئیات کے ساتھ سارا منصوبہ ہمیں سمجھایا اور پھر استفہامیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک بات کا مجھے بہر حال اعتراف کرنا ہے کہ جس تفصیل سے یہ نقشہ بنایا گیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ اپنا ''ہوم ورک'' مکمل کرتے ہیں۔

''چار چار کے گروپ میں مجاہدین کام کریں گے۔ ایک گروپ کی کمانڈ عامر بھائی اور دوسرے کی شیر خان کریں گے لیکن مشترکہ کمانڈ عامر بھائی کے ہاتھ میں ہو گی''..... انہوں نے باری باری میری اور شیر خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تعمیل ہو گی کمانڈر صاحب.....'' شیر خان نے بالکل ایسے لہجے میں جواب دیا۔ جیسے وہ اپنے کسی ''باس'' سے بات کر رہا ہو..... نجانے کیوں! مجھے اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ آپ کے ساتھ جانے والے تمام ساتھی ''ریکی'' کر چکے ہیں۔ آپ سے ان کی ملاقات آخری مراحل میں کروائی جائے گی۔ ابھی عامر بھائی (میں) ''ہوٹل ریجنس میں ریکی'' کرنے جائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

"ٹھیک ہے کمانڈر صاحب۔" میں نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

"باقی تفصیلات آخری بریفنگ میں دے دی جائیں گی۔" میں اب چلوں گا۔ کمانڈر صاحب نے کہا اور اٹھ کر ہم سے باری باری بغل گیر ہونے کے بعد رخصت ہو گئے۔ ہم بھی اپنے اپنے کمرے کی طرف آرام کرنے چلے گئے۔

میرے کمرے میں تھوڑی دیر بعد ہی حسب توقع بانو آ گئی۔ جس نے گرم جوشی سے معانقہ کیا اور مجھے اس اہم مشن کا کمانڈر منتخب ہونے پر مبارکباد بھی دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"کھانا میں نے اسی کمرے میں لانے کا کہہ دیا ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گی۔" اس نے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔

"جیسے تمہاری مرضی....." میں نے مغلوب جذبات سے کہا۔

بانو نے مجھے ہوٹل رٹجنس سے متعلق بتانا شروع کیا اور بتایا کہ اس "فائیو سٹار" ہوٹل میں ملک کی مقتدر ہستیاں جمع ہوتی ہیں۔ آج کل وہاں چونکہ جواہرات اور جیولری کی نمائش بھی چل رہی ہے اس لئے لوگ زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے لئے اپنے مجاہدین کو رہا کروانے کا یہ سنہری موقع ہے۔

"میں بے گناہ سویلین کو....." میرے دل کی بات بے اختیار زبان پر آ گئی اور میں نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"افضل تم بہت بھولے ہو۔ نہیں جانتے ہمارا واسطہ کس خبیث دشمن سے ہے۔ یہ لوگ انسانیت، اخلاق، مذہب، قانون کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں ان کی ہی زبان میں جواب دینا پڑتا ہے۔ اسے ہماری مجبوری جان لو۔ اگر ہم سرکاری عملے کو اغوا کریں تو حکومت کبھی ہمارے سامنے نہیں جھکے گی لیکن ان لوگوں کے یرغمال بننے کا بوجھ اس سے برداشت نہیں ہو گا کیونکہ ان کے سرمایے پر تو سارا کاروبار مملکت چل رہا ہے۔" اس نے کچھ اس انداز سے بتایا کہ میں واقعی اس کا قائل ہو گیا۔

رات دیر تک وہ میرے ساتھ رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سو گیا، صبح اٹھ کر نماز ادا کی اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک مجاہد مجھے بلانے آ گیا۔ میں نے رات کو دی گئی ہدایات کے مطابق بڑا قیمتی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور خاصا معزز دکھائی دے رہا تھا۔

ہوٹل رٹجنس میں مجھ جیسا بندہ تو داخل ہوتے ہی احساس کمتری کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایسا

سنگ مرمر کا محل نما ہوٹل میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اور اگر کبھی عملی زندگی میں دیکھ لیتا تو شاید اس کے نزدیک پھٹکنے کا تصور بھی نہ کر سکتا لیکن اب میں بانو کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں موجود تھا۔

بانو خود گاڑی چلاتی ہوٹل کی پارکنگ تک آئی تھی جبکہ میں اس کے ساتھ بڑھ کر بیٹھا تھا۔ وہ تمام راستے مجھے نارمل رہنے کی تلقین کرتی آئی تھی۔

"اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو۔ کبھی اس سے پہلے "تاج" میں جا چکے ہو ناں....." اس نے مجھے بھارت آمد پر دہلی ہوٹل جانے کا واقعہ یاد دلایا۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں....." میں نے بظاہر اسے تسلی دلاتے ہوئے کہا جبکہ ابھی تک خود میں اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

میں تو سارے راستے ہی سوچتا آیا تھا کہ آخر یہ جہاد کا کون سا انداز ہے؟ لیکن ونتھر کی قید سے رہائی کے بعد جب میں دوسری مرتبہ افغانستان کے میدان جہاد میں اترا تھا تب ہی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ اب مجاہدین نے اپنا انداز جہاد بالکل تبدیل کر لیا ہے اور وہ جہاد اور دہشت گردی کو آپس میں گڈمڈ کرنے لگے ہیں۔ میرے دل و دماغ نے کبھی یہ بات تسلیم نہیں کی تھی کہ ہم معصوم اور بے گناہ شہریوں کو یرغمال بنا کر ان کی جان خطرے میں ڈالیں اور حکومت کو بلیک میل کر کے اپنے مقاصد حاصل کریں لیکن حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ اب اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے۔

بانو کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ ایک مرتبہ اس کی طرف دیکھنے والے کے لئے اپنی نظریں اس سے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ آج بطور خاص اس نے اپنی جسمانی نمائش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور انگریزی فلموں میں دکھائی دینے والی کسی فاحشہ کی طرح یہاں دندناتی پھر رہی تھی۔ میں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ اسی کی تربیت کے مطابق چل رہا تھا۔ بانو نے مجھے ہوٹل کی لابی سے رہائشی کمروں تک اور وہاں سے ہوٹل کے تمام ڈائننگ ہال، کانفرنس روم داخلے اور نکلنے کے تمام راستے بڑی آسانی سے دکھا دیئے تھے۔ گو کہ کمانڈر شمشو بھائی نے جو نقشہ اس ہوٹل کا ہمیں دیا تھا۔ اس میں اتنی تفصیلات موجود تھیں کہ صرف اس نقشے کو ازبر کرنے کے بعد اب سب کچھ [illegible] نقشہ [illegible] اور میں ذہنی طور پر بددلی ہی سے سہی اس ایکشن کے لئے تیار تھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مجھے یہ تو علم نہیں کہ بانو کا آنا جانا یہاں لگا رہتا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ آئی تھی لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ ہوٹل کے جس حصے میں بھی گئی وہاں کے متعلقہ سٹاف نے اسے مکمل پروٹوکول دیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ فی الوقت میں اس پر تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

''کافی شاپ'' سے فارغ ہو کر ہم ہوٹل کے ایک ہال میں لگی اصلی اور نقلی جیولری کی نمائش دیکھنے لگے۔ یہاں شہر بھر کے عمائدین اپنی زیورات و جواہرات سے لدی پھندی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔ سارا ہال خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ لکھوں روپے مالیت کے ان زیورات کو یہاں موجود خواتین معمول کی خریداری طرح خرید رہی تھیں۔ چاروں طرف آدھ ننگے جسم والی ہوٹل کی ویٹرس ان کے لئے مشروبات کی ٹرے لئے گھوم رہی تھیں۔ میں نے بھی بانو کی تقلید میں ایک ویٹرس کی ٹرے سے جوس کا چھوٹا سا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ان مشروبات میں جوس سے شراب تک ہر شے موجود تھی۔ ہم جیسے گدھوں کی تعداد یہاں آٹے میں نمک کے برابر تھی جو جوس سے دل بہلا رہے تھے ورنہ تو قریباً ہر دوسری عورت اور مرد نے بیئر یا پھر شراب کا جام تھام رکھا تھا۔ دنیا و مافیا سے بے خبر ان لوگوں کو علم ہی نہیں تھا کہ ان پر اگلے دو تین روز میں کیا قیامت بیتنے والی ہے۔

اب ہم دونوں لنچ کے لئے جا رہے تھے۔ بانو نے مجھے یہاں ''بوفے'' کے متعلق بتایا۔ اس طرح میں اپنی مرضی کا کھانا کھا سکتا تھا ورنہ تو یہاں سے بے شمار ایسی الم غلم چیزیں موجود تھیں جن کے شاید زندگی میں نام ہی میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

حالات سے سمجھوتہ شاید انسان کی فطرت ہے۔ میں پہلے پہل تو یہاں حلال حرام کے چکر میں ضرور پڑا تھا لیکن اب اس سے نکل آیا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو مرغی کھانے جا رہا ہوں۔ اسے ''جھٹکے'' سے کاٹا گیا ہے یا پھر چھری سے حلال کیا گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری بھوک بھی اب چمک اٹھی تھی اور ان لوگوں نے دنیا کے ہر ملک کے اہم کھانوں کے جو خوان سجائے ہوئے تھے وہ اچھے بھلے بندے کو ندیدہ بنانے کے لئے کافی تھے۔ بانو نے تو ہلکا پھلکا کھانا ہی کھایا لیکن میں نے اسے شادی بیاہ کا کھانا سمجھ کر ساری کسر نکال لی۔

شاید میری تربیت کے لئے یہاں کے ماحول سے مکمل آشنائی بہم پہنچانے کے لئے ہی بانو نے قریباً آدھا دن میرے ساتھ یہاں گزارا۔ سارے ہوٹل کا شاید ہی کوئی ایسا کونہ تھا جو ہم نے نہ دیکھا ہو۔ اب مجھے واقعی سارے راستے ازبر ہو گئے تھے اور یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایمرجنسی کی

صورت میں بھی کس کس دروازے کو کنٹرول کرنا ہے اور یہاں سے فرار کے ممکنہ راستے کون کون سے ہیں؟

شام ڈھل رہی تھی جب ہم یہاں سے رخصت ہوئے۔ گاڑی حسب سابق بانو چلا رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ مجھے دہلی کے ایک پوش علاقے میں موجود ایک لگژری فلیٹ پر لائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان مقامات کے اصلی نام نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی برائے مہربانی آپ اس چکر میں پڑیں۔ بس یوں جان لیں کہ یہ دہلی کا مہنگا ترین علاقہ اور شاید ''وی آئی پی'' سے بھی اوپر کی سطح کے لوگوں کے رہنے والے فلیٹ تھے۔

انتہائی جدید اور جاذب نگاہ ان فلیٹس کو چار بلاکس میں بنایا گیا تھا اور ہر ایک کی الگ الگ پارکنگ رکھی گئی تھی۔ یہاں باوردی گارڈ چاروں طرف موجود تھے۔ جس سے اس جگہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہماری گاڑی جہاں سے بھی گزرتی۔ مستعد گارڈ ہاتھ اٹھا کر ہمیں آداب کہتے تھے۔ پہلے سے مخصوص جگہ پہنچ کر بانو نے گاڑی پارک کی اور ہم دونوں باہر آ گئے۔ بانو کی نشست و برخاست سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی بڑے خاندان کی نوابزادی ہے اور کیا مجال جو اس کی کسی بھی حرکت سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ دراصل اداکاری کر رہی ہے۔ کمال کی ایکٹریس تھی بانو.....

ہم دونوں فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ بانو نے اپنے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ اندر کا ماحول کیسا تھا؟ یوں محسوس ہوا جیسے ہم ''راجا اندر'' کے دربار میں آ گئے ہوں۔ دنیا کا قیمتی ترین فرنیچر اور دیواروں پر لگی انتہائی مہنگی پینٹنگز دیکھ کر یہاں کے مکینوں کی امارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے تو یہاں موجود قالین پر چلتے ہوئے اپنے قدم زمین میں دھنسنے کا احساس ہوتا تھا۔ ایک آرام دہ صوفے پر جیسے ہی میں ڈھیر ہوا۔ اچانک بانو مجھ پر آن گری۔

کوئی عقل کا اندھا بھی سوچ سکتا تھا کہ اس کی یہ حرکت دانستہ ہے۔ اس نے جذباتی انداز میں مجھے دبوچ لیا اور میں بے بسی سے اپنے جذبات کا مغلوب بن کر اس کی خواہش کے مطابق رد عمل ظاہر کرتا رہا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

خدا جانے اسے کیسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں واقعی کچھ سوچ بھی رہا ہوں۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''یہاں کے مجاہدین بہت امیر دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے تو جہادی زندگی پہاڑوں اور جنگلوں ہی میں گزار دی۔ کبھی ڈھنگ سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ مجھے نہیں یاد بانو کہ میں نے دوران جہاد کبھی چارپائی پر رات گزاری ہو۔'' میرے دل کی بات بے اختیار زبان پر آ گئی۔

''بھئی! اپنی اپنی قسمت ہے......'' بانو نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ایک بات پوچھوں بانو...... بُرا تو نہیں مناؤ گی؟......'' میں نے بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''افضل! خدا کے لئے مجھ سے اجازت لے کر کوئی سوال نہ کیا کرو؟...... تمہیں کب یقین آئے گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟''...... اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''بانو! اتنا پیسہ...... میرا مطلب ہے......'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے وہاں موجود چیزوں کی نشاندہی کی...... میرا مطلب ہے...... تم سمجھ رہی ہو ناں...... کہاں سے آتا ہے تمہارے پاس؟...... میں نے **جھجکتے** ہوئے بمشکل اپنا سوال مکمل کیا۔ ادھر بانو کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

''ڈرگ منی سے''...... اس نے انتہائی سنجیدگی سے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے کہا۔

''میں سمجھا نہیں''...... میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔

''اوہو! اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ میں کوئی اجنبی زبان نہیں بول رہی۔'' بانو کی سنجیدگی برقرار تھی۔

میں اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''افضل!'' اس نے اچانک میرے دونوں کندھوں پر حسب سابق ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا...... ''ہمیں کسی ملک سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہاں کے مسلمانوں کی حالت ناقابل بیان ہے جو اس قابل ہیں کہ ہماری کچھ مدد کر سکیں...... ان کا شمار ہمارے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ افضل یہاں کوئی مسلمان اس وقت تک اہم معاشرتی حیثیت حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک وہ ''نیم ہندو'' بن کر زندگی نہ بسر کرے...... شاید تمہارے لئے یہ حیران کن بات ہو کہ ان لوگوں نے جو نام کے مسلمان ہیں محض ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اپنے گھروں میں مورتیاں رکھی ہوئی ہیں اور وہ ہندو تہواروں کو بالکل ہندوؤں کی طرح مناتے ہیں۔ وہ ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کے دشمن خیال کرتے ہیں۔''

اس نے اپنی بات مکمل کر کے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ''تم ہی بتاؤ۔ اس

کے علاوہ اور ہمارے پاس کون سا راستہ ہے؟ میں نہیں چاہتی تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ وہاں الہ آباد میں جس گروپ نے ہم پر حملہ کیا تھا اس کے ساتھ ہماری اسی مسئلے پر لڑائی چل رہی ہے۔ انہوں نے ہمیں ڈرگز کی رشوت دے کر ہم سے کچھ اہم ''مائیکرو فلمیں'' حاصل کرنے کا سودا کیا تھا۔ ہم ایسا کرتے رہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا کام نہیں ہو سکا۔ جس پر وہ ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے۔ تمہارے غائب ہونے کے بعد ہمارا ان کے ساتھ بڑا معرکہ ہوا تھا۔ ہمارے دو ساتھی اور ان کے دس آدمی مارے گئے۔ جس کے بعد ہم نے الہ آباد خالی کر دیا ہے اور اب شاید کبھی ادھر کا رخ نہ کریں۔''

بانو کے اس جواب نے میرے تو چودہ طبق روشن کر دیئے لیکن مجھے اس بات کی کچھ سمجھ ضرور آ گئی کہ ان کے لئے اپنے جہاد کو جاری رکھنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔

کہاں سے لاتے اتنا سرمایہ؟

میں نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی ہماری تربیت یہ کہتی ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے متعلق کوئی تجسس نہ رکھیں۔ اسی میں ہم سب کی بقا ہے۔ میں خاموش اور قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ معلوم نہیں اس مرحلے پر بانو نے یہ ''دھماکہ خیز انکشاف'' کر کے میری آزمائش کی تھی یا پھر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بکرا قربانی کے لئے مکمل تیار ہے یا ابھی کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہے۔

''کیا بات ہے افضل؟...... برا تو نہیں منایا تم نے؟''

اس نے اچانک ہی موڈ بدل کر میرے ساتھ چپکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا......'' میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں۔ نجانے اس مرحلے پر کیوں مجھے پاکستان کے اس سرحدی ایجنسی کا واقعہ یاد آ گیا۔ جہاں میں نے خود اسلحہ کی آڑ میں ڈرگ سمگل ہوتے دیکھی تھی......!! مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، اسے کیا کہوں؟ اس کا کوئی بھی جواز رہا ہو لیکن یہ میرے لئے قابل برداشت نہیں تھا۔ کم از کم میں منشیات سمگل کرنے سے مر جانا زیادہ احسن جانتا۔

''بانو...... میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں نے تمام دروازے بند دیکھ کر ہی یہ راستہ اختیار کیا ہو گا...... لیکن اس مرحلے پر میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں اس حوالے سے کوئی مسئلہ کھڑا ہو؟'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''کہو افضل...... کہو......''

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''بانو! مجھ سے کبھی یہ امید نہ رکھنا کہ میں ڈرگ سمگل کرنے میں تمہارے کام آؤں گا..... حالات کتنے ہی بدتر کیوں نہ ہوں۔''

''میں جانتی ہوں افضل..... مجھے تمہارے متعلق نہ کبھی کوئی غلط فہمی رہی ہے نہ ہی میں کسی خوش فہمی کا شکار ہوں..... ممکن ہے میں یہ راز تم پر کبھی ظاہر نہ کرتی لیکن الہ آباد کے واقعہ کے بعد سے تم جس اضطراب کا شکار ہو۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے..... اور ہاں یہ بات بھی جان لو..... ہمارے مجاہدین ساتھی اس غلیظ دھندے میں نہیں پھنسے..... یہ سلسلہ بس دو تین لوگوں تک محدود ہے۔ ہم اس ذریعے سے رقم حاصل کرتے اور اس سے اسلحہ خریدتے ہیں۔ ہمارے لئے جدید اسلحے کا حصول کتنا ضروری ہے؟ اس کا اندازہ تو تمہیں ہو گیا ہو گا؟''

بانو کی وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا۔

ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے پریس سے نمٹنے سے متعلق ضروری ٹپس Tips دیں اور منصوبے کی جزئیات دہرائیں۔ پھر مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اب ہمیں کمانڈر صاحب کی طرف سے سگنل ملنا تھا جس کے بعد ہم نے باقاعدہ کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

رات گئے شمشو بھائی کی آمد ہوئی۔ وہ اکیلے ہی آئے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر وہی نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا۔ مجھے اپنا ''آپریشنل ایریا'' سمجھایا اور کہا کہ مجھے مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔ آخر میں انہوں نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ اس ہوٹل کے دو کمروں میں ہمارے چار ساتھی پہلے سے اسلحہ اور باقی ساز و سامان سمیت موجود ہیں۔ ہمیں سختی سے ہدایت کی گئی کہ ہم نے آخری لمحات تک ان کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دینا۔ البتہ وہاں سے کسی کے علم میں لائے بغیر اسلحہ حاصل کرنا ہے۔

کمانڈر شمشو بھائی نے ڈرامائی انداز میں ایک پولی تھن کا لفافہ مجھے تھمایا اور کہا کہ اس میں نیند کو بھگائے رکھنے والی گولیاں موجود ہیں جو ہمیں استعمال کرنی ہیں۔ ان کے طے شدہ پلان کے مطابق یہ آپریشن زیادہ سے زیادہ تین روز میں ختم ہو جائے گا کیونکہ جس مقتدر شخصیات کو ہم نے یرغمال بنانا ہے۔ ان کا پریشر حکومت کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ آپریشن کی تکمیل پر ہمیں کس طرح ہوٹل سے باہر آنا تھا؟ اور پولیس کی فراہم کردہ ٹرانسپورٹ سے کس طرح فائدہ اٹھانا تھا؟ اسے راستے سے کس طرح بھٹکانا تھا؟ تاکہ خفیہ تعاقب کرنے والوں کو بھی ہمارے ٹھکانوں کا

علم نہ ہو سکے۔ یہ تمام تفصیلات طے پا چکی تھیں کہ ہمیں کون کون سے راستے اختیار کرنے تھے؟ کہاں سے کہاں موڑ مڑنے تھے؟ اور آخر میں کہاں سے ہمارے ساتھیوں نے ہمیں لے کر غائب ہونا تھا۔

''اس آپریشن کی کامیابی ہمارے لئے ناگزیر ہے، عامر بھائی.....'' کمانڈر صاحب نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

''کمانڈر صاحب ہم جان کی بازی لگا کر اسے کامیاب کریں گے.....'' میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

''بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ہر روز عثمان بھائی کی انگلیوں کی ایک ہڈی توڑ رہے ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس دنوں میں انہوں نے تشدد کر کر ذریعے ہمارے پانچ ساتھی شہید کر دیئے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی ان کے لواحقین کو نہیں دے رہے کیونکہ تشدد سے وہ ناقابل شناخت ہو گئی ہیں۔'' بانو نے میرے جذبات کو مزید بھڑکایا۔

''ٹھیک ہے کل آپ کی ملاقات شیر خان اور باقی ساتھیوں سے ہو جائے گی جس کے بعد آپ پرسوں انشاء اللہ صبح آٹھ بجے اپنے آپریشن کا آغاز کر دیں گے۔'' شمشو بھائی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

○

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

شمشو بھائی تو چلے گئے لیکن میری شامت اعمال بانو وہیں رک گئی۔ ساری رات وہ میرے دل و دماغ پر سوار رہی۔ میں نے جب بھی اسے سمجھانا چاہا۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ''جب میں نے تمہیں دل سے خاوند مان لیا ہے تو پھر تم یہ کیوں کہتے ہو؟'' میں جب اسے ''بغیر نکاح'' کے خاوند کا سوال کرتا تو وہ مسکرا کر میری بات ٹال جاتی اور یہی کہتی کہ اس مشن سے فارغ ہوتے ہی ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ ''اگر تم جنگل میں گم نہ ہو جاتے تو ہم اب تک باقاعدہ میاں بیوی بن چکے ہوتے؟''

بانو نے میری آنکھوں میں بے باکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی وہ سچ کہہ رہی ہے۔ آج بھی یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ بانو نے مجھے کتنی آسانی سے الو بنا لیا تھا۔ اگلے روز ناشتے سے کچھ دیر بعد ہی شمشو بھائی اور شیر خان آ گئے۔ شمشو بھائی نے ایک مرتبہ پھر ہوٹل کا نقشہ ہمارے سامنے پھیلا کر ہمیں طے شدہ منصوبہ بندی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ شیر خان اور اس کے ساتھیوں نے کیا کرنا ہے اور میں نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ شمشو بھائی نے بطور خاص مجھے بتایا کہ اس نوعیت کا ایکشن میرا چونکہ پہلا تجربہ ہے۔ اس لئے مجھے اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا ہوگا کیونکہ اس کھیل میں جیت اسی کی ہوتی ہے جس کے اعصاب زیادہ مضبوط ہوں۔

''کمانڈر صاحب! آپ بے فکر ہو جایئے۔ ہم عامر بھائی کو سنبھال لیں گے..... ویسے بھی یہ ہمارے کمانڈر ہیں۔ ان کی جان کی حفاظت تو ہمارا اولین فرض ہوگا ناں.....''

شیر خان نے بڑی سکارتی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا تمسخر اڑا رہا ہے اور مجھے غصہ بھی آ گیا۔ ''شیر خان! میں کسی چاکپواڑہ سے اٹھ کر یہاں نہیں آ گیا۔ بہت کچھ دیکھنے اور بھگتنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں..... جو کچھ میں نے دیکھ لیا ہے اس کا تم شاید تصور ہی نہ کر سکو

.....اور ہاں! مجھے اپنی حفاظت کرنی آتی ہے۔ میری طرف سے بے فکر رہنا کام ہونا چاہیے۔ خواہ اس کے لئے ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ جب ہم نے اپنی جانوں کا سودا اللہ سے کر لیا ہے تو پھر ایسی سوچ ہی غلط ہے.....''

میری بات سن کر شیر خان سمجھ گیا کہ کسی بھی لمحے میرا دماغ خراب ہو سکتا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کمانڈر صاحب پلیز میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ ہمارے بڑے ہیں۔ ہمارے کمانڈر ہیں۔ ہم تو آپ کے ادنیٰ سے سپاہی ہیں۔'' اس نے مجھے نارمل کرنے کے لئے کہا اور میں نارمل ہو گیا۔ انسانی فطرت بھی کیا شے ہے۔ پل میں ماشہ پل میں تولہ..... شمشو بھائی نے ایسا تاثر دیا تھا جیسے انہیں شیر خان کی یہ بات پسند نہیں آئی لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب مجھے مطمئن کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ شیر خان جینوئن بندہ ہے۔ مجھے اس کی دو نمبری بڑی واضح دکھائی دے رہی تھی لیکن مجبوری کا نام شکریہ، اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ بانو نے مجھے کچھ کرنے لائق چھوڑا ہی نہیں تھا۔

شمشو بھائی دوپہر تک ہمارے ساتھ رہے۔ ان کی موجودگی ہی میں شیر خان وہاں سے چلا گیا۔ اسے منصوبہ بندی کے مطابق ''ایکشن ٹائم'' سے پہلے اپنے ساتھیوں کو ہوٹل میں داخل کرنا اور پہلے سے طے شدہ ٹارگٹس پر قابو پانا تھا۔ اس ایکشن کا باقاعدہ آغاز میں نے کرنا تھا۔

منصوبے کے مطابق مجھے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہونا۔ وہاں بارود لگانا اور شیر خان کی مدد سے وہاں موجود تمام لوگوں کو ہال میں جمع کر کے ان میں سے کم از کم پچاس اہم لوگوں کا انتخاب کر کے انہیں آخری لمحات تک اپنے قابو میں رکھنا تھا۔ اگلے روز منصوبے کے مطابق میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ کار میں ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں عجیب سے جذبات کا شکار ہو رہا تھا لیکن مجھے یہ کام کرنا ہی تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ میرے ساتھ آنے والے تینوں ساتھی اجنبی تھے لیکن اپنے کام میں سب ماہر دکھائی دیتے تھے۔ گاڑی فاروقی چلا رہا تھا۔ جس سے میرا تعارف پہلے سے تھا۔

گاڑی ہم نے گارڈ کے اتنے نزدیک روکی کہ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے بندوق بھی نیچے گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے میرے ساتھی نے جو پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اسے بندوق اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی۔ اپنی گن سے جانے کتنی گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ میں اس کی

Uploaded By Muhammad Nadeem

گنتی نہ کر سکا کیونکہ ہمیں جلد از جلد اندر داخل ہو کر صورتحال پر قابو پانا تھا۔ گارڈ کی موت نے وہاں موجود لوگوں کو بوکھلا دیا۔ وہ خوف کے مارے چیخیں مارتے ادھر ادھر بھاگنے لگے اور میرے ساتھی ان پر گولیاں برساتے رہے۔ یہ منظر میرے لئے ناقابل بیان ہے۔ میں اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی کوئی مسلمان مجاہد ایسی گھٹیا اور گھناؤنی حرکت بھی کر سکتا ہے لیکن یہ امر واقعہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ ہو کیا رہا ہے۔ اگر بانو یا کمانڈر صاحب نے مجھے یہ بتایا ہوتا کہ وہاں بے گناہ سویلین کا قتل عام ہونا ہے تو میں کبھی اس گھٹیا کھیل کا حصہ نہ بنتا لیکن اب میرے لئے یہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ جیسے ہی میں باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ پولیس یا وہاں موجود گارڈز میں سے کسی نہ کسی کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ ”یا اللہ ....کیا کروں؟“ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میرے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا لیکن ابھی میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہوا تھا کہ میں اپنے غصے کا بھی کھلم کھلا اظہار کر سکوں۔ مجھے اپنی جان بہرحال عزیز تھی۔ یہ لوگ جو بے گناہ سویلین کو مار رہے تھے۔ دوسرے گروپ میں شامل تھے۔ جس کی کمان شیر خان کر رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے تینوں نوجوان اس میں شامل نہیں تھے۔ ہم اپنے منصوبے کے مطابق دو گروپس میں بٹ گئے۔ میں نے فاروقی کے ساتھ مل کر بمشکل چار منٹ میں ہوٹل کے مین گیٹ اور دوسرے ممکنہ اخراج کے دروازوں پر بارود نصب کر دیا جبکہ شیر خان اور اس کے ساتھی اپنے گھناؤنے کام میں مصروف رہے۔ انہوں نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل کے پانچ چھ ملازمین کو مار ڈالا اور ان کی لاشیں بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے مین دروازے کے سامنے پھینک آئے۔ یہاں سینکڑوں لوگ موجود تھے۔ قیمتی پتھروں اور زیورات کی نمائش چل رہی تھی۔ شیر خان اور اس کے ساتھی ان کو خوفزدہ کرنے کے لئے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے انہوں نے شراب پی رکھی ہے یا پھر وہ جنون میں اندھے ہو کر یہ کام کر رہے ہیں۔ بظاہر ان کا مقصد یہاں موجود لوگوں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ جس میں انہیں توقع سے بڑھ کر کامیابی ہو رہی تھی۔ درجنوں عورتیں، بچے، بوڑھے چیخیں مارتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چند منٹ میں ہی شیر خان اور اس کے ساتھیوں نے اس شاندار فائیو سٹار ہوٹل کو کباڑ خانہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ جہاں لوگ اپنی جان بچانے کے لئے کرسیوں اور میزوں کے نیچے خوفزدہ مرغیوں کی طرح دبک کر بیٹھتے تھے۔ میرے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا لیکن قدرت کا نظام بڑا ہی نرالا ہے۔ وہ انسان کو اس کی بے بسی اور اوقات کا احساس ضرور دلاتی ہے۔

افسوس میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری حالت تو یہاں ایک ایسے روبوٹ کی سی تھی جسے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا کنٹرول کس کے پاس ہے۔ جب معاملہ حد سے باہر ہونے لگا تو میں نے غصے میں اپنی گن سے چھت کی طرف پندرہ بیس گولیاں فائر کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”خبردار! اگر کسی نے حکم کی خلاف ورزی کی.........“ میرے مخاطب وہاں موجود سب ہی لوگ تھے۔ شیر خان اور اس کے ساتھیوں نے حیرت، تعجب اور غصے کے ملے جلے جذبات سے میری طرف دیکھا اور مستعد ہو گئے۔

”سب کو اسی جگہ اکٹھا کرو.........فوراً۔“ میں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا حکم جاری کیا۔

چند ہی منٹ میں وہاں قریباً ساٹھ ستر خواتین، مرد اور بچے موجود تھے۔ میں نے شیر خان کے تین بندوں کو ان پر نگران بنایا۔ انہیں اطمینان سے وہیں بیٹھنے کے لئے کہا اور بتایا کہ وہ سب یرغمال ہیں۔ ہمارا تعلق جہادی تنظیم سے ہے اگر کسی نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ شیر خان میری طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے بھوکے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا ہو۔

”خیال رکھو ان کا.........“ میں نے وہاں موجود تین چار ویٹروں کو مخاطب کیا کیونکہ یرغمال خاصے پریشان اور کچھ ان میں سے زخمی بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ابھی بمشکل اس طرف سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ہوٹل کی چھت پر موجود ساتھی نے پولیس کی آمد کا پیغام دے دیا۔ میں نے شیر خان کو اشارے سے بلا کر آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے.........ہم تیار ہیں۔ جو حکم کمانڈر صاحب.........“

اس نے اس طرح بات کی جیسے اس ساری کارروائی کا ذمہ دار میں ہی ہوں اور وہ بادل نخواستہ میرے حکم کی پابندی کر رہا ہے۔ مجھے شمشو بھائی نے پہلے ہی سے پریس اور پولیس کے ساتھ مذاکرات اور بات چیت کے حوالے سے بریفنگ دی ہوئی تھی اور بتایا تھا کہ آدھی لڑائی ہم ان دونوں کو فتح کر کے جیت سکتے ہیں۔ میرے لئے گو کہ یہ پہلا تجربہ تھا کیونکہ اس سے پہلے ہم نے دشمن کے خلاف صرف گوریلا کارروائیاں کی تھیں۔ آمنے سامنے کی لڑائی کی تھی اور ہم اسے ہی جہاد سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب بندوں کو اغوا کر کے اپنے مطالبات منانا جہاد سمجھا جانے لگا اور ہمیں اس کی تربیت دی گئی۔ اب مجھے اس طرح بے گناہ شہریوں کو یرغمال بنا کر جہاد

Uploaded By Muhammad Nadeem

کرنا تھا جو میرے لئے واقعی بڑا تلخ تجربہ تھا۔

گیٹ پر موجود ساتھیوں نے پولیس آفیسر کو تلاش لے کر اس کا پستول لینے کے بعد اندر آنے دیا تھا۔ درمیانی عمر کے اس پولیس آفیسر کے ساتھ چند منٹ بعد میرا مکالمہ شروع ہو گیا۔

''کون ہو تم؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' غصے میں بوکھلائے پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھا!

''ہم کون ہیں اس کا جواب تمہیں مل جائے گا..... لیکن یہ بات یاد رکھنا اگر ہمارے مطالبات پورے نہ ہوئے یا پھر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو یہاں موجود شہر کے تمام وی آئی پیز ایک ایک کر کے مارے جائیں گے''..... میں نے پہلے سے طے شدہ اور تیار کردہ جواب دیا۔

''ان لوگوں کی طرح..... جن کی لاشیں وہاں ہال میں پڑی ہیں۔''

شیر خان نے مداخلت کی اور اسے اشتعال دلا دیا۔ میں حیران رہ گیا کہ شیر خان کو یہ بات کہنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ کمانڈر میں تھا اور شمشو بھائی نے مجھے ہی اس کا اختیار دیا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کا ٹینٹوا دبا دوں لیکن کیا کرتا، مجبور تھا۔ اس مرحلے پر اس کو کچھ کہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں تلملا کر رہ گیا۔

''تم نے بے گناہ شہریوں کو مار ڈالا؟'' غصے سے کھولتے ہوئے پولیس آفیسر نے پوچھا۔

''غیر ضروری سوالات نہیں.....'' میں نے اس مرتبہ شیر خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جواب دے کر اسے چپ کروا دیا۔

''بہت برا کیا تم لوگوں نے..... یاد رکھنا تم بچ نہیں پاؤ گے۔ ہم نے ہر ممکن راستے کو گھیر لیا ہے۔'' اس کا غصہ بے قابو ہو رہا تھا۔

''اچھا!.....'' طنزیہ لہجے میں شیر خان نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

وہ کوئی سمجھدار پولیس آفیسر تھا جسے شاید ایسی صورتحال سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی خود کو نارمل کر لیا اور سمجھانے کے انداز میں مجھے مخاطب کیا کیونکہ وہ شیر خان جیسے اجڈ سے تو کوئی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ ''تم مجھے کچھ سمجھدار معلوم ہوتے ہو..... دیکھو! اب تک جو کچھ ہو چکا، اسے بھول جاؤ اور سرنڈر کر دو..... میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ سرنڈر کرنے پر تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی..... میں اس کا وعدہ کرتا ہوں.....''

''اگر ہم سرنڈر نہ کریں تو؟'' شیر خان نے پھر منہ ماری کی۔

''تم میں سے کمانڈر کون ہے؟'' اس نے اچانک ہی نفسیاتی حملہ کیا۔ بہت چالاک پولیس آفیسر لگتا تھا۔

شیر خان نے کچھ بکنے کے بجائے میری طرف اشارہ کر دیا۔

''میرے خیال سے پھر اسے ہی مجھ سے بات کرنی چاہیے۔ تم لوگ خود کو مجاہدین کہتے ہو اور ڈاکوؤں کی طرح ٹریٹ Treat کر رہے ہو؟ کوئی ڈسپلن نہیں تمہارا..... ہم نے تو تمہارے متعلق بڑی باتیں سن رکھی ہیں.....'' اپنی بات کا ردِعمل اس نے میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی کیونکہ میں نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ زیادہ دیر یہاں رکا رہا تو کہیں ہم دونوں ہی آپس میں نہ الجھنے لگیں کیونکہ شیر خان جیسے بدتمیز شخص سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی تھی۔ ''دیکھو مسٹر..... ہم کون ہیں؟ کیسے ہیں؟ تمہیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں..... سارے ہوٹل میں بارود نصب ہے جو ایک بٹن دبانے پر اسے ملبے کا ڈھیر بنا دے گا۔ میرے خیال سے یہاں موجود سوا ڈیڑھ سو معززین شہر کے اس کے ساتھ ہی ملیا میٹ ہو جانے کا نقصان شاید تم برداشت نہ کر سکو۔ تمہاری نوکریاں داؤ پر لگی ہیں..... یہ لفافہ لے جاؤ اور ہمارا وقت ضائع نہ کرو.....'' میں نے اسے بظاہر اپنے اعصاب مضبوط ہونے کا تاثر دینے کے لئے یہ بات کی تھی۔ ورنہ تو میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ میں اندر سے کتنا کمزور ہو رہا ہوں کیونکہ اس نوعیت کی مہم جوئی کے لئے میں ذہنی طور پر کبھی تیار ہی نہیں تھا یہ تو بانو کے چاؤ چونچلے تھے جنہوں نے مجھے اس غلاظت میں دھکیل دیا تھا۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی..... ویسے میں نے اصول کی بات کی تھی کمانڈر ایک ہونا چاہیے۔ آخر اٹھائی گیروں اور آپ لوگوں میں کوئی تو فرق ہونا چاہیے ناں.....''

جاتے جاتے بھی وہ اپنا وار کرنے سے نہیں چوکا.....

''اب تم جاتے ہو یا.....'' میں نے قدرے غصے سے کہا۔ شیر خان نے اس کی طرف بندوق تان لی۔

''او..... کے'' اس نے کندھے اچکائے اور ہمارا خط لے کر چلا گیا۔

''میرے خیال سے وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں میں سے ایک کو بات کرنی چاہیے..... کمانڈر صاحب نے غالباً یہ کام میرے ذمے لگایا تھا''..... میں نے اس کے جاتے ہی شیر خان کو مخاطب کیا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں کمانڈر صاحب..... دراصل ان لوگوں کو دیکھ کر میرے جذبات قابو میں نہیں رہتے۔ کاش میں آپ کو بتا سکتا یہ کتنے ظالم لوگ ہیں۔ ابھی تین روز پہلے ہی انہوں نے ہمارے تین ساتھیوں کو قریباً زندہ جلانے کے بعد ان کی ادھ جلی لاشیں ہمیں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

لوٹائی ہیں'' ....شیر خان نے میرے موڈ کا اندازہ کر لیا تھا۔

''میں جانتا ہوں شیر خان ....اچھی طرح جانتا ہوں ....لیکن فی الوقت ہمیں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا ہے..........ورنہ ہم سب مارے بھی جائیں گے اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا'' ....میں نے اپنی بات مکمل کی۔

''جیسے آپ کا حکم'' ....شیر خان نے بڑی چالاکی سے مسکراتے ہوئے کہا

''ٹھیک ہے..........اپنی جگہ پر جاؤ اور خبردار! اب کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ جب تک میں اس کا حکم نہ دوں ....''میں نے اسے وارننگ کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے کمانڈر صاحب'' ....وہ نارمل رہا۔

یہ کہہ کر وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ گیا۔ میں نے ایک چکر ہوٹل کا لگا کر اپنے ساتھیوں کی پوزیشنوں کو چیک کیا اور انہیں حوصلہ دے کر اگلے ایکشن کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ممکن تھا۔ یہ بندوق سے زیادہ اعصاب کی جنگ تھی اور وہی فاتح ہو سکتا تھا جس کے اعصاب زیادہ مضبوط ہوں۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ میرا ضمیر مجھے بے گناہ شہریوں کی ہلاکت پر مسلسل کچوکے لگا رہا تھا لیکن میرے پاس خود کو مطمئن کرنے کے لئے بہرحال یہ کمزور سی دلیل موجود تھی کہ ایسا کم از کم میرے حکم پر نہیں ہوا، نہ ہی میری موجودگی میں کسی کو مارا گیا۔ میں نے تو شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو اس گھناؤنے عمل سے سختی سے روکا تھا۔ ہم نے مذاکرات کے لئے آنے والے پولیس آفیسر کے حوالے جو خط کیا تھا۔ اس میں پہلی شرط یہ لکھی تھی کہ ہم میڈیا سے براہ راست بات چیت کریں گے اور اس کا بندوبست اگلے دو گھنٹے میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اگلی شرائط پر عمل کیا جائے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بھارتی حکومت ہماری یہ ڈیمانڈ پوری کرے گی لیکن میں حیران رہ گیا جب اوپر موجود ہمارے ایک ساتھی نے مجھے ''واکی ٹاکی'' پر اطلاع دی کہ ہوٹل کے گیٹ پر میڈیا کے لوگ ہمارے منتظر ہیں۔ انہوں نے ہماری ہدایات کے عین مطابق گفتگو براہ راست نشر کرنے کا اہتمام بھی کر لیا تھا۔ میں دوبارہ ہوٹل کے دروازے پر پہنچا۔ جہاں شیر خان اپنے ایک ساتھی کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ ''ہم نے صرف تین منتخب چینل والوں کو اندر آنے کی اجازت دی'' ....اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

''اچھی طرح تلاشی لے کر اندر آنے دینا..........''میں نے جواب دیا۔

''مطمئن رہیں کمانڈر صاحب ....دروازے پر موجود تینوں ساتھی بہت ہوشیار اور سمجھدار ہیں'' ....شیر خان نے کہا۔

اس اثناء میں بھارت کے تین بڑے چینلز کے کیمرہ مین اور رپورٹر اندر آ گئے۔ ہم نے کونے میں رکھائی وی آن کیا ہوا تھا۔ جس پر ہمارے متعلق خبریں اور تبصرے جاری تھے۔ بھارتی چینلز کے اینکرز بڑے سنسنی خیز انداز میں ہمارے متعلق الٹی سیدھی معلومات دے رہے تھے۔ گو کہ وہ ایک دوسرے سے الگ انداز میں ہمارے متعلق مختلف دعوے کر رہے تھے۔ کوئی ہمارا سلسلہ کسی تنظیم سے اور کوئی کسی تنظیم سے جوڑ رہا تھا لیکن ایک بات جس پر سب کی آخر میں تان ٹوٹتی تھی۔ میرے لئے بڑی پریشان کن تھی یہ لوگ بالآخر ہمارا تعلق پاکستان کی ایک جہادی تنظیم سے قائم کر رہے تھے۔ جس کا اس سے دور دور تک بھی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اپنے متعلق یہ جھوٹی اور بے بنیاد اطلاعات سن سن کر میرا تو دماغ خراب ہونے لگا تھا لیکن ان کی تردید یا تصدیق کرنا تو الگ ہم اس حوالے سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتے تھے اس کے متعلق بڑی سخت ہدایت موجود تھی۔ میڈیا کے تینوں اینکرز بڑی تیاری سے آئے تھے۔ انہوں نے ہم سے بڑے تحت اور براہ راست سوالات شروع کر دیے اور وہاں موجود ٹی وی سکرینوں پر ہم یہ سارا منظر Live چلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کا تعلق کس تنظیم سے ہے؟'' سوال ہوا۔ میں نے اپنی تنظیم کا نام بتا دیا۔

اس کے بعد اپنے مطالبات بتا دیے اور انہیں بتایا کہ دہشت گرد ہم نہیں بلکہ ان کی حکومت ہے۔ جس نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہم نے انہیں اپنے دس اہم ساتھیوں کی لسٹ دے کر ان کی رہائی اور دس کروڑ روپے بھارتی اور غیر ملکی کرنسی میں طلب کیے تھے۔ جس کے بعد ہم اپنے فرار اور یرغمال بنائے شہریوں کی رہائی کا طریق کار طے کرتے۔

''آپ کی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر پاکستان میں ہے؟''

اچانک ہی ایک اینکر نے سوال کر دیا۔

''آپ نہایت فضول سوال کر رہے ہیں'' ....میں نے قدرے غصے سے کہا۔

''ہم ہر جگہ موجود ہیں۔ مسلمان کا کوئی ملک نہیں ہوتا لیکن ساری دنیا اس کا ملک بھی ہوتا ہے'' ....اچانک ہی شیر خان نے یہ بات کہہ کر میرے ہوش اڑا دیے۔

''گویا آپ اس بات کا اقرار کر رہے ہیں'' ایک دوسرے چالاک اینکر نے پہلو بدل کر اگلا تیر چلایا۔

''ہاں! ہاں! ہم پاکستان، افغانستان، یمن، عراق، انڈیا ہر جگہ طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے'' ....شیر خان نے غصے سے جواب دیا اور میں لرز کر رہ گیا۔

اب مجھے اس سارے کھیل کا مقصد اچھی طرح سمجھ آنے لگا تھا وہ لوگ ہمارے منہ سے یہی

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

بات تو اگلوانا چاہتے تھے جو شیر خان نے کہہ دی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان کو دہشت گردوں کی پشت پناہی کے الزامات کا کتنی شدت سے سامنا ہے اور وہاں جو سلوک ہمارے ساتھ ہو رہا تھا اس سے یہ اندھے اور گونگے بے خبر تھے۔ ''دیکھئے آپ اپنی بات ہماری منہ میں ہی نہ ڈالیں۔ ہمارا تعلق ہندوستان سے ہے اور ہم نے اپنے مطالبات آپ تک پہنچا دیئے..... اگر ان پر اگلے 24 گھنٹوں میں عمل نہ ہوا تو ہم اپنے اگلے لائحہ عمل کا انتظار کریں گے۔''..... میں نے بظاہر اپنی جان چھڑانے کے لئے یہ حربہ آزمایا تھا لیکن وہ شکاری جنہوں نے مجھے اس جال میں پھنسانے کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا مجھ سے بہر حال بہت زیادہ چالاک تھے۔ اس کا احساس مجھے اگلے ہی لمحے ہو گیا جب شیر خان کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون پر ''السلام علیکم'' کہا اور دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد فون مجھے دے دیا۔ ''آپ کا فون ہے کمانڈر صاحب''

اچانک ہی میں نے فون پکڑ لیا لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ فون پکڑتے ہی مجھے احساس ہوا میں نے غلطی کی ہے۔ اپنی کم عقلی کی وجہ سے میں کسی بڑے جال میں پھنس گیا تھا۔ شاطروں نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔

''ہیلو''..... میں نے لاشعوری طور پر کہا۔

دوسری طرف سے عربی میں کچھ کہا گیا جس کا مطلب مجھے اچھی طرح سمجھ آ رہا تھا کیونکہ میں نے افغان جہاد میں عربی مجاہدین کے ساتھ کافی وقت گزارا تھا..... لیکن یہ کون ہے؟ میرے ذہن میں اچانک ہی یہ سوال کلبلایا..... وہ شخص مسلسل بول رہا تھا اور اب مجھے صرف ان آیات کی سمجھ آ رہی تھی جو جہاد سے متعلق ہیں اور جن کی وہ بڑے جوش و خروش سے تلاوت کر رہا تھا۔

''ٹریپ ..... جال'' فوراً ہی دو الفاظ میرے دل و دماغ میں سانپ کی طرح پھنکارے۔ میں نے فون آف کر کے شیر خان کو تھماتے ہوئے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور جاننے کی کوشش کی کہ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے؟ لیکن اس سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ میرے سامنے تین اینکر پرسن کھڑے تھے اور مسلسل میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے تو کوئی سوال نہیں کیا البتہ انہوں نے مجھ سے فوراً پوچھا۔

''کس کا فون تھا؟'' پہلے نے پوچھا

''غالباً عربی زبان میں بات ہو رہی تھی''..... دوسرے نے پتہ اچھالا۔

''آپ کا القاعدہ سے کیا تعلق ہے؟'' تیسرا سوال ہوا۔

میں تو چکرا کر رہ گیا..... میں نے تو زمانے کا سرد گرم دیکھا بھی تھا کوئی عقل کا اندھا بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ میرے گرد بڑا مضبوط سازش کا جال بُنا جا رہا ہے۔

''کیا بک رہے ہو؟'' میں نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ تو غصہ کرنے لگے..... میرا مطلب تھا۔'' اس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے ادھوری بات کی۔

''تمہارا مطلب جو بھی رہا ہو۔ یاد رکھنا۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم دنیا سے تمام کافروں کا نام و نشان مٹا کر رہیں گے۔'' ایک مرتبہ پھر شیر خان نے زہر اگلا۔

اب مجھے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ شیر خان یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس کو میرے ساتھ نتھی کرنے کا مقصد کیا ہے اور وہ ابھی اور کیا کچھ کرے گا۔ میں اس کو یہاں ڈانٹ کر، چپ کروا کر، یا پھر کسی بھی اور قسم کی مداخلت کر کے اپنے لئے فوراً کوئی نیا عذاب کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بھارتی میڈیا اور شیر خان دونوں کا ٹارگٹ میں تھا اور اتنا سافٹ ٹارگٹ کہ جس پر وہ اپنی مرضی اور بڑی آسانی سے ہر طرح ضرب لگا سکتے تھے۔ میں نے اسی لمحے ایک بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان حالات میں میرے لئے یہ انقلابی فیصلہ ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے ان دونوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ شیر خان اور اس کے مکار ساتھیوں سے بھی اور بھارتی میڈیا سے بھی جو بظاہر مجھے اس سارے گھناؤنے کھیل کا ''ماسٹر مائنڈ'' بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا شیر خان کو ابھی گولی مار کر فارغ کروں اور یہاں سے کسی بھی طرح نکل جاؤں لیکن ابھی ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا۔ عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ تو ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس نے ہوٹل کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے اور فرار کے ہر ممکن راستے پر ان کی نظر رہی ہوگی۔ میں نے اس ہوٹل کے ممکنہ فرار کے راستے صرف نقشے میں دیکھے تھے یا پھر ''ریکی'' کر کے ہوٹل دیکھا تھا لیکن کیا مجھے صحیح معلومات دی گئی تھیں؟ اگر میں ان کا شکار ہی تھا تو مجھے وہ صحیح معلومات کیوں دیں گے؟ یہ سوچ ہی بڑی پریشان کن تھی۔ مجھے یہاں چاروں طرف اپنے دشمن ہی دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے پہلے مجھے ان نام نہاد مجاہدین کے شکنجے سے نکلنا تھا۔ جنہوں نے اپنے آقاؤں کے حکم پر مجھے پھانسنے کے لئے بانو کا استعمال کیا تھا۔ جیسے جیسے مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے لئے خطرات بھی بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ نہ صرف شیر خان بلکہ اس کے ساتھ موجود دیگر ''مجاہدین'' بھی دراصل ''را'' کے ایجنٹ ہیں۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اس گھناؤنے کھیل کو بڑی کامیابی سے کھیل رہے ہیں۔ جس کا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مقصد مجھ ایسے گدھوں کو گھیر کر اپنے مذموم مقاصد کا حصول ہے۔

اف میرے خدایا! میں لرز کر رہ گیا۔ ان ظالموں نے تو مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔ میری حالت دھوبی کے اس کتے والی ہو گئی تھی جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا.......... جو کچھ میں ٹی وی سکرین پر دیکھ رہا تھا وہ صرف میرے لئے نہیں ساری دنیا کے لئے تھا۔ یہ سب کچھ یقیناً پاکستان میں بھی دیکھا جا رہا تھا اور میرے ملک کے جو حالات تھے وہ مجھ ایسے "باخبر" سے ہرگز پوشیدہ نہیں تھے۔

جو کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ یہ سارا پہلے سے تیار شدہ ڈرامہ تھا۔ اس ڈرامے میں مجھے جو کردار سونپا گیا تھا۔ اس میں میری مرضی ہرگز شامل نہیں تھی اور جس زبردستی کا اداکار بنا ہوا تھا.......... لیکن یہ بات مانے گا کون؟ میں کس کس کو اپنی بے گناہی کا قائل کروں گا؟ کون میری باتوں پر یقین کرے گا۔ بے گناہ عورتوں، بچوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد میرے حق میں کوئی کلمہ خیر کیسے کہے گا؟

پاکستان جس نوعیت کی دہشت گردی کا شکار تھا۔ اس کا احساس ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کے ناطے مجھ سے زیادہ اور کسے ہو سکتا تھا۔ اب پاکستان پر کس نوعیت کا پریشر آئے گا.......... یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا.......... جس کمینے دشمن کا ہمیں سامنا تھا وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس سے ہمیں کیسی توقعات رکھنی چاہئیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے گھر والوں کے ساتھ اس کے بعد کیا بیتے گی؟ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی ہو گی کہ میں بھارت میں ہوں اور ان کی طرح ایک ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہوں۔

یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جیسے ہی بھارتی میڈیا سے خبریں باہر نکلیں گی میرے گھر والوں کی زندگی ضرور جہنم بن جائے گی کیونکہ جلد یا بدیر یہ لوگ جو پہلے ہی میرے ایڈریس سے آگاہ ہیں اسے مشتہر کریں گے۔ جس کے بعد پاکستانی ایجنسیاں میرے رہے سہے غریب رشتہ داروں کی زندگی جہنم بنا دیں گے۔ "آپ لوگ جانتے ہیں.......... ہمیں مزید کوئی بات نہیں کرنی۔" میں نے میڈیا والوں سے کہا۔

"ہاں! اب جو کچھ ہو گا وہ تمہاری پولیس اور فوج کے ساتھ ہو گا۔ انہیں بتا دو جب تک ہمارے مطالبات پورے نہ ہوئے ہم کسی کو رہا نہیں کریں گے۔ آٹھ دس لاشیں اندر پڑی ہیں۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ہم ایک ایک کر کے باقی سب کو مارنا شروع کر دیں گے اور پہلا نمبر امریکہ اور برطانیہ کے شہریوں کا ہو گا۔ جس کے بعد بھارتیوں کی باری آئے گی۔"

شیر خان اپنا رٹا یا ہوا سبق فر فر دھرا رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں [illegible]

دینے تھے۔

"نکلو.......... فوراً یہاں سے نکل جاؤ.........." میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا اور وہ تینوں چینلز کے لوگ خوفزدہ ہو کر قریباً بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں نے شیر خان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید اپنی کامیابی یا پھر میری بیوقوفی پر..........!

"یہ بڑے ظالم لوگ ہیں کمانڈر صاحب۔ ان سے شریفانہ زبان میں گفتگو مناسب نہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں کمانڈر صاحب باتوں سے نہیں مانتے۔" اس نے بڑے سازشی انداز میں یہ فقرہ میری طرف اچھالا تھا۔ وہ مجھے کمانڈر بنانے اور مروانے پر تلا ہوا تھا اور میرے تیقن کے مطابق طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔

"میں زبان کے بجائے ہاتھ سے بات کرنے کا قائل ہوں شیر خان.......... وقت آنے پر تمہیں اس کا علم ہو جائے گا۔" بے ساختہ میری زبان سے نکلا اور میں اس کے چہرے کا ردعمل دیکھنے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا۔

اب میں ترتیب کے مطابق اپنے ٹھکانے پر موجود تھا۔ جہاں میرے ساتھ تین اور ساتھی بھی موجود تھے۔ اس منصوبے کو اپنی دانست میں "شمشو بھائی" نے اتنا خفیہ رکھا تھا کہ یہاں موجود اپنے ساتھیوں کی صحیح تعداد کا بھی انہیں علم نہیں تھا۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ہوٹل میں ہمارے کچھ ساتھی پہلے سے کمرے بک کروا چکے ہیں جو وقت آنے پر سامنے آتے رہیں گے اور اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ ان میں کتنے لوگ واقعی "مجاہد" تھے اور کتنے "را" کے "ایجنٹ نما مجاہد" اس کا مجھے اچھی طرح علم تو نہیں تھا لیکن میرے نزدیک اب یہ تمام لوگ مشکوک اور ناقابل اعتبار تھے۔ اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا خود ہی کرنا تھا اور اپنے لئے خود ہی راستہ بنانا تھا۔ ہوٹل کے فرسٹ فلور پر موجود لابی میرا ٹھکانہ تھا۔ جہاں ایک بڑی سکرین پر ایک بھارتی نیوز چینل ہمارے خلاف مسلسل زہر اگل رہا تھا۔ ایک تیز طرار قسم کی فاحشہ سی لڑکی خصوصاً میرے متعلق ایسے ایسے انکشافات کر رہی تھی جنہیں سن کر مجھے اپنے "سپرمین" ہونے کا گمان گزرنے لگا۔ اچانک ہی ایک خبر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ اس اہم خبر کو منظر عام پر لانے سے پہلے ٹی وی کی نیوز اینکر نے اعلان کیا کہ انہیں میرے متعلق ابھی ابھی انتہائی Exclusive یعنی اہم ترین اطلاعات ملی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان اطلاعات کی نشریات کا آغاز ہو گیا۔ ٹی وی سکرین پر میرا پاسپورٹ اپنی مکمل تفصیلات کے ساتھ موجود تھا۔ جس پر میری تصویر، نام، پتہ دکھایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہی وکیل شرما کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ جس نے بتایا کہ وہ چونکہ بھارت آنے والے پاکستانیوں کے مقامی سی آئی ڈی آفس میں اندراج کروانے کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے اور عموماً اس کی خدمات اس سلسلے میں پاکستانی حاصل کرتے ہیں۔ میں اور میرا ایک ساتھی اس کے پاس آئے تھے۔ ''حسن اتفاق'' سے میرے پاسپورٹ کا مکمل ریکارڈ اس کے کمپیوٹر میں محفوظ ہے کیونکہ معاملات کی نزاکت کے پیش نظر وہ جن پاکستانیوں کے لئے اس نوعیت کی خدمات انجام دیتا ہے۔ ان کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تاکہ وقت آنے پر کسی قانونی پیچیدگی سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد اس نے کیا کیا لاف گزاف کی مجھے اس کی خبر نہیں۔ میرا تو سر چکرانے لگا تھا۔

اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میرے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی تھی تو اسے مبالغہ نہ جانیے۔ اس نوعیت کی اطلاع سے منظر عام پر آنے کے بعد مجھے تو یوں لگا۔ جیسے زندگی کے سارے دروازے ایک ایک کر کے مجھ پہ بند ہونے لگے تھے اور کمرے کی دیواریں چاروں طرف سے میری طرف سمٹ رہی تھیں۔

''اوہ میرے خدایا!.............. اتنا بڑا دھوکہ..............''

میرے ساتھ کیا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا تھا۔ میری سادگی کو ان ظالموں نے کس طرح لوٹا تھا اور مجھے کس طرح موت کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹی وی سکرین پر وہ ''اینکر'' آ گیا جس نے تھوڑی دیر پہلے میرے ساتھ گفتگو کی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی موجودگی میں مجھے پاکستان سے کسی القاعدہ کے لیڈر کا فون موصول ہوا تھا۔ جس کی تصدیق کے لیے وہ بار بار شیر خان کا وہ کلپ دکھا رہے تھے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ ''ہاں ہمارا القاعدہ سے تعلق ہے۔'' .... اس کے بعد کا فقرہ ظاہر ہے ان کے کام کا نہیں تھا اس لئے انہوں نے کاٹ دیا۔

بھارتی انٹیلی جنس نے بڑا کامیاب داؤ کھیلا تھا۔ ایک تیر میں کئی شکار کیے تھے اور ایک ہی وقت میں پاکستان پر چوطرفی حملہ کر دیا تھا۔ جس کا دور دور تک اس ساری صورتحال سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ میرے لئے حیرانگی کی بات یہ تھی کہ میں تو دہشت گردی کے الزام سے جان بچانے کے لئے پاکستان سے فرار ہوا تھا اور یہاں مجھے پاکستان کا تربیت یافتہ دہشت گرد بنا کر پیش کرنے کے بعد بھارت کے درجنوں چینلز ڈھول پیٹ رہے تھے کہ پاکستان نے میرے ذریعے ''دہشت گردی'' بھارت میں ''ایکسپورٹ'' کی ہے۔ مختلف چینلز پر پاکستان اور افغانستان کے سرحدی

شہروں میں فروخت ہونے والی سستی سی ڈیز چلا کر ثابت کیا جا رہا تھا کہ پاکستان میں جگہ جگہ ''القاعدہ'' نے اپنے تخریبی کیمپ بنا رکھے ہیں جہاں مجھے ایسے گدھوں کو ٹریننگ دے کر بھارت بھیجا جاتا ہے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بھارتی ٹی وی چینلز نے پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا ہو۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ اب میرے لئے یہاں ایک ایک پل موت کے نزدیک ہونے کے مترادف تھا۔ اگر میں یہاں مارا جاتا تو یہ لوگ گلیوں، بازاروں میں میری لاش کی نمائش، میرے پاسپورٹ کے ساتھ کر کے میرے ملک کے لئے لاینحل مسائل کھڑے کر دیتے۔ میرے خاندان والوں کی زندگی تو پہلے ہی جہنم بن چکی ہوگی۔ مجھے خود کو، اپنے خاندان کو اور سب سے بڑھ کر اپنے ملک کی ساکھ کو بچانا تھا۔ جس کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ میں زندہ پاکستان پہنچوں۔ لیکن .... یہ لوگ جنہوں نے میرے گرد سازش کا مضبوط جال پھیلا رکھا تھا کیا مجھے زندہ یہاں سے نکلنے دیں گے۔ یہ پچھتاوا میری جان کو آ گیا تھا کہ میری نالائقی کی وجہ سے میرے خاندان اور ملک پر حرف آ رہا تھا۔ گو کہ میں بے قصور تھا۔ اس صورتحال کا مجھے اگر شائبہ تک بھی ہوتا کہ یہ لوگ جو مجھے گھیر کر بھارت لے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کیا کرنے والے ہیں تو میں انہیں پاکستان ہی میں ختم کر دیتا تاکہ میرے جیسے کسی اور احمق تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کھیل کو ختم کر دیا جائے لیکن میں تو بانو کے عشق یا ہوس، جو بھی نام دے لیجیے میں ڈوب کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ سازش کی ایک ایک کڑی آپس میں ملتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ سلسلہ بھارتی ایجنسیوں نے یہاں سے افغانستان تک پھیلا رکھا ہے اور انہیں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی ایسے بے غیرت اور بے حس لوگ مل جاتے ہیں جو جہاد کی آڑ میں اس گھناؤنے کھیل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اچانک ہی مجھے علی شیر یاد آ گیا۔ وہ بھی تو میرے ساتھ ہی بھارت آیا تھا۔ اس کا پاسپورٹ کیوں نہیں ٹی وی پر دکھایا جا رہا؟ اس کے دو ہی مطلب تھے یا تو علی شیر شروع ہی سے ان کا ساتھی، اس گھناؤنے کھیل کا اہم حصہ رہا تھا یا پھر میری طرح اس قربانی کے بکرے کو کسی اگلے مرحلے پر بلی دینے کے لئے سنبھال کر رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ علی شیر کا کوئی تیسرا استعمال میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ٹی وی چینلز میرے حوالے سے پاکستان کے خلاف مسلسل زہر اگل رہے تھے اور اب ان کے سرکاری عہدے دار بھی اس سازش کے اگلے مرحلے پر عمل پیرا تھے اور پاکستان کو بڑے دانشورانہ انداز میں مطعون کرتے ہوئے دہشت گردوں کا گڑھ اور عالمی امن کے لئے خطرہ قرار دے رہے تھے۔ امریکہ کو طیش دلایا جا رہا تھا کہ وہ پاکستان پر حملہ کرے۔ مغربی ممالک سے اپیل

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کی جارہی تھی کہ وہ ''بے چارے ہندوستان'' کی مدد کریں اور آخر میں پاکستان میں موجود دہشت گردی کے نام نہاد کیمپوں پر ''سرجیکل سٹرائیک'' کا نظریہ پیش کیا جارہا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی جب یکے بعد دیگرے ہوٹل میں تین دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار بلند ہونے لگی۔ شیر خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنی حرامکاری کے دوسرے مرحلے پر عمل شروع کر دیا تھا۔ ہوٹل کی پچھلی سمت سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر باہر موجود سکیورٹی ایجنسیوں کو انگیج کر رہے ہیں اور کہانی میں ڈرامائی تاثر پیدا کیا جارہا ہے۔

میں چونکہ ہوٹل کے سامنے والے حصے میں تھا اس لئے پچھلے حصے کی صورتحال تو سمجھ نہ آ سکی۔ البتہ سامنے کا منظر بالکل نمایاں تھا۔ سڑک کے دائیں جانب تو گھنے باغات تھے اور بائیں جانب منظر خاصا نمایاں تھا جہاں ہر ممکن آڑ کے پیچھے سیکورٹی فورسز نے پوزیشن لے رکھی تھی۔

یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جیسے جیسے دیر ہو رہی ہے باہر سیکورٹی فورسز کے انتظامات بھی مضبوط ہوتے جارہے ہیں۔ فرار کے ہر راستے پر ان کی نظر رہی ہوگی اور ان کے ذہن میں یہ بات بھی ضرور ہوگی کہ کوئی نہ کوئی اندر سے فرار ہونے کی کوشش بھی کرے گا۔ ابھی بھارت میں لوگوں کو ہمارے خودکش حملہ آوروں کی طرح جو خواہ مخواہ مرنے کا شوق نہیں چڑھا تھا اور نہ ہی یہاں ''خودکش'' حملوں کا کوئی واقعہ بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کی موت کے بعد پیش آیا تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں بھی مجاہدین خود کو دھماکہ کر کے مارنے کے بجائے لڑ کر شہید ہونا پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہتھیار نہیں ڈالتے تھے۔ میری خوش قسمتی جانیے یا کچھ اور کہ سازش کرنے والوں کو شاید یہ امید نہیں تھی کہ انہوں نے جو دن منتخب کیا ہے۔ اس روز شہر کی بہت اہم شخصیات یہاں نمائش دیکھنے آ جائیں گی۔ یوں بھی ایسے معاملات صرف اس انٹیلی جنس ایجنسی تک محدود ہوتے ہیں جو اس نوعیت کے منصوبے بناتی ہے۔ شاید سکیورٹی فورسز کو اس سے آگاہ نہیں کیا جاتا یا پھر انہیں عین آخری مراحل پر یا اس مخصوص مرحلے پر جب ان کو اعتماد میں لینا ناگزیر ہو، اس سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ باہر موجود فورسز میں سے شاید ایک دو لوگوں کو ہی اعتماد میں لیا گیا ہوگا۔

میرے نزدیک وہ ٹیلی فون موجود تھا جس پر ہمارا باہر موجود سکیورٹی فورسز سے رابطہ تھا۔ رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تھا اور سکیورٹی فورسز نے باہر بڑی بڑی سرچ لائٹیں جلانا شروع کر دی تھیں۔ مجھے اس لمحے کا انتظار تھا۔ اپنے ذہن میں دوبارہ طے شدہ فرار کے منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے کے بعد میں نے اللہ کا نام لے کر فون اٹھایا اور اس نمبر پر ملایا جو پولیس نے ہمیں فون پر بات کرنے کے لئے دیا تھا۔ کال کسی بھاری بھرکم آواز نے وصول کی تھی۔

''پانچ منٹ کے اندر اندر اپنی پوزیشنیں سامنے سے ہٹا لو ورنہ اندر موجود وی آئی پیز کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''کون ہو تم؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

اپنی دانست میں بڑا زبردست حربہ آزمایا تھا میں نے..... لیکن دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ اب مجھے منصوبے کے اگلے حصے پر پانچ منٹ بعد عمل کرنا تھا۔ اس دوران فون کی گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں لیکن میں نے فون اٹھایا نہ ہی اپنے کسی ساتھی کو اٹھانے دیا۔

مجھے اس بات کا تو یقین ہو چلا تھا کہ میرے ساتھ موجود مجاہدین میں سے زیادہ تعداد میرے جیسے بے وقوفوں کی ہی تھی۔ شیر خان (یا اس کا جو بھی نام تھا) جیسے ایک دو ہی اور ہوں گے۔ یوں بھی اس خونی کھیل میں راز داری کا اہتمام لازم ہوتا ہے اور منصوبہ ساز بہت کم لوگوں کو اعتماد میں لیتے ہیں۔ فون کی گھنٹی مسلسل بجنے کے بعد بند ہو گئی تھی۔ جیسے ہی پانچ منٹ مکمل ہوئے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سے جس کے کندھے پر لانچر رکھا تھا۔ راکٹ لانچر لیا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر شمالی دیوار پر فائر کر دیا۔ زوردار دھماکے سے دیوار کا کافی حصہ گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے دو زوردار دھماکے اندر بھی کر دیئے۔ جو ان لوگوں کے لئے بالکل خلاف توقع تھے۔

اگلے ہی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اس مرتبہ میں نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو! ہیلو!.....'' دوسری طرف سے وہی آواز لیکن قدرے گھبراہٹ میں سنائی دے رہی تھی۔

''امید ہے آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا..... فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اگر ہمیں کوئی سرچ لائٹ جلتی دکھائی دی تو سمجھ لینا۔ اس کے پانچ منٹ بعد پورا ہوٹل یہاں کے مکینوں سمیت اڑا دیں گے۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور اس کی ہیلو ہیلو کی پرواہ کئے بغیر فون رکھ دیا۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی اور سامنے کی تمام سرچ لائٹیں آف ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی شیر خان بھی آ گیا۔

''کمانڈر صاحب.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی اور قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہاں آنے کی اجازت کس نے دی۔ خبردار اپنی جگہ سے ہلے تو..... یہاں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا..... اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہے تمہیں نہیں۔''

''ٹھیک ہے کمانڈر صاحب! میں تو.....'' اس نے پھر سٹارٹ لیا۔

''دیکھو شیر خان یہ مت بھولو کہ شمشو بھائی نے یہاں کا کمانڈر مجھے بنایا ہے..... اور ان حالات میں سوال جواب کرنے کی اجازت میں نہیں دے سکتا..... اپنی جگہ واپس جاؤ اور ہوشیار رہو۔ جلدی ہم اگلی کارروائی کریں گے۔ جس میں تمہاری ضرورت پیش آئے گی۔'' میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''ٹھیک ہے کمانڈر صاحب میں تو صرف آپ کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔'' اس نے بددلی سے کہا۔

''مطمئن رہو.......... ویسے بھی ہم یہاں زندہ رہنے کے لئے نہیں، شہید ہونے کے لئے آئے ہیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ میں نے منصوبے کے اگلے حصے کی طرف پیش قدمی کی اور اب میں گراؤنڈ فلور کے اس حصے کی طرف جارہا تھا۔ جہاں ہوٹل کا ''الیکٹرسٹی مین روم'' موجود تھا۔ یہاں بھی میرے گروپ کا ایک مجاہد پہرہ دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مستعد ہوگیا۔ ہم نے پہلے سے یہاں بارود نصب کیا ہوا تھا۔ جس کا ڈیٹونیٹر اس کے پاس تھا۔

''سوئچ روم کو اڑا دو اور پہلی منزل پر پہنچ جاؤ۔'' میں نے اسے حکم دیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''چلو جلدی کرو..........'' میں نے قدرے سختی سے کہا۔

''جی کمانڈر صاحب..........'' کہتے ہوئے اس نے اپنی محفوظ جیب میں رکھا ڈیٹونیٹر نکال لیا۔

''ادھر آجاؤ.......... اس طرف..........'' میں نے اسے اپنی سمت آنے کا اشارہ کیا اور ایک محفوظ آڑ میں پہنچ کر اس نے ڈیٹونیٹر کا سوئچ دبا دیا۔ زوردار دھماکہ ہوا اور سارا ہوٹل تاریکی میں ڈوب گیا۔

''شاباش اوپر پہنچو..........'' میں نے اسے تھپکی دے کر سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔ اس نے اپنی ایمرجنسی ٹارچ روشن کرلی تھی اور قریباً بھاگتا ہوا اوپر جارہا تھا۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ میں ہوٹل کے اندرونی ہال کی طرف بڑھا۔ جہاں قیامت صغریٰ برپا تھا۔ عورتیں اور مرد ایک کورس کی شکل میں چیخ چلا رہے تھے۔

''بھاگو.......... نکلو.......... بھاگو..........'' میں نے اندھیرے میں ہی زوردار آوازیں لگائیں اور دوسرے ہی لمحے لوگوں نے منہ اٹھا کر بھاگنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ بوکھلاہٹ میں شیر خان اور اس کے ساتھی فائرنگ کررہے تھے اور ایک طوفان بدتمیزی ہر طرف برپا تھا۔ اس اثناء میں میرا حلیہ بدل چکا تھا۔ میں نے منہ پر لپٹا کپڑا اور اپنی گن وہیں ایک کونے میں پھینکی اور اب میں پتلون شرٹ میں ملبوس ایک عام نوجوان بن چکا تھا۔ میں نے اپنے نزدیک کھڑے کچھ لوگوں کو اس سمت اشارہ کیا۔ جدھر سے دیوار توڑی تھی اور وہ سب ادھر منہ اٹھا کر بھاگنے لگے۔ ان بھاگنے والوں میں خود میں بھی شامل تھا۔

نیا باب

یرغمالی اس طرح سرپٹ دوڑ رہے تھے جیسے نہ دوڑنے کی صورت میں انہیں گولی سے موت کا اندیشہ رہا ہو۔ میں اس طرح ان پندرہ بیس جان بچانے کے لئے فرار ہونے والوں کا حصہ بنا تھا کہ بہت غور کرنے پر بھی شاید کسی کو اس کا یقین نہ ہو پاتا۔ یوں بھی جہاں ہر کسی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوں وہاں دوسرے کی طرف توجہ دینے کی مہلت کس کو نصیب ہوتی ہے۔

''اس طرف سے نکلو''.......... میں نے اچانک ہی چیخ کر انہیں ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف متوجہ کیا اور ہم سب اس طرف بھاگنے لگے۔

مجھے امید تھی کہ اس طرف کسی کا دھیان ابھی نہیں گیا ہوگا۔ میرے دائیں طرف ایک عورت اپنی آٹھ نو سال کی بچی کے ساتھ بھاگ رہی تھی اچانک بچی نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑی۔ عورت رک گئی اور مدد کے لئے چیخنے لگی۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں میں وقوع پذیر ہوا تھا اور یہاں رکنے کی مہلت کس کے پاس تھی۔ عورت نے کسی کو ''بھیا صاحب'' کہہ کر مدد کے لئے پکارا مگر اس کا جواب اسے ایک زبردست دھکے کی صورت میں ملا۔ خدا جانے مجھ پر خیر کا وہ جذبہ کب غالب آیا۔ جب میں اچانک رک گیا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ضمیر نے میرے قدم تھام لئے۔

''مجھے اس بچی کی مدد کرنی چاہیے۔'' میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا۔

میں نے فوراً جھک کر بچی کو اٹھالیا۔ اس دوران دو بندے باری باری مجھ سے ٹکرائے لیکن میری صحت پر کوئی اثرات مرتب کرنے کے بجائے خود ہی اوندھے منہ زمین پر جاگرے۔ عورت ابھی تک رو رہی تھی۔ جب اس نے مجھے بچی کو اٹھاتے دیکھا تو بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

''بھگوان تمہارا بھلا کرے.......... پرماتما تمہیں سلامت رکھے۔''

وہ نجانے کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن میری متلاشی نظروں نے اس میں کچھ اور پالیا تھا اور دماغ نے فوراً ایک منصوبہ بنالیا تھا۔

''بہن جی! خود کو سنبھالیے.......... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے''.......... میں نے قریباً چیختے ہوئے اسے کہا اور بچی کو جس کی خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی اپنے کندھے پر ڈال کر بھاگنا شروع کیا۔ عورت میرے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ہم ٹوٹی دیوار تک پہنچ گئے جب اچانک فائرنگ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

میرے اندازے کے عین مطابق سیکورٹی ایجنسیوں نے اچانک پیش آنے والی صورتحال کے تحت ہوٹل پر دھاوا بول دیا تھا۔ ہوٹل میں جو ''مجاہدین'' موجود تھے۔ ان میں ہر کوئی شیر خان تو تھا نہیں۔ ان میں کچھ اصلی مجاہدین بھی ضرور رہے ہوں گے۔ انہوں نے پولیس سے مقابلہ شروع کردیا تھا یا پھر اپنی جان بچانے کے لئے فائرنگ کی تھی [illegible] گے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

READING Section

Uploaded By Muhammad Nadeem

ہم اور ہمارے ساتھ بھاگنے والے اب ہوٹل سے باہر آ گئے تھے۔ جہاں چاروں طرف بوکھلائی ہوئی پولیس دکھائی دے رہی تھی۔ جنہیں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں کرنا کیا ہے۔ وہ سب ایک ہی سمت میں بھاگے چلے جا رہے تھے۔ لائٹ آف ہونے کی وجہ سے کسی کو نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کچھ سجھائی دے رہا تھا۔ یوں بھی اندھی گولی کا خوف موت کے خوف سے کم نہیں ہوتا۔ ہمارے ساتھ بھاگنے والوں کی زندگی کا واحد مقصد یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اسے تائید ایزدی کہا جائے یا پھر ناگہانی صورتحال سے پیدا ہونے والی بوکھلاہٹ کا نتیجہ کہ ابھی تک کوئی پولیس والا فرار ہونے والے ہجوم کی طرف نہیں آیا تھا۔ شاید یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ رہی ہوگی کہ ان میں کوئی ''دہشت گرد'' بھی ہوگا۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ سرچ لائٹس کی روشنی بھی ایک محدود حد تک ہی کارگر تھی اور یوں بھی یہاں سرچ لائٹ صرف ایک ہی تھی اور باقی لائٹس کو میں نے جلنے لائق چھوڑا ہی نہیں تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ابھی تک بچی کو اٹھایا ہوا تھا اور اس کی ماں میرے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ جیسے ہی مجھے قدرے تحفظ کا احساس ہوا۔ میں نے آہستہ آہستہ باقی بھاگنے والوں سے اپنی سمت مختلف کرنا شروع کر دی۔ عورت کی مجبوری تھی کہ اسے میرے ہی ساتھ بھاگنا تھا۔

سکیورٹی والوں کی بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنا سارا زور ہوٹل پر ہی لگا دیا تھا اور اس طرف کوئی پولیس والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے اچانک ہونے والے اقدامات واقعی بڑے نتیجہ خیز ثابت ہوئے تھے اور مجھے امید تھی کہ میں اس جال کو کاٹ کر بہرحال نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ عورت میرے پیچھے پیچھے میرے سائے کی طرح چلی آ رہی تھی۔ سڑک کنارے ہم رک گئے۔ سڑک کے دوسری طرف تماشائی جمع ہو رہے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر یہاں بھی پولیس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ یہ سارا گورکھ دھندہ دراصل مجھے پھانسنے اور میرے ملک کو اس میں ملوث کر کے بدنام کرنے کے لئے پھیلایا گیا تھا۔ اس کھیل کے کرتا دھرتا جو بھی تھے چونکہ انہیں علم تھا کہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا اور وہ پراعتماد بھی تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کھیل ان کے لئے نیا نہیں۔ اب مجھے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ آئے روز بھارتی میڈیا میں کسی نہ کسی پاکستانی کی تصویر ''دہشت گرد'' کے کیپشن کے ساتھ کیوں شائع ہوتی ہے اور ان کا تعلق آئی ایس آئی سے کیوں جوڑا جاتا ہے۔

''اس طرف چلیں؟''..... پہلی مرتبہ عورت نے مجھے مخاطب کر کے مخالف سمت اشارہ کیا۔

شاید وہ پولیس کی طرف جانے کی بات کر رہی تھی۔

''بہن جی! جان بچ گئی۔ بھگوان کا شکر ادا کریں۔ اگر ہماری پولیس اسی لائق ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی ..... میرے خیال سے زیادہ بہتر ہے آپ گھر چلیں۔ پولیس والے آپ کو الٹے سیدھے سوالات کر کے پریشان ہی کریں گے۔''

میں نے بڑے اعتماد سے کہا اور اس نے یقین کر لیا۔

''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''ہرپال سنگھ''..... میں نے کہا۔ ''غریب آدمی ہوں۔ پنجاب کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے علاقے کے ایک بڑے افسر کے نام سفارشی خط لے کر آیا تھا۔ کسی نے بتایا تھا انہیں یہاں ملا جا سکتا ہے۔ دفتر میں تو کسی نے گھسنے ہی نہیں دیا..... یہاں ملنے آیا تھا۔ اس مصیبت میں پھنس گیا''..... میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

اس نے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں کوئی بندوبست کر دوں گی۔ بنگلے کے پاپا کے بہت جاننے والے ہیں۔ ہم بھی ہریانہ کے رہنے والے ہیں۔'' اس نے کہا۔

اب مجھے اس بچی کا نام معلوم ہو گیا تھا جو اب تک مجھ سے بری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ بچی اتنی خوفزدہ تھی کہ دھشگ سے اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

''پہلے آپ گھر چلیے۔ بچی اور آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' میں نے سڑک عبور کرتے ہوئے اس سے کہا۔

حسن اتفاق سے ایک ٹیکسی والا جو تماشا دیکھنے یہاں موجود تھا تک ہماری رسائی ہو گئی۔ خاتون نے اسے دہلی کی ایک پوش آبادی کا نام بتایا۔ میں نے پچھلا دروازہ کھول کر خاتون کو تعظیماً بٹھایا، پھر بمشکل بچی کو اس کے ساتھ بیٹھنے پر رضامند کیا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پہلی مرتبہ غور سے دیکھنے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک بہت خوفزدہ ہے۔ مجھے اس کے جسم میں کپکپاہٹ اتنی دور سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور شاید اس علاقے کے مکینوں سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے احتراماً ہم سے کوئی سوال نہیں کیا اور ٹیکسی قریباً بیس منٹ بعد ایک شاندار بنگلہ کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں گیٹ پر موجود چوکیدار ٹیکسی رکنے پر ہمارے نزدیک آیا اور اس نے بہت حیرانی سے ہماری طرف دیکھنے کے بعد دروازہ کھول دیا۔ ٹیکسی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو دو تین مرد اور عورتیں قریباً بھاگتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچے۔

''روپا! روپا!''..... سب بے چینی سے اسے مخاطب کر کے اس کا حال دریافت کر رہے تھے۔ بچی نے گھر پہنچتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک ڈھلتی عمر کی نرس نے اسے تھام لیا تھا اور اسے بہلاتی اندر لے گئی تھی۔

''ٹیکسی والے کو فارغ کر دو''..... خاتون نے جن کا نام مسز روپا تھا ایک بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا جو شکل ہی سے کوئی روایتی قسم کا منشی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اثبات میں بڑے احترام سے سر ہلایا اور اس طرف چلا گیا۔

''ہرپال سنگھ تم ادھر آؤ''..... اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں ایک بڑے سجے سجائے کمرے میں داخل ہو گئے۔

''بیٹھو''..... اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس پر بیٹھ گیا۔ میرے اعصاب اب تک تنے ہوئے تھے۔

''ملہوترا صاحب آؤٹ آف کنٹری ہیں..... ورنہ بہت پریشانی ہوتی''..... اس نے اپنے خاوند کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ میرا واسطہ کسی عام عورت سے نہیں بلکہ دہلی کے کسی بڑے گھرانے کی خاتون سے پڑا ہے اور مجھے اب نئے امتحان کے لئے خود کو تیار کرنا تھا۔

''گھبراؤ نہیں..... تم یہاں ہر طرح محفوظ ہو۔ ملہوترا صاحب بڑے بزنس مین ہیں۔ ہم تمہیں اپنے آفس میں جاب دیں گے''..... اس نے غالباً میری حالت کا اندازہ کر لیا تھا۔

''شکریہ میڈم''..... میں نے بے ساختہ کہا۔

''شکریہ تمہارا..... تم نے میری بچی کی جان بچائی۔ تم ہمارے محسن ہو۔'' اس نے بڑے خلوص سے مجھے مخاطب کیا۔

''میڈم جی آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں..... میں کیا اور''

''ابھی تم کھانا کھاؤ..... پھر اپنے کمرے میں آرام کرنا..... پرسوں تک ملہوترا صاحب آ جائیں گے پھر تمہیں جاب کی پرابلم نہیں رہے گی''..... اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

میں سکتے کی سی کیفیت میں یہاں بیٹھا تھا۔ خدا جانے یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ بظاہر تو مسز روپا بڑی مہربان دکھائی دے رہی تھی اور میں نے یہ سارا کھڑاگ بھی ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے پھیلایا تھا مجھے بہر حال یہاں دلی میں کچھ دنوں کے لئے محفوظ پناہ گاہ درکار تھی جہاں چھپ کر میں اگلی پلاننگ کر سکوں اور آنے والے حالات سے نمٹ سکوں۔

میرے لئے اب یہ زندگی موت کا کھیل بن گیا تھا۔ میں چشم تصور سے اپنے گھر والوں کی حالت دیکھ رہا تھا۔ جس نوعیت کا پراپیگنڈہ میرے خلاف ہو رہا تھا اور اپنی آنکھوں سے میں نے ٹی وی سکرین پر خود کو جس انداز میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے تو مجھے بھی خود پر شک ہونے لگا تھا کہ کہیں میں واقعی دہشت گرد تو نہیں ہوں؟ وہ تو خدا کا شکر تھا کہ پاسپورٹ والی تصویر سے میری موجودہ شکل نہیں ملتی تھی۔ میں نے سکھوں کی طرح داڑھی اور مونچھیں بڑھا رکھی تھیں۔ البتہ سر پر بالوں میں پگڑی نہیں باندھی تھی۔ پہلے تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ اپنا حلیہ بدلتا ہوں لیکن اب میں نے موجودہ حلیہ ہی برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ مسز روپا نے ٹی وی سکرین پر میری تصویر دیکھی ہے یا نہیں لیکن یہ تو اظہر من الشمس تھا کہ میرے فرار کے بعد جو کچھ بھارتی سیکورٹی والوں پر گزرے گی۔ اس سے وہ قریباً غصے میں پاگل ہو جائیں گے اور میری تصاویر وہ ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیں گے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں دوسرا سوال پیدا ہوا کہ میرے موجودہ روپ میں ہی کہیں میری شناخت نہ ہو جائے؟

یہ بھی ممکن تھا لیکن میرے لئے فی الوقت اس زمین پر مسز روپا کے گھر سے بڑی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ فی الوقت حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں میں یہاں سے بھاگ کر کہیں اور نہیں جا سکتا۔ میری جیب میں کچھ زادِ راہ تو تھا بلکہ اچھی خاصی رقم تھی جو ہمارے ”اصول جنگ“ کے مطابق کوئی بھی ایکشن کرنے سے پہلے جیب میں رکھی جاتی ہے تاکہ کسی نازک مرحلے پر اگر پیسے کی مدد سے کام نکل سکے تو ضرور نکالا جائے۔ چاہتا تو کسی ہوٹل میں دس پندرہ روز آسانی سے بسر کر سکتا تھا لیکن میں نے فی الوقت یہیں ٹکے رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

میرا زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں بھارتی ایجنسی کے ہاتھ لگنے کا مطلب تھا میرے خاندان کی بربادی۔ اور میرے ملک کے لئے لاینحل مسائل کھڑے ہو جانا۔ حالات نے مجھے بانو جیسی حرافہ کے شکنجے میں پھنسا کر مجاہد سے ایک عام انسان بنا دیا تھا لیکن میں نے اپنی اصلیت کو کبھی نہیں بھلایا تھا۔ میں نے کسی لالچ کے لئے نہیں محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میدان جہاد میں قدم رکھا تھا۔ بھارت میں کسی لالچ میں نہیں بلکہ جہاد کے لئے آیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس میں بانو کی ہوس بھی شامل ہو گئی تھی۔ حالات کیسے ہی برے کیوں نہ رہے ہوں۔ اس بات کا تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا کہ میری وجہ سے پاکستان کو جو میرا ملک ہے۔ کسی بھی نوعیت کی خطرناک صورتحال سے واسطہ پڑے۔ میں نے تو اپنا ملک ہی اس لئے چھوڑا تھا کہ نائن الیون کے بعد وہاں ماضی کے مجاہد آج کے دہشت گرد بن گئے تھے اور میں ان میں اپنا نام درج کروانا نہیں چاہتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت بھارتی الیکٹرونک میڈیا پر کیا قیامت برپا ہو گی اور میرے فرار کے بعد خصوصاً ایجنسیوں والے کسی طرح شکاری کتوں کے ساتھ میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ دوران فرار جہاں میں نے اسلحے سے مکمل نجات حاصل کر لی تھی۔ وہاں میں نے اپنے پاس موجود دونوں سیٹلائٹ اور موبائل فون اس طرح ضائع کئے تھے کہ ان کا نام و نشان بھی کسی کو نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ کوئی ایسا کلو یہاں نہ چھوڑوں۔ جس سے ان لوگوں کو میرے متعلق کوئی بھی راہنمائی ملے۔

”میڈم فرما رہی ہیں کھانا تیار ہے۔ میرے ساتھ تشریف لائیں۔“ مؤدب اور سمارٹ ملازمہ نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

ملازمہ کی راہنمائی میں دوسرے کمرے سے گزرنے کے بعد جب میں کھانے والی میز تک پہنچا تو ایک نئی حیرت میری منتظر تھی۔ وہاں مسز روپا پہلے سے بنی سنوری موجود تھیں۔ غالباً اس دوران انہوں نے اپنا میک اپ ہی درست کیا تھا اور اپنے اوسان بحال کئے تھے۔

اس گھر اور یہاں کے لوگوں کے ٹھاٹ باٹھ دیکھ کر میں تو سہم کر رہ گیا۔ خدا جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے جو داؤ کھیلا ہے۔ وہ الٹا ہی مجھ پڑ آتا ہے یا میں اس سے بچ جاؤں گا۔

”بیٹھو“........ مسز روپا نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں سحر زدہ سا اس پر بیٹھ گیا۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ ایک مؤدب ملازمہ موجود تھی جو اب ہم دونوں کے سامنے بڑے سلیقے سے ”تھالیاں“ سجا رہی تھی۔

”شاکاہاری ہو یا؟“........ انہوں نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”شاکاہاری“ کا مطلب تھا صرف سبزی دال کھانے والا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اس کا کیا جواب دوں۔

”جی میں........“ میں نے گھبراہٹ میں کچھ کہنا چاہا۔

”نو پرابلم........“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ مسٹر ملہوترا بھی بہت لبرل ہیں لیکن ہماری فیملی براہمن ہے ناں........ کچھ خیال کرنا پڑتا ہے........ تھینک گاڈ! ان لوگوں کو میرے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتہ نہیں لگا ورنہ یہاں تو اچھا خاصا میلہ لگ گیا ہوتا........

”جی“........ میں نے صرف ایک لفظ کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

”مسٹر کرپال سنگھ تم ہمارے محسن ہو۔ تم نے میری اور میری بچی کی جان بچائی ہے۔ ہم اس احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتے........ لیکن تمہاری ہر طرح مدد کریں گے۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟“........ انہوں نے اچانک بڑا عجیب و غریب سوال کر دیا۔

اس مرحلے پر میری ایف اے تک کی پاکستانی تعلیم اور بانو کے ساتھ گزرے وقت کے دوران ہندی پر گزارے لائق عبور میرے کام آ گیا۔ یہ زبان میں نے بڑے شوق سے سیکھی تھی اور آسانی سے پڑھ لکھ سکتا تھا۔

”جی بس گزارے لائق........ غریب لوگ ہیں میڈم آٹھ دس جماعتوں سے زیادہ کیا پڑھیں گے۔ محنت مزدوری کر کے وقت گزارتے ہیں“........ میں نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔

”نو پرابلم“........ مسز روپا نے میز کے کونے میں دھرے گلاس میں پانی انڈیل کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ملازمہ نے جو عام حالت میں کوئی ماڈل ہی دکھائی دیتی تھی۔ دونوں کے سامنے کھانا ”پروسنا“ شروع کیا۔ ”تھالی“ کے آداب سے بخوبی آشنا تھا۔ جنگل میں گزرا وقت میری راہنمائی کر رہا تھا۔ اس مرحلے پر مجھے بے ساختہ کا نتا یاد آ گئی۔ خدا جانے وہ اور منگل کہاں تھے؟ جہاں کہیں بھی ہوں۔ خیر خیریت سے رہیں۔ میرے دل سے دونوں کے لئے دعا نکلی۔ مجھے امید تھی کہ منگل جیسا بہادر انسان ضرور اسے سنبھال لے گا اور دونوں وقت کے ساتھ ساتھ مجھے بھول جائیں گے۔

”کہاں کھو گئے؟“........ مسز روپا نے مجھے چونکایا۔

”جی کہیں نہیں میڈم“........ میں اور کیا کہتا۔

”کھانا کھاؤ........ اگر میٹ (گوشت) کھاتے ہو تو بتا دو، وشالی بنا دیا کرے گی“........ انہوں نے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

مؤدب ملازمہ کی طرف اشارہ کیا جو مجھے چوری چوری عجیب و غریب نظروں سے مسلسل دیکھ رہی تھی۔

"جو مل جائے کھا لیتا ہوں میڈم......... لیکن میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی براہمن گھرانے کو ایسی بات کہوں......... پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں"......... میں نے اپنی دانست میں اسے مطمئن کر دیا تھا۔ مجھے بھی یہاں "جھٹکے" والا میٹ Meat کھانے کی کوئی مصیبت نہیں تھی۔ جواب میں مسز روپا صرف مسکرا کر رہ گئی۔

کھانے کے اختتام پر اس نے وشالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وشالی تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دے گی۔ میں نے وہاں دو تین مردانہ جوڑے رکھوا دیئے ہیں۔ فی الوقت یہی ممکن تھا۔ کل بازار کھلنے پر اپنی مرضی کے کپڑے خرید لانا......... یہ رکھ لو......... "

اس نے کہتے ہوئے ایک کونے میں دھرا اپنا بڑا سا پرس اٹھایا اور اسے کھولنے لگی۔

"ایک منٹ میڈم"......... میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"نوکری حاصل کرنے کے لئے گھر والوں نے مجھے دس ہزار روپے دیئے تھے۔ رشوت دینے کے لئے۔ آپ تو جانتی ہیں ناں۔ یہاں کوئی کام اس کے بغیر ہوتا کہاں ہے۔ اب آپ کرپا کر رہی ہیں تو یہ پیسے بھی بچ گئے۔ مجھے اور پیسوں کی ضرورت نہیں......... جس بات کی ضرورت تھی وہ آپ نے پوری کر دی۔ واہگورو آپ کا بھلا کرے۔" میں نے مقامی روایات کے مطابق ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ مسز روپا نے تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "بھئی جیسا تم پنجابیوں کے متعلق سنا تھا ویسا ہی پایا۔ واقعی تم لوگ کسی کا احسان نہیں لیتے۔ لیکن میں بھی ہریانے کی ہوں۔ تمہاری اس نیکی کو کبھی بھولوں گی نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ میرا فرض تھا میڈم......... میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا........." میں نے بڑے احترام سے کہا۔

"اوکے۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔ اب تم آرام کرو۔ کل ملتے ہیں۔ کل شام تک ملہوترا صاحب بھی آ جائیں گے۔" انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو میڈم........." میں نے دونوں ہاتھ پھر باندھتے ہوئے کہا۔

"گڈ نائٹ .... شبھ راتری........." اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بڑی تمکنت سے قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"آیئے میرے ساتھ........." وشالی نے مجھے مخاطب کیا اور میں اس کے تعاقب میں چل دیا۔

رات کے اندھیرے میں ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بنگلے کا رقبہ کسی بھی طرح ڈیڑھ دو کنال سے کم نہیں۔ اس علاقے میں تمام گھر غالباً ایسے ہی تھے اور یہاں بڑے وی آئی پی قسم کے لوگ رہا کرتے تھے۔

وشالی کے تعاقب میں ایک بڑے برآمدے سے گزرتے ہوئے بنگلے کی "انیکسی" تک پہنچے۔ جہاں ایک کونے میں تین کمرے اور برآمدہ موجود تھا۔ وشالی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر کی راہ دکھائی۔ اس نے بٹن دبا کر کمرہ روشن کر دیا تھا۔

"صبح کتنے بجے آپ کو جگاؤں"......... اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"آٹھ بجے"......... میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"جی ٹھیک ہے........." کہہ کر وہ جانے کے لئے واپس مڑی اور دروازہ آہستگی سے بند کر کے چلی گئی۔

وشالی کی روانگی کے بعد میں نے کمرے کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ یہ غالباً مسز ملہوترا کا مہمان خانہ تھا کیونکہ قالین اور صوفے سے باتھ روم تک ہر شے مالک مکان کے دولت مند ہونے کی چیخ چیخ کر گواہی دے رہی تھی۔

باتھ روم میں شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا اور غور کرتا رہا کہ صبح کے اخبارات

اور بھارتی ٹی وی سٹیشنوں سے میری جو تصویر جاری ہو گی۔ میں اس سے کس حد تک الگ نظر آ سکتا ہوں۔ ابھی تک مسز روپا نے مجھ سے تفصیلاً گفتگو نہیں کی تھی۔ میں نے ہی انہیں بتایا تھا کہ میں اتنے بڑے ہوٹل میں کیا کرنے گیا تھا لیکن ضروری نہیں مسٹر ملہوترا بھی ایسے ہی ہوں؟ عین ممکن ہے وہ دوسری طرح کا آدمی ہو۔ ممکن ہے اس کے دوست احباب میں کوئی گہری نظر رکھنے والا موجود رہا ہو؟ عجیب عجیب طرح کی سوچ مجھے پریشان کر رہی تھی۔ پھر میں نے تمام خیالات کو دل و دماغ سے جھٹکا اور "بہ رضا و رغبت الٰہی" کے فلسفے کو دہراتا کپڑوں کی اس الماری کی طرف بڑھا جسے میں نے ابھی تک کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ اس الماری میں قریباً میرے سائز کی تین چار شرٹس اور پتلونیں لٹکی ہوئی تھیں لیکن سب سے دلچسپ اور حوصلہ مند بات کہ ایک طرف ہینگر میں دو مختلف رنگوں کی سکھوں کی پگڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اسے تائید ایزدی جانا اور پگڑی اپنے سر پر رکھ کر جیسے تیسے اسے فٹ کرنے کے بعد دوبارہ جب شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو قدرے اطمینان ہوا۔ اب میں واقعی اپنی تصویر سے خاصا مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرتا میں نڈھال ہو کر پلنگ پر گرا لیکن چند منٹ بعد ہی اٹھ کر میں نے اندازے سے قبلہ کی سمت ایک چادر بچھائی۔ وہاں دھرا نائٹ سوٹ پہنا اور وضو کرنے کے بعد کمرے کی لائٹ آف کر کے سجدے میں گر گیا۔ مجھ پر رقت طاری ہوئی تھی۔ زار زار رو کر میں نے اللہ سے معافی مانگی۔ خصوصاً اس گمراہی اور بدبختی کے لئے جو بانو کے معاملات میں سرزد ہوئی تھی۔ اللہ سے راہنمائی طلب کی اور التجا گزار ہوا کہ مالک! میری گرفتاری سے میرے ملک کے لئے جو مسائل کھڑے ہوں گے وہ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے.........!

مجھے ایک مرتبہ صحیح سلامت اپنے وطن پہنچا دے۔ جس کے بعد میں کبھی تیرے کسی حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ یقیناً قبولیت کی گھڑیاں تھیں کیونکہ میرے مالک نے پھر مجھے کسی اور بڑی آزمائش میں نہیں ڈالا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کمرے میں اے سی موجود تھا لیکن میں نے اسے آن نہیں کیا۔ میرے لئے پہلے بھی موسم کی نرمی گرمی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اب کیا رکھتی! ہاتھ سے بندھی گھڑی پر میں نے وقت دیکھا تو سحر کے آثار نمودار ہونے کو تھے۔ فجر پڑھنے کے بعد میں سو گیا اور میری آنکھ ٹھیک آٹھ بجے سرہانے دھرے فون کی گھنٹی کی آواز پر کھلی۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے نارمل ہو کر میں نے فون پر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ لیکن انتہائی باادب لہجے والی آواز نے صبح کے آٹھ بجنے کی خبر دی اور مجھ سے پوچھا کہ میں کتنے بجے ناشتہ کرنا پسند کروں گا۔

"ساڑھے آٹھ"......... کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور غسل خانے کا رخ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں مکمل کرپال سنگھ کی صورت آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اگر میں اپنی آنکھوں پر مقامی موسم اور فیشن کے مطابق عینک لگا لیتا تو شاید ہی کوئی مجھے پہچان ہی نہ پاتا۔ کمرے کے کونے میں ٹی وی کے سامنے دھرے ریموٹ کو میں نے پہلی مرتبہ چھوا اور اللہ کو یاد کر کے ٹی وی آن کیا۔ جس کے قریباً ہر نیوز چینل پر رات کے واقعات کو سنسنی خیز انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ میری پاسپورٹ والی تصویر بار بار دکھاتے ہوئے عوام سے گرفتاری میں مدد کی اپیل کی جا رہی تھی۔ میرا تعلق پاکستان کی ایک سابقہ جہادی تنظیم سے جوڑ کر القاعدہ سے اس کے ڈانڈے جوڑے جا رہے تھے اور ادھر ادھر کی فوٹیج چلا کر ڈراؤنا اور سنسنی خیز ڈرامہ کھڑا کیا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ایک منظر نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔

اب ٹی وی پر علی شیر کی جھلک دکھائی جا رہی تھی۔ جسے پولیس نے "موقعہ واردات" سے گرفتار کرنے کے بعد میرا اہم ساتھی اور متعلقہ جہادی تنظیم کا ایک اور خطرناک کمانڈر بتایا جا رہا تھا۔ علی شیر کے حوالے سے جو بیان بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ وہ کم از کم میرے لئے نیا نہیں تھا لیکن اس میں اہم بات یہ تھی کہ علی شیر نے مجھے کراچی کا رہائشی بتایا تھا۔ جس سے مجھے اس بات کا تو یقین ہو گیا کہ اسے بھی بانو کے گروپ نے میری طرح گدھا بنا کر "ٹریپ" کیا ہے لیکن اس نے کمال ڈھٹائی سے متعلقہ عجیب و غریب قسم کی ایسی خطرناک اطلاعات دی تھیں۔ جن سے وقتی طور پر تو بھارتی ایجنسیاں

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

اور میڈیا سب خوش دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ علی شیر نے انہیں الو بنایا ہے اور تحقیقات پر یہ سب کچھ غلط ثابت ہوگا۔ جس کے بعد وہ آسانی سے بیان دے سکتا تھا کہ یہ سب کچھ زبردستی اس کے منہ میں ڈالا گیا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ اللہ سے اس کی استقامت برقرار رکھنے کی دعا کی اور اگلا لائحہ عمل دھراتا کمرے کے باہر آ گیا۔ باہر کھلی ہوا میں لمبے سانس لینے سے مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ ہم بانو کے اس شیطانی چنگل میں کیسے پھنس گئے؟ اب مجھے سمجھ آ گئی کہ ابتدا ہی میں انہوں نے علی شیر کو مجھ سے الگ کیوں کر دیا تھا۔ غالباً اسے "متبادل" کے طور پر محفوظ رکھا گیا تھا اور اب بے چارہ میرے بجائے قربانی کا بکرا بن گیا تھا۔

میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ خوف کے بجائے غصے نے غلبہ پایا تھا اور اب میری ایک ہی تمنا تھی کہ کسی نہ کسی طرح میں بانو جیسی حرافہ کی اصلیت جان کر اسے اس کے انجام تک پہنچاؤں جس کے بعد میں سرخرو ہو کر اپنے وطن واپس جا سکتا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر میں نے اپنی تربیت کے مطابق گرد و گرد ماحول کا جائزہ لیا اور فرار کے امکانی راستوں کا تعین کرنے لگا۔ یہ میری تربیت اور فطرت ثانیہ بن چکی تھی کہ ہم جس جگہ پر بھی جاتے۔ وہاں کی جغرافیائی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا تعین پہلے سے کر لیا کرتے تھے کہ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں اگر وہاں سے بھاگنا پڑے تو ہم کس طرف سے فرار ہوں گے۔

ساڑھے آٹھ بجے رات والی ملازمہ جس کا نام وشالی بتایا گیا تھا مجھے لینے آ گئی اور ہم ایک مرتبہ پھر کھانے کے کمرے میں موجود تھے۔ اس مرتبہ میز خالی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہاں اب صرف مجھے ہی ناشتہ کرنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ملازمہ میرے لئے ناشتہ لے آئی۔ ایسے ناشتے کا میں نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسی قابل ذکر کے ناشتے کی چیز تھی جو یہاں نہ رہی ہو۔ میں نے مصلحت کے تحت اپنی زبان بالکل بند رکھی اور اس خاتون کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔

ابھی بمشکل میں نے ناشتہ کر کے چائے اپنے کپ میں انڈیلی ہی تھی کہ مسز روپا اپنی بیٹی کے ساتھ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ وہی بچی تھی جس کو میں نے کل لوگوں کے قدموں تلے آ کر کچلے جانے سے بچایا تھا۔

میں انہیں دیکھتے ہی فوراً کھڑا ہو گیا اور اپنی جبلت پر قابو پاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں تعظیم دی۔

"بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ...... کوئی بات نہیں......" مسز روپا غالباً میرے کھڑے ہونے پر پریشان ہو گئی تھی۔

"یہ میری بیٹی پنکی ہے...... تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہے۔"

اس نے بچی کی طرف اشارہ کیا جو میرے قدرے قریب آ گئی تھی۔

"تھینک یو انکل......" اس نے بڑے دلنشین لہجے میں بچوں کی طرح مجھے مخاطب کیا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی...... یہ میرا فرض تھا۔" میں نے پہلے بچی اور پھر اس کی والدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں بھائی صاحب ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا ئیں گے۔ ملہوترا صاحب کو میں نے فون پر ساری بات بتائی تو وہ بھی آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہے تھے۔ ہمارا دوسرا بزنس آفس نیپال میں ہے۔ وہیں گئے ہوئے تھے ملہوترا صاحب۔ آج شام کی فلائٹ سے واپس آ رہے ہیں۔"

اس نے بڑے احسان مندی کے جذبات کا مظاہرہ کیا۔

"میڈم جی آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" میں نے عرض کیا "ناں یہ میرا فرض تھا۔ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو......"

"ناں بھائی کرپال سنگھ یہ بات نہ کرنا، وہاں کتنے لوگ موجود تھے۔ ایک دوسرے کو روند کر نکل جانا چاہتے تھے سب...... یہ انسان ہیں یا درندے...... بھگوان کا غضب پڑے ان پر...... شرم نہیں آتی انہیں...... اگر تم نہ ہوتے تو بھگوان نہ کرے میری بچی کو کچھ ہو جاتا...... اور میں......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"واہگورو خیر کرے گا...... کرپا کرے گا......" میں سوچ سوچ کر ہندی الفاظ جمع کر رہا تھا۔ آخر دنوں میں سکھ ڈرائیور کے ساتھ ہونے والے سفر سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

"ملہوترا صاحب آ جائیں تو ہم فیملی کا "گیٹ ٹو گیدرز" Get togather کریں گے۔" اس نے مجھے مطلع کر کے پریشان کر دیا۔

اگر وہ یہ تقریب میرے اعزاز میں کرنے جا رہے تھے تو یہ میرے گلے کا پھندہ بھی بن سکتی تھی۔ خدانخواستہ وہاں کسی نے مجھے پہچان لیا تو؟ یہاں تو ابھی دو چار لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ عین ممکن ہے وہاں سو دو سو لوگ جمع ہوں اور ان میں سے کتنے میرے ساتھ "تفصیلی تعارف" کے متمنی ہوں گے۔ ظاہر ہے یہ لوگ میرے متعلق تجسس ہوں گے۔ جاننا چاہیں گے۔ تب میں کس کس کے سامنے یہ کہانی دھراؤں گا؟ اگر کوئی اس علاقے کا نکل آیا جس کا میں نام لے رہا تھا یا اس کے نزدیک دور کسی گاؤں کا رہنے والا ہوا؟ اور اس نے مجھ سے اس سلسلے میں دو چار سوال جواب کر لئے تو؟ ان کے حلقہ احباب میں تو ہر طرح کے لوگ ہوں گے؟ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی ہو سکتے ہیں؟

جانے اس ایک لمحے میں کتنے خدشات نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسی کسی تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔ اب مجھے جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر واپس جانا تھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ کسی بھی لمحے میں ان شیطانوں کے پھیلائے جال میں پھنس سکتا تھا اور یہ بہت گھاٹے کا سودا تھا۔ مجھے اپنی جان کی پرواہ ہوتی تو اس کارزار میں قدم ہی کیوں رکھتا؟ میری تو لاش بھی ان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے تھی۔

"کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہو؟"

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے چونکایا۔

"جی کچھ نہیں...... کچھ نہیں......" میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"کچھ پریشان لگتے ہو؟"...... اس نے میری طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں...... بس...... سوچ رہا تھا گھر سے آئے آج گیارہواں دن ہے اور ابھی تک......"

"اوہو! بھئی اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں رہا۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مجھے اس بات کا تو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ خاصے معزز اور خاندانی لوگ ہیں کیونکہ عام ہندو گھرانوں والی یہاں مجھے کوئی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بانو کے ساتھ میں پانچ چھ ہندو گھرانوں میں جا چکا تھا......

اور اب یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر بانو کے والی وارثوں نے مجھے اپنا شکار ہی بنانا تھا تو میری اس طرح تربیت کی کیا ضرورت تھی؟ وہ شروع ہی میں یہ واردات کروا لیتے جو ہم نے آخر میں کی تھی لیکن پھر میں نے سوچا کہ ان لوگوں نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے یہ سارا گھڑاگ پھیلایا ہوگا۔

اچانک ہی مجھے ایک خیال نے چونکا دیا۔ کہیں مسز روپا نے ٹی وی پر خبریں تو نہیں سنیں؟ کہیں ان کا خیال میری طرف تو نہیں گیا؟ کیونکہ ٹی وی پر میری تصویر مسلسل دکھائی جا رہی تھی گو کہ میں اس حلیئے میں دکھائی جانے والی تصویر سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا لیکن ایک بے نام سا خوف میرے دل و دماغ سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔

"معلوم نہیں وہاں موجود دوسرے بے چارے لوگوں کا کیا بنا ہوگا؟" میں نے اچانک ہی اس سے پوچھ لیا۔ دراصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ ٹی وی دیکھ رہی ہے یا نہیں۔

"ہرپال سنگھ میں نے تو سختی سے ہدایت کر دی ہے کہ گھر میں کسی ٹی وی سیٹ پر کوئی نیوز چینل نہ لگایا جائے۔ میں نہیں چاہتی کہ پنکی مزید پریشان ہو۔ رات ہمارے فیملی ڈاکٹر نے اسے چیک کیا تھا اور یہی مشورہ دیا ہے...... میں بھی کل والے اس منحوس واقعے کو بھول جانا چاہتی ہوں"...... جب وہ یہ بات کر رہی تھی تو بھی خوف اس کے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

چہرے اور آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

"واقعی آپ نے صحیح کہا۔ ایسا سنا تو تھا لیکن زندگی میں یہ کچھ دیکھنا بھی پڑے گا۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا .... واہے گورو! واہے گورو!" .... میں نے ٹرک ڈرائیور سکھ کی طرح کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو ابھی تک ملہوترا صاحب کو بھی تفصیلات نہیں بتائیں۔ وہ ہارٹ کے مریض ہیں۔ خوامخواہ پریشان ہوں گے ...." مسز روپا نے کہا۔

"بہت اچھا کیا آپ نے میڈم جی .... بہت اچھا کیا۔ ہم تو جی دیہاتی بندے ہیں۔ بچپن سے دشمنیاں دیکھتے آ رہے ہیں۔ خاندان میں تین چار سال میں چھ قتل ہو چکے ہیں۔ اس لئے تو ماتا جی نے ادھر دلی بھیج دیا تھا۔ لیکن سچی بات ہے جی یہ تو ہمارے لئے بھی بڑی پریشان کن بات تھی۔ ایک مرتبہ تو میں بھی گھبرا گیا تھا .... معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس طرح ...."

"اوگروادی (دہشت گرد) تھے .... اور کون ہوں گے۔ یہاں آئے روز دہشت گردی کی وارداتیں ہی تو ہو رہی ہیں .... بھگوان جانے کیا بنے گا اس دیش کا؟" انہوں نے میری بات اچک لی۔

"یہ تو شرم کی بات میڈم جی .... آخر ہماری پولیس کیا کرتی ہے .... ؟" میں نے لقمہ دیا۔

"جھک مارتی ہے .... بے چارے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے .... جنتا کی کیا کریں گے؟" مسز روپا نے قدرے غصے سے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے جی آپ کی" .... میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"چلو لعنت بھیجو! تم اپنے لئے کچھ کپڑے پر چیز کر لو .... میں نے ڈرائیور کو بتا دیا ہے وہ تمہیں بازار لے جائے گا۔" انہوں نے کہا۔

"نو میڈم .... نو .... پلیز یہ مت کیجئے۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ میں خود بازار سے مطلب کی چیزیں لے آؤں گا۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی پلیز .... آپ مجھے نوکری پر لگوا دیں گے یہ کیا کم احسان ہے آپ کا .... ؟" میں نے نفی کے لہجے میں کہا۔

"ایک تو تم پنجابی لوگ ہر بات پر غیرت مند بن جاتے ہو .... بھئی کیا فرق پڑے گا اس سے؟" مسز روپا نے پوچھا۔

"میڈم میں پھر عرض کروں گا کہ آپ نے مجھے نوکری دے کر بھی مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں آپ کے اس احسان کا ہی شاید بدلہ نہ اتار سکوں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر مسز روپا نے اپنے خاوند کا تعارف کروانا شروع کیا اور مجھے بتانے لگیں کہ ان کا بزنس دہلی سے کھٹمنڈو تک پھیلا ہوا ہے اور انہیں ہمیشہ وفادار اور بہادر لوگوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کے خیال میں یہ خوبی مجھ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

"میں چلتا ہوں .... دوپہر تک لوٹ آؤں گا" .... میں نے اجازت طلب کی۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی" .... مسز روپا نے جواب دیا۔

میں اسے "پرنام" کر کے باہر آ گیا۔ دہلی میں پہلی مرتبہ تو آیا نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مجھے یہاں کے راستوں کا علم تھا۔ البتہ اپنا اعتماد بحال کرنے اور خاص طور پر کل والی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے میرا باہر نکلنا ضروری تھا۔ آخر گھر میں کب تک چھپ کر عورتوں کی طرح بیٹھا جا سکتا تھا۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر آ گیا۔

مسز روپا نے اپنے گھر کا فون نمبر مجھے دے دیا تھا۔ میں نے گھر سے باہر آ کر پہلے قریباً پندرہ منٹ اسی ایریا میں گھوم پھر کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ بڑی ماڈرن آبادی تھی یہاں کے مکانات اور واحد مارکیٹ اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ عام آدمی کے لئے ایسے علاقے میں رہائش اختیار کرنا ممکن نہیں۔ میں نے کالونی کی مارکیٹ سے بظاہر ایک عام سی دکان سے جاتے ہوئے کالے شیشوں کی عینک خرید کر لگائی تھی اور اپنا چہرہ شیشے میں غور سے دیکھنے کے بعد ہی مجھے علم ہوا تھا کہ [illegible] میں ہوں۔

عینک لگانے کے بعد مجھے خود یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میرا تعلق دہلی کی وی آئی پی کلاس کے لوگوں سے ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہ شرٹ، پتلون بھی تھی جو میں نے پہن رکھی تھی اور جو پہلے سے میرے کمرے کے وارڈ روب میں موجود تھی۔ معلوم نہیں کہ کس کا سائز تھا لیکن مجھے بالکل ایسے فٹ بیٹھا تھا جیسے میرے ہی لئے بنایا گیا ہو۔

یہاں سے میں پیدل ہی چلتا چلا گیا۔ قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے میں دہلی میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس دوران بطور خاص میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ خدا جانے میں کیوں اتنا فکر مند تھا۔ شاید اس کی وجہ ماحول سے نا آشنائی تھی ورنہ تو افغانستان میں جس طرح کی خطرناک مہمات ہم نے سر کی تھیں اور خصوصاً دوستم کی جیل میں جس طرح کے ستم برداشت کئے تھے خصوصاً امریکیوں کی طرف سے جیسے ہمیں گوانتاناموبے لے جانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ اس ماحول میں بھی مجھے کبھی اس طرح گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی۔

میں اس وقت دہلی کے ایک قدرے بارونق ڈھابے پر موجود تھا۔ جہاں ایک کونے میں دھرا ٹی وی چیخ چیخ کر گزرے کل کی واردات دہرا رہا تھا۔ یہاں بھی وقفے وقفے سے میری تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی "پولیس کے کارنامے" بیان کئے جا رہے تھے۔ جس نے بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "آتنک وادیوں" (دہشت گردوں) کے شکنجے سے یرغمالیوں کو رہائی دلائی تھی۔

پولیس کے بیان کے مطابق دہشت گردوں کے اس حملے میں 16 بے گناہ مارے گئے تھے اور ظاہر تھا کہ ان میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو پولیس اور سکیورٹی فورسز کی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوئے ہوں گے کیونکہ پولیس نے اسے ڈرامے میں بہرحال حقیقت کا رنگ بھرنا تھا۔ اس کے بعد "تین گرفتار دہشت گرد" دکھائے گئے۔ یہ تینوں بہرے جیسے وہ گدھے تھے۔ جنہیں پہلے ہی سے اس مقصد کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ان میں "شیر خان" میری توقعات کے مطابق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ "فرار" ہو چکا ہو گا۔ اس کے علاوہ تین مجاہدین کی لاشوں کی نمائش کی جا رہی تھی۔ جن کے چہرے بھی شاید ان کے مرنے کے بعد غصے میں بپھری بھارتی سکیورٹی فورسز نے گولیاں مار مار کر بگاڑ دیئے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں متعدد مرتبہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب مجھ میں کھویا اعتماد واپس لوٹ رہا تھا۔ جس کا ثبوت یہ تھا کہ میں نے بھی اس ڈھابے میں موجود باقی لوگوں کی طرح اس ساری صورتحال کو انجوائے کیا تھا اور میں بھی باقی لوگوں کی طرح اس پر اپنا تبصرہ بھی کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں موجود لوگ دہشت گردوں کو تو برا بھلا کہہ ہی رہے تھے لیکن اس سے زیادہ ماتم اپنی سکیورٹی فورسز کا کر رہے تھے۔ جس کی نااہلی کی وجہ سے ان کی زندگی جہنم بنتی جا رہی تھی اور انہیں ہر وقت جان اور مال کے خطرات لاحق رہتے تھے۔

میں نے اطمینان سے یہاں چائے کے ساتھ سموسے کھائے جو یہاں کا معمول تھا اور پھر ٹہلتا ہوا باہر نکل آیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اب اس ذلیل کے ٹھکانے پر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور "را" کا کوئی سب آفس یا "سیف ہاؤس" ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک فیصلہ کیا تھا۔ بانو اور اس کے ساتھیوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کا فیصلہ۔ ان لوگوں نے میری زندگی سے کھلواڑ کیا تھا اور اب میں ان کا حساب چکتا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مجھے الہ آباد بھی جانا پڑا تو ضرور جاؤں گا لیکن میں ان درندوں سے اپنا حساب ضرور برابر کروں گا۔

میں آپ کو بار بار یاد دلا رہا ہوں کہ بعض ناگزیر مجبوریوں یا مصلحتوں کے تحت میں ان مقامات کا نام نہیں لکھ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

رہا جن کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ رہے ہوں گے۔ مجھے اپنی جان کی پرواہ نہ کبھی پہلے تھی نہ اب ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے خاندان یا گھر والوں پر کوئی عذاب نازل ہو اور نہ ہی میرا ضمیر کبھی یہ برداشت کرے گا کہ میری کسی بھی نادانی کی وجہ سے میرے ملک پر کوئی آنچ آئے۔

ایڈووکیٹ کھنہ کا دفتر مجھے ازبر تھا۔ میں نے وہاں تک جانے کے لئے رکشہ یا ٹیکسی کے بجائے بس کا سہارا لیا تھا۔ دہلی میں ٹرانسپورٹ کا انتظام قدرے بہتر ہے اور قدرے قابل اعتبار بھی۔ قریباً دو گھنٹے تک دو تین بسیں بدلنے کے بعد میں ایڈووکیٹ کھنہ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں اس کے آفس نما گھر سے خاصی دور ہی بس سے اتر گیا تھا اور اب پیدل اس طرف جا رہا تھا۔ قریباً دس بارہ منٹ پیدل چلنے کے بعد مجھے اس کا ٹھکانہ دکھائی دینے لگا تھا۔ جس کے باہر تین چار پرائیویٹ کاریں کھڑی تھیں۔ کیا ان میں سے کسی کار پر بانو یا اس کا کوئی ساتھی بھی کھنہ سے ملنے آیا ہے؟ یہ تھا وہ سوال جو مجھے بے چین کر رہا تھا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے دکھائی دے جائے۔ جس کے بعد ہی میں اگلا لائحہ عمل طے کر سکتا تھا۔

میرے لئے اس کوٹھی کے اندر جانا تو اپنی موت کو خوامخواہ دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ ابھی مجھے باہر ہی رک کر صورتحال کا جائزہ لینا تھا۔ کاروں کے ساتھ ایک کونے میں تین چار موٹر سائیکل بھی کھڑے تھے۔ غالباً یہ سب وہ لوگ تھے جو کھنہ سے ملنے آئے تھے۔

میں نے کھنہ کے گھر کے سامنے سے قریباً بیس گز چوڑی سڑک کے مخالف سمت کچھ فاصلہ پر ایک دفتر نما کوٹھی کے باہر ایک خوانچہ فروش کے نزدیک چلا گیا۔ جو ایک ریڑھی پر برتن رکھے چائے بنا کر فروخت کر رہا تھا۔ وہاں کچھ بابو لوگ چائے پی رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وہ لوگ تھے جو یہاں کوٹھیوں میں موجود دفاتر میں کام کرتے تھے اور ان کے لئے یہی ایسی جگہ تھی جہاں وہ چائے وغیرہ پی سکتے تھے۔ خوانچہ فروش نے لکڑی کے دو تین بینچ رکھے ہوئے تھے۔ میں بھی ایسے ہی ایک بینچ کر بیٹھ گیا۔

خوانچہ فروش کے ساتھ موجود لڑکے نے چائے کا کپ مجھے تھما دیا۔ بسے میں اپنے ہونٹوں سے لگائے کھنہ کے گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ کوٹھی کا دروازہ کھلا اور میں چونکا۔ وہاں سے برآمد ہونے والی شخصیت کو میں کیسے بھلا سکتا تھا یہ کھنہ کا وہ پی اے تھا جو اس کے معاملات کو ڈیل کرتا تھا۔ پی اے کسی کے ساتھ باتیں کرتا باہر آ رہا تھا۔ دونوں کے چہرے مجھے بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ نجانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کو جو پی اے کے ساتھ باہر آ رہا ہے میں نے ضرور کہیں دیکھا ہوا ہے۔ لیکن کہاں؟ اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ پی اے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا پھر دونوں نے ہاتھ ملایا اور اندر سے پی اے کے ساتھ برآمد ہونے والا نوجوان وہاں موجود ایک موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے اس پر سوار ہوا اور وہاں سے نکل گیا۔ اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ اس نوجوان کو میں نے فلہ آباد والے ٹھکانے پر دیکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے بانو اور میرا خیر مقدم کیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ضرور دال میں کچھ نہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک کالا ہے اور یہ بھی دکھائی دے رہا تھا کہ مجھے اپنا گوہر مراد بھی یہاں سے مل جائے گا۔

چائے پی کر میں نے اسے پیسے دیئے۔ پانچ چھ منٹ وہاں بیٹھا رہا، پھر واپس چل دیا۔ شام ڈھل رہی تھی جب میں مسز روپا کے گھر واپس پہنچا۔ جہاں مسز روپا میری منتظر تھیں۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟"..... اس نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

"جی اپنے گاؤں کے ایک ساتھی سے ملنے گیا تھا"..... میں نے دہلی کے نزدیک ایک مضافاتی علاقے کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"وہ اصل میں گاؤں جا رہا تھا ہاں..... میں نے کہا خیر خیریت کا پیغام بھیج دوں۔"

"اوہو بھئی بتا کر تو جانا تھا..... فون کر دیتے"..... انہوں نے تردید کیا۔

"معافی چاہتا ہوں جی..... میرے پاس ایک موبائل تو تھا لیکن وہ افراتفری میں ہوٹل میں ہی گر گیا تھا۔" میں نے عذر پیش کیا۔

"میں پہلے تمہارے لئے موبائل فون کا بندوبست کروں..... باقی باتیں بعد میں ہوں گی....." انہوں نے کہا اور میں مطمئن ہو گیا۔ واقعی مجھے ایک محفوظ موبائل فون کی اشد ضرورت تھی۔

"ملہوترا صاحب رات دس بجے کی فلائیٹ سے واپس آ رہے ہیں....." انہوں نے اگلی خبر دی۔

"جی"..... میں نے صرف ایک لفظ کہنے پر اکتفا کیا۔

میں تو گھر پر ہی رہا۔ رات کے قریباً گیارہ بجے مسز روپا اپنے دو گارڈز کے ساتھ مسٹر ملہوترا کو لینے چلی گئیں۔ میں اس کمرے میں موجود تھا جب مجھے روپالی نے اطلاع دی اور اب میں ان سے ملنے جا رہا تھا۔

O

نیا باب

رات کی فلائیٹ سے ملہوترا صاحب دہلی واپس آ گئے۔ مسز ملہوترا انہیں لینے کے لئے ائیر پورٹ گئی تھیں گو کہ انہوں نے نیپال میں انہیں اپنے ساتھ گزرنے والے حادثے سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن ائیر پورٹ سے گھر تک آتے ہوئے انہیں ساری تفصیلات بتا دی تھیں اور وہ اب میرے خاصے مشکور اور مہربان دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شاید کوئی پنجابی فیملی تھی کیونکہ ہماری طرح بھارت میں بھی پنجاب کے لوگ اپنے رہن سہن اور گفتگو اور چال ڈھال سے پہچانے جاتے ہیں۔ مسٹر ملہوترا نے نہ صرف مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا بلکہ معانقہ بھی کر لیا تھا حالانکہ میں نے احتراماً ان کے سامنے صرف ہاتھ ہی باندھے تھے۔

"مجھے بیگم نے سب کچھ بتا دیا ہے..... سمجھ نہیں آتی کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں"..... انہوں نے میری طرف دیکھ کر بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ غالباً پنکی ان کی واحد اولاد تھی اور میاں بیوی دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

"یہ تو میرا دھرم تھا مہاراج جی"..... میں نے بڑی انکساری سے جواب دیا

"او مائی گاڈ..... بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے نیپال میں اس کا علم نہیں ہوا۔ یہ نیوز تو چل رہی تھی کہ آتنک وادیوں نے ہوٹل پر قبضہ کر لیا ہے لیکن اس میں میری پتنی اور پنکی....." ان کی آواز بھرا گئی۔

میں آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ مسٹر ملہوترا اپنے خاندان کے ساتھ کتنے وفادار ہیں۔ انہیں اپنی فیملی سے کتنی محبت ہے۔

"اگر تم پسند کرو تو ہمارے نیپال والے آفس کے سکیورٹی انچارج بن جاؤ۔" انہوں نے کچھ دیر بعد مجھے آفر کی۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے تو اس پر دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

کلمہ شکر ادا کیا۔ میرے تو سر پر دھرا پہاڑ جیسے سرک گیا ہو۔

مسٹر ملہوترا کی طرف سے نیپال میں نوکری کی آفر نے مجھے اس بات کا یقین دلا دیا کہ اللہ نے مجھ گناہگار کی التجائیں قبول کر لی ہیں اور اب جلد یا بدیر میں اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد انشاء اللہ اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا۔

مسٹر ملہوترا نے مجھ سے گاؤں کا ایڈریس اور دیگر معلومات کے لئے کہا تو میں نے انہیں لاپرواہی کے انداز میں کہا تھا۔

''مہاراج ہم سیدھے سادھے کسان ہیں۔ آٹھویں جماعت تک رو دھو کر پڑھ لیں ہیں کیا خبر کون سا کاغذ بنانا اور کہاں سے بنانا ہے آپ خود ہی مہربانی کر دیں۔''

''ہاں ہاں .... ٹھیک تو کہہ رہا ہے .... '' مسز ملہوترا نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

''نو پرابلم .... یہ کون سا مسئلہ ہے .... '' انہوں نے خود ہی کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور بتایا کہ وہ اپنے منیجر کی ذمہ داری لگا دیں گے۔ وہی میری تصویر وغیرہ بھی بنوا لے گا۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اتنا خطرناک مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا ہے۔ شکلا صاحب جیسے لوگوں کے لئے میرے شناختی کاغذات تیار کروانا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور ان کے تیار کردہ کاغذات پر جعلی ہونے کا شک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اگلے ہی روز وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے آفس لے گئے۔ مسٹر ملہوترا ایک مرسڈیز گاڑی میں اپنے ساتھ مجھے بٹھا کر لائے تھے۔ جس کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔ جب ہم ان کے آفس کے سامنے رکے تو وہاں موجود تین چار گارڈز ہماری طرف لپکے۔ انہوں نے شکلا صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سیلوٹ کر دیا۔ میں دل ہی دل میں مسکراتا ملہوترا صاحب کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا۔

اس آفس اور جس گاڑی میں بیٹھ کر میں یہاں آیا تھا اس سے ملہوترا صاحب کی امارت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ ان کا آفس بلاشبہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا آفس دکھائی دے رہا تھا۔ بانو جیسی لڑکیاں اور لڑکے یہاں مختلف کیبنوں میں جدید ترین کمپیوٹرائزڈ نظام کے ساتھ مستعد دکھائی دے رہے تھے۔ ملہوترا صاحب مجھے اپنے آفس میں اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ آفس کا دروازہ جس لڑکی نے کھولا تھا۔ اس کے متعلق میں اتنی ہی بات کہہ سکتا ہوں کہ بھارتی فلموں کی سکرینوں پر لاکھوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر جگمگانے والی کئی ہیروئنوں سے وہ زیادہ خوبصورت تھی اور پہلی نظر میں مجھے وہ ان ہی میں سے کوئی ایک دکھائی دی تھی۔

ملہوترا صاحب کا آفس بلاشبہ ایک ڈیڑھ مرلے پر محیط ایک کمرہ تھا جس میں دنیا کا جدید ترین الیکٹرونک سامان اور نظام نصب تھا۔ انہوں نے مجھے اشارے سے جس صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ اس پر بیٹھنے سے مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں اس میں دھنس گیا ہوں۔ بمشکل میں نے خود کو نارمل کیا اور خاموشی سے اس خوبصورت لیڈی سیکرٹری کی طرف چوری چھپے دیکھنے لگا جو مسٹر ملہوترا کے کرسی سنبھالنے کے بعد ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے سامنے دھری فائل میں سے انگریزی میں کچھ پوائنٹس انہیں بتا رہی تھی اور ملہوترا صاحب اس سے مصروف گفتگو تھے۔ دونوں پندرہ بیس منٹ تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ جس کے بعد مسٹر ملہوترا نے اسے کسی کا کا صاحب کو بلوانے کے لئے کہا۔

سیکرٹری نے اثبات میں سر ہلایا اور وہیں موجود ایک فون پر ''کا کا صاحب'' کو آنے کے لئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آفس سے چلی گئی۔

''ادھر آ جاؤ'' .... ملہوترا صاحب نے اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

''کچھ پیو گے؟'' .... انہوں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''نو سر .... تھینک یو سر'' .... میں نے نفی میں سر ہلایا۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور اگلے ہی لمحے قریباً ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر کا ایک بنگالی بابو ہاتھ میں کاپی پنسل پکڑے اندر آ گیا۔ اس نے ملہوترا صاحب کو تعظیم دی اور ان کے اشارے پر دوسرے کونے پر دھری کرسی پر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

''یہ مسٹر ہردیال سنگھ ہے'' .... انہوں نے انگریزی میں میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا .... بہت بہادر اور وفادار .... میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی۔

''یس سر! یہ سکھ لوگ بہت بہادر اور وفادار ہوتا ہے'' .... کا کا صاحب نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔

''اسے ہم نے کھٹمنڈو آفس میں سیکیورٹی انچارج رکھ لیا ہے۔ ان کے تمام کاغذات اور پرمٹ وغیرہ تین چار روز میں تیار کروا لو۔ پھر اسے کھٹمنڈو جانا ہے۔''

''جرور، جرور، ٹھیک ہے صاحب'' .... کا کا صاحب نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ مسٹر ملہوترا اسے ہدایات دیتے رہے اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو کا کا صاحب کو بتا دینا۔ اگر کہیں جانا چاہو تو گاڑی لے جاؤ .... یا پھر جیسے تمہاری مرضی۔''

''ٹھیک ہے سر!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کا کا صاحب کے ساتھ باہر آ گیا۔

''صاحب نے تمہارا بہت خیال رکھنے کو بولا ہے .... پہلے تمہیں دیکھا نہیں کبھی'' .... کا کا صاحب نے باہر آتے ہی سب سے پہلا سوال کیا۔

''ہم ان کے گاؤں کے رہنے والے ہیں ناں .... میرے بزرگ ان کے گھرانے کی [illegible] سے خدمت کر رہے ہیں'' .... میں نے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا۔

''اچھا .... تو یہ بات ہے۔ ہم اب سمجھا .... ملہوترا صاحب اس لئے تم پر بہت اعتبار کرتا ہے۔'' کا کا صاحب نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ان کے کمرے میں آ گئے تھے۔ منیجر ہونے کی وجہ سے ان کا یہاں خاصا احترام تھا۔ کا کا صاحب نے میرے ''ناں ناں'' کرتے میرے لئے یہاں چائے منگوالی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پرانے ملازمین کی فطرت کے عین مطابق کا کا صاحب بھی میری خوشنودی حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک میں ملہوترا صاحب کا ''گھر کا بندہ'' تھا اور مستقبل میں اس ادارے میں اپنا اثر رسوخ برقرار رکھنے کے لئے اسے بہرحال میری خوشنودی درکار تھی۔

''میرے لئے موٹر سائیکل کا بندوبست کر دیں۔ ایک دو ضروری کام ہیں'' .... میں نے کا کا صاحب کے منگوائے ہوئے کچھ کاغذات جن کے تمام اندراج انہوں نے اپنے قلم سے کئے تھے پر دو تین جگہ ہردیال سنگھ کے نام سے دستخط کرنے کے بعد کہا۔ اس اثناء میں ایک فوٹو گرافر میری کچھ تصاویر بھی بنا گیا تھا۔ جو ان شناختی کاغذات کے لئے استعمال ہونی تھی۔ پگڑی چونکہ اب میرے لباس کا حصہ بن چکی تھی اور مجھے ہر وقت سکھوں والے روپ میں رہنا تھا۔ اس لئے تصاویر بھی اس کے ساتھ ہی بنوائی تھیں۔ کا کا صاحب نے پگڑی کے بغیر تصویر بنانے کے لیے کہا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ آئندہ کسی سکھ سے یہ ڈیمانڈ نہ کرنا ....

بے چارہ قدرے گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بڑا دھارمک قسم کا سکھ ہوں اور اب اس کی کوشش تھی کہ کوئی ایسی بات نہ کرے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

''گاڑی حاضر ہے صاحب ....'' میرے موٹر سائیکل ڈیمانڈ کرنے پر اس نے بے ساختہ مجھے بھی ''صاحب'' ہی کہہ دیا۔

''کاکا صاحب آپ ہمارے بڑے اور کمپنی کے منیجر ہیں۔ پلیز مجھے ''صاحب'' کے بجائے صرف ہردیال سنگھ کہیں..........اور مجھے گاڑی میں نہیں جانا.......... کچھ ضروری کام ہیں۔ موٹر سائیکل پر ہی ہوں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے نارمل کیا۔

''جیسا آپ کی مرضی.......... جیسا آپ کی مرضی''.......... اس نے اطاعت گزاری کا مظاہرہ کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد میں ایک ہلکی پھلکی اور قریباً نئی موٹر سائیکل پر یہاں سے اس حالت میں رخصت ہو رہا تھا کہ ہیلمٹ میری پگڑی کے اوپر پھنسا ہوا تھا۔ مجھے علم تھا دلی میں ہیلمٹ کے بغیر موٹر سائیکل چلانا جرم ہے۔ اس قانون کی زیادہ لوگ پاسداری کرتے تھے۔ یوں بھی ابھی میں کسی معاملے میں پولیس سے الجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

مجھے موٹر سائیکل چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ ہمارے لئے افغانستان اور پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں موٹر سائیکل ہی سب سے زیادہ مضبوط، مستحکم اور قابل اعتبار سواری تھی۔ دلی کی سڑکوں کا کچھ علم نہیں تھا لیکن اپنی یادداشت پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ اللہ نے مجھے اس خوبی سے نوازا تھا کہ مجھے بلی کی طرح راستے ازبر ہو جاتے تھے۔ یوں بھی میں محسوس کرتا تھا کہ جنگل میں ''بابا'' نے مجھے جو کڑوا کسیلا امرت پلایا تھا۔ اس نے ذہنی اور جسمانی طور پر مجھے واقعی پہلے سے مضبوط کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو رہا تھا۔

راستے میں لگے سڑکوں کے مختلف سائن بورڈ پڑھتے ہوئے بالآخر میں اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ یہ مسٹر کھنہ کا آفس اور وہی جگہ تھی جہاں میں اگلے روز موجود تھا۔

موٹر سائیکل کے اس سفر نے میرا اعتماد پہلے سے بھی بڑھا دیا تھا۔ میں نے کل کی طرح آج بھی موٹر سائیکل ایک محفوظ جگہ پارک کی اور ایسی پوزیشن میں کھڑا ہو گیا کہ گیٹ کے سامنے کا منظر نمایاں رہے۔ قریباً دس منٹ بعد میری مراد اس وقت بر آئی جب میں نے گیٹ سے اس نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ جسے ہوٹل پر حملے کے دوران بطور خاص میرا نائب بنا کر میرے ساتھ لگایا گیا تھا۔ مجھے اس کا نام نعمانی بتایا گیا تھا۔ اب میرے لئے مزید کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے عین الیقین کی حد تک دیکھ لیا تھا کہ یہ سارا گورکھ دھندہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی نے ہی پھیلایا تھا۔ جس میں میرا استعمال ایک ٹشو پیپر سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ میرا تو خون ہی کھول اٹھا۔

نعمانی باہر پارکنگ میں کھڑی ایک کار تک گیا اور اب اسے ڈرائیو کرتا وہ مین سڑک پر آ رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور قدرے فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا گو کہ اس علاقے میں ٹریفک کم تھی کیونکہ یہ دہلی کا خاصا پوش اور الگ تھلگ علاقہ تھا لیکن جلد ہی ہم زیادہ ٹریفک والی سڑک پر آ گئے اور دلی کی ٹریفک، خدا کی پناہ، یہاں کی سڑکوں پر تو کار کو سائیکل کی طرح چلانا پڑتا ہے۔ بالکل کراچی کی ٹریفک کی طرح یہاں سب سے کارآمد سواری موٹر سائیکل ہی ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ اگر کہیں نعمانی کے گمان میں بھی یہ بات پہلے سے موجود ہو کہ کوئی اس کا تعاقب بھی کر سکتا ہے تو بھی اس ٹریفک میں وہ اس امکان پر نظر رکھنے کی حماقت نہیں کرے گا جبکہ عملاً ایسا تھا بھی نہیں۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ انٹیلی جنس کے ملازم یا ناؤٹ ہونے کی وجہ سے کسی کو ان پر میلی آنکھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں ہوگی اور جہاں تک میرا تعلق ہے۔ پہلے انہیں میری لاش نہیں ملی تھی لیکن وہ شاید ہی یہ سوچ رہے ہوں کہ میں ابھی تک زندہ اور اسی شہر میں موجود ہوں کیونکہ انہوں نے اپنی دانست میں میرے لئے ایک ہی آپشن چھوڑا تھا اور وہ تھا ''موت''.......... یہ موت مجھے ان کے ہاتھوں ملتی یا پھر میں خودکشی کر لیتا۔ وہ تو یہی منصوبہ بنائے ہوئے تھے کہ اگر میں زندہ پاکستان پہنچ بھی گیا تو

پاکستانی ایجنسی کے لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ اپنی دانست میں انہوں نے مجھے ایسی بند گلی میں دھکیل دیا تھا۔ جس کے چاروں طرف سنگلاخ اور اونچی دیواروں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی مجھے اس بات کا علم تو نہیں تھا کہ پاکستان میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا! لیکن میں کسی بھی سلوک کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ میرے لئے یہاں بے غیرتی اور بے بسی کی موت مرنے سے اپنوں کے ہاتھوں مرنا اور اپنی زمین پر دفن ہونا ہی احسن تھا۔

میں مناسب فاصلہ رکھ کر آسانی سے نعمانی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس تعاقب کا خاتمہ نئی دہلی کی ایک جدید کالونی پر ہوا۔ جہاں شاندار کوٹھیاں اور بنگلے دکھائی دے رہے تھے۔ نعمانی نے ایک ایسے ہی بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہارن بجایا۔ دروازہ کھلا اور وہ کار سمیت اندر چلا گیا۔ میں بنگلے کا نمبر پڑھتا اس کے سامنے سے گزر گیا۔ یہ نمبر میرے دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کالونی کے گرد اگرد گھوم پھر کر اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ قریباً دس منٹ تک یہاں مختلف گلیوں اور مقامی مارکیٹ کے چکر کاٹنے کے بعد اب مجھے کافی حد تک یہاں سے فرار ہونے کے راستے سمجھ آ چکے تھے۔ اپنے اطمینان کے لئے میں نے یہاں ارد گرد کے مکانات کی بہت سی نیم پلیٹس بھی پڑھ لی تھیں اور نزدیک دور کی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد اس قابل ہو گیا تھا کہ یہاں سے مختلف ہاؤسز اور مارکیٹوں کو آنے اور جانے والے راستوں کو سمجھ سکوں۔

فی الوقت میں نے اس پر اکتفا کیا تھا زیادہ دیر یہاں گھومنا یا اپنے ٹارگٹ کے سامنے زیادہ جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نعمانی کے تعاقب اور اس بنگلہ تک پہنچنے کے بعد مجھے قدرے اطمینان نصیب ہوا تھا اور یہ یقین بھی پیدا ہونے لگی تھی کہ اب میں اپنے قاتلوں تک رسائی ضرور حاصل کر لوں گا اور اپنے ساتھ کیا وعدہ بھی نبھاؤں گا جو اب میری زندگی کا مقصد بن گیا تھا۔

میں گھر جان بوجھ کر شام ڈھلے ہی پہنچا۔ تب تک ملہوترا صاحب گھر آ چکے تھے۔ موٹر سائیکل سے کر میں گیٹ تک پہنچا تو چوکیدار نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ میں نے انیکسی کا رخ کیا اور موٹر سائیکل اپنے کمرے کے سامنے پارک کر کے کمرے میں آ گیا۔ جس کی میری غیر موجودگی میں اچھی طرح صفائی ہو چکی تھی۔ جس کا میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا۔ باتھ روم میں نئے تولیے اور صابن رکھے جا چکے تھے اور شیمپو کی نئی بوتل بھی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے پگڑی اتار کر ایک طرف رکھی۔ وضو کر کے نمازیں مکمل کیں اور پلنگ پر بیٹھ کر لیٹ کر اگلی منصوبہ بندی پر غور کرنے لگا۔ میرا پرائم ٹارگٹ بانو تھی باقی لوگوں کا نمبر بعد میں آتا تھا۔ ان میں سے کسی کے متعلق مجھے اب کوئی خوش گمانی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ سب لوگ جو ''را'' کی محفوظ لگژری پناہ گاہوں میں عیش کر رہے تھے مجھے تو مسلمان بھی نہیں لگتے تھے اور محسوس کر رہا تھا کہ ممکن ہے انہوں نے صرف اپنے نام ہی مسلمانوں والے رکھے ہوں۔ اگر یہ بھارتی مسلمان بھی تھے تو سب ''را'' کے تنخواہ دار ایجنٹ اور باقاعدہ ملازم تھے۔ جنہیں اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ انہیں کس بات کی تنخواہ دی جا رہی ہے۔

ٹی وی سوئچ آن کیا تو وہ مخصوص چینلز ابھی تک دہلی کی اس دہشت گردی کا راگ الاپ رہے تھے۔ جس کا مرکزی کردار مجھے بنایا گیا تھا۔ مجھے اس پر تو کوئی افسوس نہیں تھا لیکن اچانک ہی میرا دل دھک سے رہ گیا جب ٹی وی اناؤنسر نے ''اہم ترین خبر'' سنانی شروع کی یہ ایک پاکستانی ٹی وی چینل کی رپورٹ تھی۔ جس کے اینکر ہمارے گاؤں کے لوگوں کا انٹرویو کر رہا تھا اور معاملات، صورتحال اور سازش سے بے خبر بے چارے سیدھے سادے لوگ میرے متعلق اپنے اپنے اندازے بتا رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ٹی وی پر بھائی صاحب کی تصویر اور غصیلی آواز سنائی دی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس بدتمیز ''اینکر پرسن'' نے زبردستی ان کو کمرے کے سامنے لا کر مائیک ان کے منہ کے سامنے کیا ہے۔ بھائی صاحب اس سے الجھ رہے تھے کہ وہ زبردستی بے خبر اور سیدھے سادے لوگ کے منہ میں پہلے

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

سے تیار کردہ فقرے اگلوا رہا ہے۔ وہ اسے دشمنوں کا ایجنٹ اور غدار کہہ رہے تھے جبکہ بے شرم "اینکر پرسن" ان سے مسلسل سوالات کر رہا تھا ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے اسے پہلے سے تیار کر اس مشن پر بھیجا گیا ہے۔ بھائی صاحب اس سے ایک ہی بات تکرار سے کہہ رہے تھے کہ کسی نے میرے بھائی کی تصویر کا جعلی پاسپورٹ بنا کر بھارتی ٹی وی چینلز پر چلا دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا اگر میں ہی مطلوبہ دہشت گرد ہوں تو کہاں ہوں؟ بھارتی حکومت مجھے زندہ یا مردہ سامنے کیوں نہیں لاتی اور یہ سارا گھڑاگ پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے پھیلایا گیا ہے۔ انہوں نے اس "اینکر پرسن" سے کہا کہ تم بھی اس سازش کا حصہ دکھائی دیتے ہو۔ چالاک بھارتیوں نے آگے کا بیان ایڈٹ کر دیا۔

اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی حکومت اور خصوصاً ایجنسیوں پر غصہ آیا کہ انہوں نے کس طرح کی آزادی پاکستانی میڈیا کو دے رکھی ہے۔ جسے اپنی ذمہ داری کا بھی احساس نہیں اور اس کا اندازہ بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نمبر بنانے اور خود کو زیادہ باخبر دکھانے کے چکر میں وہ ملکی **سالمیت** سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔

میں نے ٹی وی سوئچ آف کیا اور دوبارہ پلنگ پر گر پڑا۔ سخت ذہنی کوفت کا شکار تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہمارے میڈیا میں اتنے غیر ذمہ دار لوگ کہاں سے آ گئے ہیں؟ یا پھر ان کا تعلق بھی بانو والے گروپ سے ہے اور انہیں پاکستان میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے اٹیچ کیا گیا ہے۔

ٹیلی فون نے گھنٹی نے خیالات کا سلسلہ توڑا۔ دوسری طرف کوئی عورت کمرے میں آنے کے لئے کہہ رہی تھی۔

میں نے خود کو نارمل کیا۔ سر پر پگڑی رکھی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ جہاں مسٹر اور مسز ملہوترا میرے منتظر تھے۔

"کہاں رہے بھئی سارا دن؟"............ ملہوترا صاحب نے میری خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا۔

"مہاراج جی! یہاں اپنے گاؤں کے دو تین لوگ ہیں۔ ایک کا ڈھابہ بھی ہے۔ ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔"

میں نے انکساری سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اور کیا کرے بے چارہ............ سارہ دن پڑے پڑے بور ہونے سے تو بہتر ہے ناں۔" مسز ملہوترا نے میری حمایت میں کہا۔

"کر لو تین چار دن موجیں............ پھر وہاں نیپال میں بھی زیادہ وقت گزرے گا............ کبھی دیکھا ہے نیپال پہلے؟"............ ملہوترا صاحب بولے۔

"نہیں صاحب............ میں نے تو اپنے پنجاب کے تین چار شہر یا پھر دلی کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا"............ میں نے عاجزی دکھائی۔

"وہاں اکیلے پریشان تو نہیں ہو گے............ ہمارے پندرہ بیس "ایمپلائی" ہیں وہاں لیکن اتفاق سے کوئی پنجابی نہیں"............ انہوں نے اگلی اطلاع دے کر میرا دل ہی خوش کر دیا۔

"صاحب جی مجھے تو بہت خوشی ہو گی۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا۔ گھر والے تو بہت ہی خوش ہیں۔ آج چاچا جی آئے ہوئے تھے۔ وہ تو آپ کا دھن باد کرنے آنا چاہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا"............ میں نے بات بنائی۔

"اوہو............ انہیں لے آتے............ اب لے آؤ............" مسز ملہوترا نے کہا۔

"اور کیا............" ملہوترا صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اب تو وہ چلے گئے جی............ کوئی بات نہیں۔ اگلی مرتبہ گاؤں سے آپ کے لئے گھی اور گڑ لے کر آئیں گے"............ میں نے جواب دیا۔

"اوہو! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ اچھی بات نہیں۔ آئندہ ان سے ضرور ملاقات کروانا"............ ملہوترا صاحب نے کہا۔

"سر جی! وہ تو بہت خوش تھے۔ ہماری وہاں گاؤں میں بہت دشمن داری ہے۔ دشمن آج کل میرے چکر میں پڑے ہیں۔ میرے کزن نے ان کے دو بندے مار دیئے تھے ناں............ چاچا جی چاہتے ہیں کہ میں گاؤں سے دور ہی محفوظ رہ سکتا ہوں............ یہ تو آپ مجھ پر کرم فرما رہے ہیں کہ میں نیپال میں رہوں گا"............ آخری بات کہہ کر میں نے انہیں پوری طرح مطمئن کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ان کے ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھا۔ جہاں مجھے ملہوترا صاحب نے بتایا کہ چار پانچ روز بعد میں کاکا صاحب کے ساتھ نیپال جا رہا ہوں۔ جہاں وہ آٹھ دس روز میرے ساتھ رہ کر واپس آ جائیں گے۔ اس دوران مجھے کام کی بھی سمجھ آ جائے گی۔ میری رہائش کا بندوبست آفس میں ہی کر دیا گیا ہے۔ جہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود ہیں اور ان کے لئے باورچی بھی رکھا ہوا ہے۔

"واہگورو آپ کا بھلا کرے"............ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ذہن ابھی تک پاکستانی چینل کے حوالے سے نشر ہونے والی خبر میں اٹکا ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جس ملک کے میڈیا پر اپنے غیر ذمہ دار یا دشمن کے تنخواہ یافتہ ایجنٹ قابض ہوں گے اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ مجھے رہ رہ کر گھر والوں کا خیال آ رہا تھا۔ نجانے ان بے چاروں پر کیا بیت رہی تھی۔

"اس ساری صورتحال کی ذمہ دار تم ہو یا تو............ تم اور تمہارے ساتھی"............ میں نے نفرت اور غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

جی چاہتا تھا ابھی اڑ کر جاؤں اور ایک ایک کا گلا گھونٹ دوں۔ اس کے بعد میرا کیا انجام ہو؟ اس کی مجھے پرواہ نہیں تھی۔ کم از کم ان لوگوں کو جنہوں نے یہ سارا شیطانی کھیل رچایا تھا اس بات کا احساس تو ہو جاتا کہ وہ وقت کے فرعون ضرور ہیں لیکن دنیا کو اپنی مرضی سے نہیں چلا سکتے۔

رات دیر گئے تک کروٹیں بدلنے کے بعد مجھے بہرحال نیند آ گئی۔ کھانے سے واپس آ کر میں نے ٹی وی نہیں لگایا تھا اور مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب ٹی وی تب ہی دیکھوں گا جب میرا مشن مکمل ہو گا۔ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لئے مجھے اپنے آپ سے چومکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی۔ ہر وقت مجھے اس بات کا احساس رہتا تھا کہ میں نے کون سا روپ دھار رکھا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ میری انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ اپنی اس جعلی شخصیت کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر مکمل بیدار اور مستعد رہوں۔ میرے منہ سے لاشعوری طور پر بھی کوئی ایسی بات یا فقرہ نہ نکل جائے جو بعد میں میرے گلے کا پھندہ بنے............ میری کسی بھی حرکت یا بات پر کسی کو شک نہ گزرے۔ میں نے جان بوجھ کر موٹر سائیکل شام گئے گھر لانے کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور مسز ملہوترا کے لئے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہ ان کی کمپنی کے زیر استعمال درجنوں کاروں اور موٹر سائیکلوں میں سے ایک موٹر سائیکل تھی جس پر فی الوقت میں قابض تھا۔

صبح میں نے معمول کے مطابق کمرے میں جا کر ناشتہ کیا۔ جہاں مجھے اکیلے ہی ناشتہ کرنا پڑا۔ ملہوترا صاحب آفس جا چکے تھے۔ میں بھی تھوڑی ہی دیر بعد موٹر سائیکل پر آفس پہنچ گیا اور سیدھا کاکا صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ جنہوں نے کھڑے ہو کر میرا "سواگت" کیا اور "سردار صاحب، سردار صاحب" کہتے ہوئے میرے ساتھ باقاعدہ معانقہ کیا۔

"بس پرسوں تک سارا کام ہو جائے گا۔ وکیل صاحب کا بھی فون آیا تھا۔" انہوں نے بڑی گرمجوشی سے اطلاع دی۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کاکا صاحب روایتی ملازمین کی طرح مجھے "صاحب کے گھر کا بندہ" جان کر خوش رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں کا ماحول بھی ہمارے ہاں کے دفتری ماحول کی طرح ہی خاصا منافقانہ ہوتا ہے۔ کاکا

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

صاحب کے ساتھ نیپال سے متعلق باتیں کرتے، ان کی تعریف کرکے اور چائے پی کر میں وہاں سے رخصت ہوا اور کلن والے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر تک کھڑے رہنے کے بعد میں نے گلیوں کا ایک چکر لگایا اور پھر یہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ قریباً پون گھنٹے بعد میری مراد پوری ہوئی۔ جب میں نے شمشو بھائی اور شیر خان کو بنگلے کا دروازہ کھلنے پر ایک گاڑی میں باہر آتے دیکھا۔ گاڑی چلانے والا میرے لئے اجنبی تھا۔ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور سوٹ بوٹ میں ملبوس خاصے معزز دکھائی دے رہے تھے۔

میری شمشو بھائی سے متعلق غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ بھارتی حکومت کی طرف سے آئے روز بھارت میں ہونے والی مختلف دہشت گردی کی وارداتوں میں جن بھارتی مسلمانوں اور تنظیموں کے نام لئے جاتے ہیں۔ وہ سب ان کا اپنا پھیلایا ہوا سازشی جال ہوتا ہے۔ جس میں کسی نہ کسی کو پھنسانا ہی دراصل ان کا ٹارگٹ ہوتا ہے۔ جس کی آڑ میں پھر پاکستان کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ زور و شور سے کیا جاتا ہے اور ان کے ''گاڈ فادر'' یعنی اسرائیل، امریکہ وغیرہ طے شدہ منصوبے کے مطابق ان کی ہاں میں ہاں ملاتے یا پھر انہیں ہلا شیری دے کر پاکستان پر عالمی دباؤ بڑھاتے رہتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے جس موٹی سی بات کی سمجھ ایسے کم عقل کو جیسے گردش حالات نے ان درندوں میں دھکیل دیا تھا سمجھ آ گئی تھی۔ اس کی ہمارے ملک کے بڑے بڑے جغادری قسم کے دانشوروں کو سمجھ کیوں نہیں آتی اور وہ دشمن کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنے ہی ملک کو معتوب کرتے رہتے ہیں۔ کاش ہمارے یہ دانشور اور صحافی کہنے سے پہلے کچھ سوچ بھی لیا کریں۔

میں نے حسب سابق ان کے کار کے تعاقب میں اپنی موٹر سائیکل لگا دی اور محتاط ہو کر ان کا پیچھا کرنے لگا۔ اس تعاقب کا خاتمہ کھنہ وکیل کے آفس پر ہوا۔ جہاں کچھ دیر ٹھہر کر میں نے ایک ڈھابے کا رخ کیا۔ دوپہر کے 2 بج رہے تھے۔ یہاں سے پنجابی کھانا کھا کر میں نے ''مصالحے والی چائے'' پی اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر دوبارہ ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

میرے اندازے کے مطابق کھنہ وکیل ان کا ''مقامی باس'' تھا۔ جس سے یہ لوگ مکمل رابطہ رکھتے تھے۔ شام تک کا وقت میں نے یہاں گزارا۔ اس دوران نعمانی، شیر خان اور شمشو بھائی کو میں نے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ ابھی تک مجھے بانو کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ جس نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیا وہ یہاں موجود نہیں ہے؟ بانو میرا ''پرائم ٹارگٹ'' تھی۔ نجانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ بانو کو اس شیطانی ٹولے میں نمایاں ترین حیثیت حاصل ہے اور یہ سارے گدھے دراصل اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ابھی تک فاروقی مجھے یہاں دکھائی نہیں دیا تھا۔

کیا فاروقی اور بانو ان سے الگ رہتے ہیں؟ کیا وہ دونوں ان کے چیف تو نہیں؟ پاکستان بھی فاروقی اور بانو ہی آئے تھے۔ عجیب عجیب طرح کے سوالات اور خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں چاہتا تو آج رات ہی یہ سارا قصہ تمام کر دیتا لیکن بانو کے بغیر میرا مشن ادھورا تھا...... میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو یہ سبق مرنے سے پہلے دے دوں کہ آج تک انہوں نے میرے پاکستان کے مجھ ایسے جذباتی اور جوشیلے نوجوانوں کو ورغلا کر جو شیطانی کھیل کھیلے ہیں۔ آئندہ وہ اس کی جرأت نہ کریں یا پھر کرنے سے پہلے بہت کچھ سوچیں اور یہ جان لیں کہ کبھی کبھی سو سنار کی اور ایک لوہار کی بھی ہو جایا کرتی ہے۔ جو میں ان کے ساتھ کرنے جا رہا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق میرے پاس اب اپنا کام کرنے کے لئے صرف دو راتیں باقی رہ گئی تھیں۔ مجھے تیسرے یا چوتھے دن نیپال جانا تھا۔ جہاں سے واپس بھارت آنا اپنی موت کو زبردستی دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میرا تعلق بہرحال ایک دیندار گھرانے سے تھا اور مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ بھارت سے نکلنے کا موقع مجھے قدرت کی طرف سے ہی مل رہا ہے۔ جسے میں ہرگز ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

شام ڈھلے میں معمول کے مطابق گھر لوٹ آیا اور رات کے کھانے پر ملہوترا صاحب کو بتا دیا کہ میرے گھر والے مجھے ملنے دلی آ گئے تھے۔ اپنے ساتھ میں تین چار ریڈی میٹ سوٹ، کچھ گڑ اور دیسی گھی لے کر آئے تھے جو میں نے انہیں بتایا تھا کہ گھر والے مجھے دے گئے ہیں۔ یہ سامان ایک بیگ میں بند تھا اور یہ ایسے لوگ نہیں تھے جو اسے دیکھنا پسند کرتے۔ ان کے لئے میری زبان سے نکلے الفاظ ہی تسلی کے لئے کافی تھے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں یہی سوچتا رہا کہ ان دو تین دنوں میں کچھ کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ مجھے ہر صورت اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ جس کی ایک ہی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ رات دیر گئے تک میں اللہ سے مدد کی دعائیں مانگتا سو گیا۔ اس رات میری مرحومہ ماں میرے خواب میں آئیں اور مجھے تسلی دے کر کہا کہ میں مطمئن رہوں۔ اپنے مقصد میں ضرور مجھے کامیابی حاصل ہو گی۔ آنکھ کھلی تو میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ والدہ کا اس طرح خواب میں آنا میرے لئے بے پناہ روحانی طمانیت کا باعث تھا۔ بھائی صاحب کی میں نے ٹی وی پر ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ جس نے مجھے اتنا حوصلہ ضرور دیا تھا کہ کم از کم میرے متعلق وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ میں کوئی ایسا غلط قدم جان بوجھ کر اٹھاؤں گا۔ جس سے میرے خاندان یا ملک کو کوئی نقصان پہنچے۔

میرے لئے اس ملک میں اب ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا جو میں کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اگلے روز بھی میں نے معمول کے مطابق ایک چکر ملہوترا صاحب کے آفس کا لگایا اور اب اپنے ٹارگٹ کی طرف یہ دعا کرتے ہوئے جا رہا تھا کہ مجھے بانو نظر آ جائے۔ جس کے لئے ایک زبردست سرپرائز میں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

جی ہاں! الہ آباد میں ایک روز جب ہم ہتھیاروں کو چیک کر رہے تھے تو بانو نے ایک چھوٹا سا پستول مجھے دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ میری طرف سے تحفہ قبول کرو۔''

مجھ پر چونکہ ان دنوں جہاد اور بانو کی محبت کا بھوت کچھ زیادہ ہی شدت سے سوار تھا سو میں نے پستول لے لیا۔ جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں لوڈ ہوتی تھیں۔ یہ غالباً جرمنی کا بنا ہوا تھا اور خواتین اپنی حفاظت کے لئے ہینڈ بیگ میں رکھتی ہوں گی۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مصرف مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس پستول کو اپنی پنڈلی کا مستقل حصہ بنا لیا تھا اور اس کے چھوٹے سے ہولسٹر کو ٹانگ سے لپیٹ کر اس میں پستول اس طرح رکھتا تھا کہ موقع آنے پر اسے فوراً نکال لوں۔

جس روز ہم نے ہوٹل پر حملہ کرنا تھا معمول کے مطابق یہ پستول میرے جسم کا حصہ بنا رہا۔ شاید اتنا جدید اور بھاری اسلحہ اٹھانے کے بعد اس کا مجھے احساس ہی نہیں رہا۔ جب میں ہوٹل سے فرار ہونے کے لئے اپنا اسلحہ ضائع کر رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ یہ پستول میری پنڈلی سے چپکا ہوا ہے۔ مسز ملہوترا کے ساتھ گھر پہنچنے کے بعد میں جب قدرے نارمل ہو گیا تو مجھے علم ہوا کہ پستول میرے پاس موجود ہے۔ تب میں نے یہ جانا کہ قدرت کو ابھی مجھ سے کچھ کام لینا ہے اور بانو کا یہ تحفہ مجھے سود سمیت اسے واپس بھی لوٹانا ہے۔ میں نے یہ پستول اپنی تربیت کے مطابق اس کمرے ہی میں چھپایا تھا، جس میں میرا قیام تھا۔ اس پستول کو میں نے جس طرح چھپایا تھا اگر کوئی کمرے کی تلاشی بھی لیتا تو کبھی نہ ڈھونڈ سکتا۔

آج میں پہلی مرتبہ اسے اپنے جسم کا حصہ بنا کر لے جا رہا تھا اور شکر ادا کر رہا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار تو موجود ہے گو کہ مجھے خالی ہاتھ بھی اپنا کام مکمل کرنے کی ترغیب حاصل تھی لیکن وہ بہت خطرے والی بات ہوتی۔ اس مرحلے پر کوئی بھی خطرہ مول لینا میرے لئے خودکشی کے مترادف ہوتا۔

علی الصبح بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ دیا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دو تین روز سے دلی کے گرد و

Uploaded By Muhammad Nadeem

Uploaded By Muhammad Nadeem

نواح میں بارش کی خبریں آ رہی تھیں لیکن ابھی تک دلی میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ معمول کے مطابق میں دفتر حاضری دے کر اپنے مشن پر نکلا تھا۔ آج کا کا صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ کل میرا پاسپورٹ اور متعلقہ شناختی کاغذات تیار ہو جائیں گے۔ جس کے اگلے روز مجھے نیپال کے لئے رخت سفر باندھنا ہوگا۔ میرے پاس صرف دو دن باقی تھے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر آج بانو نہ بھی دکھائی دے تو بھی میں رات کو یہاں قسمت آزمائی کرنے ضرور آؤں گا۔ میں نے اس گھر کے چاروں طرف "ریکی" کر کے داخلے اور اخراج کی حکمت عملی تیار کر لی تھی اور دعا کر رہا تھا کہ آج مجھے بانو کی یہاں موجودگی کا ثبوت مل جائے۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ جب میں نے اپنے ٹارگٹ کے سامنے ڈیرہ لگایا لیکن ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے شام ڈھل رہی ہو۔ بادلوں نے آسمان کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ اب بجلی بھی کڑکنے لگی تھی۔ میرا اندازہ یہی تھا اور سابقہ تجربے نے بھی بتایا تھا کہ جب اس طرح کافی دیر تک بادلوں کے آسمان پر قیام کے بعد بجلی کڑکنے لگے تو عموماً معمولی سی بارش کے بعد آسمان صاف ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو اچانک ہی الٹی گنگا بہنے لگی تھی۔ میں سامنے والی کوٹھی کے چھجے کے نیچے کھڑا تھا جب اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ فی الوقت تو میں بارش سے محفوظ تھا لیکن بادلوں کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ بارش بوچھاڑ کی شکل اختیار کر لے گی اور وہی ہوا۔

ردعمل ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئے۔ اچانک ہی سامنے گھر کا دروازہ کھلا۔ کار کی اگلی سیٹ پر نعمانی اور فاروقی بیٹھے دکھائی دیئے جبکہ پچھلی سیٹ پر ایک عورت اور مرد تھے۔ جن کی شکلیں ابھی بارش کی وجہ سے نمایاں نہیں ہو رہی تھیں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یقین تھا کہ یہ ضرور بانو ہی ہوگی۔ گاڑی گیٹ سے نکلی اور سڑک پر آ گئی۔ اس اثناء میں دو موٹر سائیکل سوار بھی بارش سے بچنے کے لئے اس طرف آ گئے تھے۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کئے بغیر موٹر سائیکل کو کک ماری اور ان کا تعاقب کرنے لگا۔ سر پر ہیلمٹ نے میرا چہرہ مکمل چھپا لیا تھا۔

انسانی سائیکی میں بعض لمحات بڑے اچانک اور فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ ویران سڑک، زوردار بارش اور میرے اندر دہکتی غصے اور انتقام کی آگ نے اسی لمحے کچھ کر گزرنے پر مجھے آمادہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا گلی کھڑی کس نے دیکھی ہے اور کم رفتار سے چلتی کار کے تعاقب میں موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر کے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے پچھلی سیٹ پر شمشو بھائی کے ساتھ گندی حرکات کرتی بانو کو دیکھ لیا۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی اور تیز بارش نے نعمانی کو جو گاڑی چلا رہا تھا خاصا پریشان کیا ہوا تھا۔ وائپر بھی اس کی ونڈ سکرین کے سامنے کا منظر نمایاں کرنے میں ناکام دکھائی دے رہے تھے جبکہ میرے لئے یہ معمول کی بات تھی۔ ایسی طوفانی بارشوں میں، میں نے پہاڑی علاقوں کے خطرناک راستوں پر موٹر سائیکل کی تیز رفتاری کا متعدد مرتبہ مظاہرہ کیا تھا۔ نعمانی نے کار کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے سامنے کا منظر واضح دکھائی نہیں دے رہا۔

ہم نے اب تک قریباً دو ڈھائی کلو میٹر فاصلہ طے کر لیا تھا اور سڑک پر سوائے ان کی کار اور میری موٹر سائیکل کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہوا کی رفتار اچانک اتنی تیز ہو گئی تھی کہ مجھے موٹر سائیکل کے ڈگمگانے کا احساس ہوا۔ اس روز ہونے والی بارش اور طوفانی ہوا نے دلی کی گزشتہ 26 سال کی بارش کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

میں نے اس علاقے کے چپے چپے کی ریکی کی تھی اور اب وہ جگہ آ گئی تھی جسے میری اگلی حکمت عملی میں سب سے اہم کردار ادا کرنا تھا۔ میں مسلسل آیات قرآنی کا ورد کرتے ہوئے اللہ سے معافی مانگ رہا تھا کیونکہ اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کا کھیل ختم ہونے والا تھا۔ جیسے ہی نعمانی اس موڑ کے نزدیک پہنچا۔ جہاں سے اسے کار ایک "یوٹرن" سے گھما کر دوسری سڑک پر لانی تھی میں نے تیزی سے موٹر سائیکل آگے بڑھائی اور اس کے سامنے

سے اتنی تیزی سے گزرا کہ بوکھلاہٹ میں نعمانی یوٹرن کے لئے بنے کنکریٹ کے مضبوط پشتے سے ٹکرایا اور ان کی گاڑی الٹ گئی۔ میں اس اثناء میں دوسری طرف سے گھوم کر ان کے سر پر موجود تھا۔ بارش اب طوفان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ چاروں زخمی تھے۔ نعمانی تو شاید بیہوش بھی ہو چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کھڑی کی۔ ہیلمٹ اتارا، پستول کو پوزیشن میں کیا اور سب سے پہلے کار سے باہر نکلنے والی زخمی بانو سے ہی میرا تعارف ہوا۔ جو کھلے دروازے سے باہر آ گری تھی اور زخمی دکھائی دے رہی تھی۔ شمشو بھائی کی ٹانگیں غالباً اندر پھنسی ہوئی تھیں۔

میں تیز بارش میں اکڑوں اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ بانو زخمی ضرور تھی لیکن اتنی نہیں کہ اس کے حواس ہی قائم نہ رہتے۔ میری شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے چودہ طبق ویسے بھی روشن ہو گئے ہوں گے۔

"تت تم.........؟" اس کی گھبرائی ہوئی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

"کیوں.........تمہارے حساب سے تو میں مارا جا چکا ہوں گا ناں.........." میں نے طنز کی۔

"دیکھو افضل........."

"شٹ اپ"........ میں نے غصے سے چیختے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ ہر نئی بات کا آغاز لفظ "دیکھو" سے ہی کیا کرتی تھی۔

"اب میں نہیں تم دیکھو گی بانو یا تمہارا جو بھی نام ہے"......... میں نے غصے اور نفرت سے پستول کا دستہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا.........لیکن کسی کو بتا نہیں سکو گی۔ مطمئن رہنا......... میں تمہارے مالکوں تک تمہاری آخری لمحات کی کہانی ضرور پہنچاؤں گا.........

"مم.........مجھے.........معاف........."

"لو.........تمہیں معاف نہیں کر سکتا.........اور مزید مہلت بھی نہیں دے سکتا.........وقت کم ہے"

.........کہتے ہوئے میں نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں اس کے سر میں اتار دیں۔ باقی گولیاں بھی میں نے شمسو اور اس کے ساتھیوں کے سروں میں ہی ماری تھیں۔ اپنی دانست میں ان سب کو ان کے انجام تک پہنچا کر میں وہاں سے نکلا تھا.........لیکن بعد کی اطلاعات کے مطابق پولیس نے نعمانی کو بچا لیا تھا۔ اچھا ہوا.........کم از کم اس نے اپنے "ان داتاؤں" کو ساری کہانی تو سنا دی ہوگی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے کہ جب انہیں علم ہوا ہوگا کہ ان کے ہاتھ آیا "شکار" نہ صرف ان کی گرفت سے پھسل گیا بلکہ اس نے ان درندوں کا قرض بھی سود سمیت چکا دیا تھا۔ تو ان پر کیا گزری ہوگی......... بے بسی، غصے اور نفرت سے وہ پاگل ہو گئے ہوں گے۔

بارش برس رہی تھی جب میں گھر پہنچا......... میں نے اطمینان سے موٹر سائیکل اپنی جگہ کھڑی کی۔ کمرے میں آ کر کپڑے تبدیل کئے اور شکرانے کے نوافل ادا کرتے ہوئے اللہ سے اپنے سابقہ گناہوں پر پھر معافی طلب کی۔ اس کے بعد میں بستر پر گرا تو آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ شام ڈھل چکی تھی اور ظہور اصاحب گھر آ گئے تھے۔ مجھے انہوں نے یہ بتانے کے لئے بلایا تھا کہ میرے شناختی کاغذات بن کر آ گئے ہیں جس کے بعد انہوں نے ایک بند لفافہ مجھے سونپ دیا۔

"کب جانا چاہو گے؟"......... انہوں نے پوچھا۔

"سر جی میں تو آج ہی تیار ہوں.........باقی جیسے آپ حکم دیں".......... میں نے جواب دیا۔

"گھر والوں سے ملاقات ہو گئی"......... ظہور اصاحب نے اگلا سوال کیا۔

"ہاں جی......... میں نے بتایا ناں سر! کہ ان سے تو میں الوداعی ملاقات بھی کر چکا ہوں"......... میں نے [illegible] والوں سے چھپائی۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

Uploaded By Muhammad Nadeem

''یار تم نے بڑے سردار صاحب سے نہیں ملایا۔'' انہوں نے گلہ کے انداز میں کہا۔

''سر جی! بس یونہی۔ جیسے ہی چھٹی پر آیا۔ ان کو یہاں بلا کر ملواؤں گا۔ پتا جی یہاں دو تین مہینے بعد آتے رہتے ہیں۔ میں انہیں کہہ دوں گا۔ اب جب بھی آئیں آپ کو مل کر جائیں گے'' ..... میں نے عاجزی دکھائی۔

''ارے بھئی کوئی ایسی بات نہیں ..... اچھا تم کل شام کو تیار رہنا۔ کاکا صاحب کے ساتھ ہی کل شام والی فلائیٹ سے تمہارا ٹکٹ بک کرواتا ہوں ..... پہلے کبھی جہاز سے سفر کیا ہے کیا؟'' انہوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ناں سر جی ناں ..... میں نے تو مہاراج صرف فلموں میں ہی دیکھے ہیں جہاز اور ائیر پورٹ'' ..... میں نے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں اب تم ''ملہوترا انڈسٹریز'' کے ملازم ہو اور ہمارے خاص آدمی بھی ..... اب تم جہاز پر ہی سفر کیا کرو گے'' ..... وہ مسکرائے۔

''آپ کی غریب پروری ہے مہاراج'' ..... میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ دو تین ماہ میں ہی میرے اندر اتنی تبدیلی کیسے آ گئی تھی؟ میں بالکل متقامی سکھوں ہندوؤں کی طرح باتیں کرنے کا ڈھنگ جان گیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے عموماً نارمل رہتا تھا۔

مسز ملہوترا ابھی ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں۔ مسٹر ملہوترا مجھے اپنے نیپال آفس سے متعلق بریفنگ دیتے رہے۔ انہوں نے اتنی تفصیل سے وہاں کے سٹاف آفس اور ماحول کا تعارف کروایا تھا کہ اب کھٹمنڈو میرے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ کھانا ہم نے اکٹھے ہی کھایا۔ جس کے بعد دونوں میاں بیوی نے مجھے اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں سے نوازا۔ ملہوترا صاحب نے بتایا تھا کہ وہ مہینے میں دو مرتبہ اپنے نیپال آفس جاتے ہیں اور اب ان کی ملاقات وہیں میرے ساتھ ہو گی۔ نجانے کیوں مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی شدت سے ان لوگوں سے جھوٹ بولنے اور علیحدگی کا دکھ ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ملہوترا فیملی انسانیت کے جس معیار کو چھو رہی تھی۔ وہ کسی بھی مذہب کے پیروکار کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔

صبح سنڈے کی وجہ سے چھٹی تھی اور بریک فاسٹ پر بطور خاص پنکی میرا شکریہ ادا کرنے اور ایک گفٹ دینے آئی تھی۔ میں نے اس معصوم بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ دعائیں دیں اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ جس کے بعد زندگی میں دوبارہ کبھی ملہوترا فیملی سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

پھر قریباً 4 بجے کاکا صاحب اپنے اٹیچی کیس سمیت میرے پاس موجود تھے۔ ڈرائیور ہمیں ائیر پورٹ کی طرف لے جا رہا تھا اور میرے دماغ کا کل ہونے والے خونی ڈرامے کی فلم چل رہی تھی۔ جن میں کبھی کبھی رات کو تھوڑی دیر کے لئے ٹی وی پر دیکھی گئی خبروں کے مناظر بھی جن میں ان کی لاشیں دکھانے کے بعد پولیس نے انہیں ''دہشت گردی'' کی واردات بتایا تھا اور یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ نعمانی زندہ بچ گیا ہے۔ البتہ ابھی بیان دینے کے لائق نہیں ہوا تھا۔

میں مکمل سکھ کے روپ میں ہردیال سنگھ پتر ہرنام سنگھ ساکن ٹکونڈی تحصیل و ضلع امرتسر بن کر ائیر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ لاشعور میں یقیناً کئی خوف سانپ کی طرح کلبلا رہے تھے کچھ بھی ممکن تھا۔ یہاں ائیر پورٹ پر میری تصاویر پر نہ پہنچائی گئی ہوں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن قدرت جب مہربان ہو تو کبھی کبھی ایسے ناممکنات میں بھی آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ جن کا عام حالت میں انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرا ملہوترا فیملی سے ٹکرانا اور ہوٹل کے فرار کے وقت اس بچی کی مدد کرنا دراصل میرا نہیں قدرت کا پلان تھا۔ جس پر میں نے عمل کیا۔ ملہوترا فیملی کا شمار دل کے گئے چنے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ جس کا اندازہ مجھے ائیر پورٹ میں داخل ہوتے ہی

یہاں ائیر پورٹ سیکیورٹی والوں نے ''کاکا صاحب'' کو اس طرح بڑھ چڑھ کر ''پرنام'' کیا تھا۔ جیسے وہ ان کا کوئی پیر ہو۔ میں اسے تائید غیبی کے علاوہ اور کیا نام دوں۔ یقین کیجئے۔ یہاں سے جہاز میں سوار ہونے تک دس بارہ مختلف قسم کے محکموں کے لوگوں نے مجھ سے کاکا صاحب کے ساتھ ہاتھ ملانے کی سعادت حاصل کی تھی۔ میری طرف ان کا دھیان کسی اور سلسلے میں کیسے جا سکتا تھا؟ جہاز میں یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا لیکن کاکا صاحب اور ان کے ''عقیدت مندوں'' نے اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ اس طرح بڑھ چڑھ کر ہماری خدمت کر رہے تھے۔ جیسے انہیں اگلے مرحلے میں ترقی ہی کاکا صاحب کی آشیر واد سے ملتی ہے۔ جہاز کے پہیوں نے پہاڑیوں کے درمیان پھنسے کھٹمنڈو ائیر پورٹ کے رن وے کو چھوا تو میرے سر پر لدا بوجھ ہلکا ہوا۔ ہم سیدھے اپنے آفس آئے تھے۔ جہاں کے ساتھیوں نے میرے لئے خصوصاً ڈنر کا بندوبست کیا تھا۔ میرے لئے اب کوئی بات حیرت انگیز نہیں رہی تھی۔ کاکا صاحب تین روز تک وہاں موجود رہے۔ اس دوران میں نے گھوم پھر کر کھٹمنڈو کا جائزہ لے لیا تھا۔ پاکستانی ہائی کمیشن کو باہر سے دیکھ لیا تھا اور اس بات کا بھی بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس کے لئے یہاں کوئی بھی ایکشن کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا دلی میں۔ پندرہ روز تک میں نے یہاں کام کیا اور ایک روز ملہوترا صاحب کے نام ٹوٹی پھوٹی ہندی اور انگریزی میں ایک خط لکھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ملہوترا فیملی میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گی؟ کیا سوچے گی؟ یہ اب میرا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ مجھے اس بات کا دکھ رہے گا کہ میں انہیں سچ نہیں بتا سکا لیکن اندریں حالات یہ ممکن ہی کہاں تھا۔ میں تو گردش حالات کا مارا، مجبور اور کافی حد تک بے بس انسان تھا۔ میں سوچتا ہوں انسان کتنا ہی چالاک ہوشیار بنے اگر اپنی تدبیر اور چالاکی پر بھروسہ کرے گا تو ایک نہ ایک روز میری طرح ضرور گرفت میں آ جائے گا۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ انسان مجبور محض ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے زندگی کا آغاز کیسے کیا تھا؟ جہاد کے میدان کارزار میں قدم رکھتے ہوئے کیا سوچا تھا اور آج کن حالات کا شکار ہوں۔ اس میں میری غلطی کیا تھی؟ میں نے کہاں ٹھوکر کھائی؟ کہاں عقل پر جذبات نے غلبہ پایا؟ ایسے درجنوں سوالات آج بھی مجھے پریشان کرتے ہیں لیکن ان سب کے بعد جب میں یہ سوچتا ہوں کہ دوستم کے عقوبت خانے سے دلی میں ''را'' کے جہنم کدے تک کا سفر کرنے کے بعد میں زندہ سلامت واپس آ گیا ہوں تو دل پر جیسے کوئی برف کی سل رکھ جاتا ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ نے ضرور مجھے کسی اگلے کام کے لئے منتخب کیا اور بچایا ہوا ہے۔

میں نیپال سے اپنے گاؤں تک کیسے پہنچا؟ اس کہانی کو بیان کرنے کا یارا مجھ میں نہیں ہے۔ کتنی ہی احتیاط کروں کہیں کوئی لغزش ایسی ہو جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ جس سے میرے ''محسنوں'' کو پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ بس یہ جان لیجیے کہ اک آگ کا دریا تھا جو میں تیر کر زندہ کنارے تک پہنچ گیا ہوں۔ میرے زندہ بچ آنے سے نہ صرف میرے ملک کو، میرے گھرانے کو ایک بڑی پریشانی اور خطرے سے نجات ملی۔ ہمارے اس گھٹیا دشمن کو بھی سبق مل گیا۔ جس نے پاکستانیوں کو اپنے گھڑے کی مچھلی سمجھا ہوا تھا۔ کاش میرے جہادی بھائی میری کہانی میں چھپے پیغام کو سمجھ لیں۔ تو میں سرخرو ہو جاؤں۔ آج میں آزاد ہوں۔ اپنی بیوی اور خاندان کے ساتھ خوشگوار زندگی جی رہا ہوں۔ کافی عرصے سے ملکی صورتحال خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ دل پر بڑا بوجھ تھا۔ آپ کو کہانی سنا کر ہلکا ہو گیا۔

☆☆☆☆

Uploaded By Muhammad Nadeem